برصغیر ہند کا المیہ
اقتدار، فرقہ واریت اور تقسیم
ڈاکٹر رضی احمد

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

ڈاکٹر رضی احمد بہار کے موجودہ بیگوسرائے ضلع کے نورپور گاؤں کے ایک متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ خاندان میں پلے بڑھے۔ ڈاکٹر رضی احمد نے پٹنہ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے۔ کیا، پھر وہیں سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ایم۔اے۔ کرنے کے بعد ۱۹۶۰ سے ہی وہ عملی میدان میں سرگرم ہوکر بہار کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر شری کرشن کی صدارت میں بہار میں گاندھی سنگرہالیہ کی تعمیر کے لئے ۱۹۵۸ میں بنی کمیٹی کے منصوبوں سے منسلک ہوگئے۔ بارہ برس (۱۹۸۰۔۱۹۹۲) تک یہ راشٹریہ گاندھی سنگرہالیہ، نئی دلّی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ پانچ برسوں تک ایمنسٹی انٹرنیشنل، انڈیا چیپٹر، نئی دلّی کے سکریٹری جنرل بھی رہے ہیں۔ آپ نے ۱۹۷۸ میں ہندستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے یو۔این۔او۔ میں ہندستان کی نمائندگی بھی کی ہے۔ مرکزی گاندھی اسمارک ندھی، نئی دلّی، نیشنل گاندھی سنگرہالیہ کمیٹی، نئی دلّی، راجندر بھون ٹرسٹ، نئی دلّی، بہار وراثت وکاس نیاس، بہار سرکار سمیت متعدد تعلیمی، عملی اور انسانی حقوق کے لئے سرگرم اداروں کی ایکزیکیٹو کونسل اور ٹرسٹ سے منسلک ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی سمیت کئی بڑے تعلیمی اور سماجی اداروں نے ان کے قابل تعریف کاموں کے لئے انہیں اعزاز سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر رضی احمد کی متعدد کتابچوں کے علاوہ کئی اہم کتابیں اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں 'صداقت آشرم'، 'سامپردایکتا ایک چنوتی'، 'گاندھی اور مسلمان'، 'جے پرکاش نارائن'، 'آزادی کے پچاس ورش: کیا کھویا کیا پایا'، 'گاندھی اَمنگ دی پیزنٹ' نے دانشوروں کو متوجہ کیا ہے۔ ملک اور بیرون ملکوں انسانی حقوق، بین الاقوامی مسائل اور اسلام اور عالمی اخوت جیسے موضوعات پر منعقد کانفرنسوں میں آپ شامل ہوتے رہے ہیں۔

رابطہ: 09430246371, 09162535154

برصغیر ہند کا المیہ
اقتدار، فرقہ واریت اور تقسیم

برصغیر ہند کا المیہ

اقتدار، فرقہ واریت اور تقسیم

ڈاکٹر رضی احمد

ترجمہ

ڈاکٹر محمد ذاکر حسین

گاندھی سنگرہالیہ، پٹنہ

Barr-e- Sagheer Hind Ka Almiya: Iqtidar, Firqawariyat Aur Taqseem

By :

Dr. Razi Ahmad

Gandhi Sangrahalaya, Patna

Translated By:

Dr. Md. Zakir Hussain

Khuda Bakhsh O. P. Library, Patna

Edition 2014, Price : 300/-

نام کتاب	:	برصغیر ہند کا المیہ: اقتدار، فرقہ واریت اور تقسیم
مصنف	:	ڈاکٹر رضی احمد
مترجم	:	ڈاکٹر محمد ذاکر حسین
تعداد	:	۵۰۰
اشاعت	:	۲۰۱۴ء
صفحات	:	۳۰۴
مطبع	:	ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ-۴
ناشر	:	گاندھی سنگرہالیہ، پٹنہ
اہتمام	:	ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴
قیمت	:	۳۰۰ روپے

فہرست

انتساب

مرحوم والدین کی یاد میں

بہن، بھائیوں، اہلیہ اور بچوں کے ساتھ

اس برصغیر کی نئی نسل

کے

نام

اپنی بات

'یہ کتاب کیوں' پر جب آپ نظر ڈالیں گے، تو خود بخود واضح ہو جائے گا کہ میں نے ہندو مسلم رشتوں کی پیچیدگیوں بھری نزاکت کو موضوع بحث کیوں بنایا اور اسے ہندی داں حضرات کے سامنے پیش کرنے کی پہل کیوں کی۔ ہم تو آپس میں مل بیٹھ اپنی بگڑی حالت پر ماتم کرتے ہی رہتے ہیں، خود کہو، خود سنو والی کیفیت رہتی ہے، نہ بات آگے بڑھتی، نہ دُکھ کم ہوتا ہے اور نہ کوئی حل سامنے آتا ہے۔ برادران وطن کی خاصی بڑی آبادی ہم سے ہمدردی رکھنے کے باوجود ہمارے درد سے وہ نا آشنا ہے۔ وہ بھی غلط صحیح پروپیگنڈا کا شکار ہو کر ہم سے ہمدردی رکھنے کے باوجود مسائل کے حل کی تلاش میں مناسب رول نہیں ادا کر پاتی۔ بے اعتمادی کی یہی فضا دونوں طرف موجود ہے۔ لہٰذا اس فضا کو خوشگوار بنانے کی ضرورت کل بھی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ اس بگڑتی فضا نے مجھے برابر تشویش میں مبتلا رکھا۔ اسی تشویش کے مداوا کے لئے اس کتاب کا خاکہ تیار ہوا، جو آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

گذشتہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۱۳ کو بہار کے عزت مآب وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار نے ہندی کے بڑے بینر' وانی پرکاشن' کے ذریعہ شائع ہندی ایڈیشن کا اجرا کیا۔ اس موقع پر ان کی وزارت کے کئی وزراء بھی موجود تھے۔ کچھ دنوں بعد ہی گاندھی میدان کے کتاب میلہ میں وانی پرکاشن نے بحث و مباحثہ کی ایک پُر کشش مجلس میں اس کتاب کے پیپر بیک کا اجرا کیا۔ وہاں موجود شہر کے اردو اور ہندی کے معتبر دانشوروں نے اس کتاب پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرنے کے قدم سے تعبیر کیا۔ دانشوروں کے بیش قیمتی مشوروں نے مجھے حوصلہ عطا کیا کہ جو باتیں مَیں برادران وطن سے شیئر (Share) کرنا چاہتا ہوں، انہیں خیالات کو میں مسلمانوں کے بیچ رکھوں کیونکہ یہاں بھی اپنے بارے میں جانکاری کی بہت کمی ہے۔ ہندستان کی دونوں آنکھیں، ہندو اور مسلمان اگر صحیح زاویہ سے دیکھنا شروع کر دیں تو یہ روز

روز سے اختلافات کی گنجائش ہی نہیں رہے گی اور پلورل بناوٹ والی گنگا جمنی تہذیب کا گہوارا ایک خوشنما باغ کے مانند سرسبز و شاداب ہمارا ملک اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو کر اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکے گا، جو آزادی کے وقت اس ملک کے معماروں نے دیکھا تھا۔

میں ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب — خدا بخش لائبریری، پٹنہ — کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اچھے طریقے سے کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے اور اردو داں حضرات کے سامنے کتاب کو پیش کرنے میں ہماری پُرخلوص مدد کی ہے۔ ڈاکٹر فردالحسن فرد، ارم پبلشنگ ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ کا بھی میں شکر گذار ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت میں انہوں نے دلچسپی دکھلائی اور وہ شائع ہو کر لوگوں تک پہنچ سکی۔

''برصغیر ہند کا المیہ: اقتدار، فرقہ واریت اور تقسیم'' کا اردو ایڈیشن قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ فیصلہ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے کہ میں اپنے مشن میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

رضی احمد

گاندھی سنگرہالیہ
اتر۔پچھم گاندھی میدان
اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱
مارچ ۲۰۱۴

یہ کتاب کیوں؟

قدیم تہذیبوں کا گہوارا رہے پلورل سماجی ساخت والے ملک ہندستان کی تاریخ اپنے صفحات میں اپنی شاندار وراثت کی داستانوں کے ساتھ اپنے غلام ہونے اور بٹ جانے کے تکلیف دہ واقعات کی تفصیل بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ برسوں پہلے آزادی کا دیکھا ہمارا خواب بڑی جدوجہد کے بعد پورا ہوا اور ہم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو غلامی کا جوا اتار پھینکنے میں کامیاب ہوئے، لیکن ساتھ ہی ہمیں دو حصوں میں بٹ جانے کا درد بھی جھیلنا پڑا۔ اس بٹوارے کا زخم ابھی بھی ہرا ہے، لہٰذا اس کی آڑ میں کی جارہی سیاست کم الجھی ہوئی نہیں ہے۔

جس موضوع پر میں کچھ کہنے جا رہا ہوں، وہ اہم ہوتے ہوئے بھی بہت کم زیر بحث ہے، یعنی ''ہندو مسلم رشتوں کی حیثیت اور ہندستان کی تاریخ اور موجودہ سیاست پر اس کے اثرات''۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے، جس پر قلم اٹھانا چیلنجوں سے بھرا ہوا ہے۔ واقعات کو میں نے تاریخی حقائق کی روشنی میں غیر جانب داری سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رشتوں کو متاثر کرتی غلط فہمیوں کا دھند کچھ چھٹے اور ''ہم سب ہندستانی ہیں'' کی ذہنیت مضبوط ہو، ساتھ ہی اس برصغیر میں امن اور بقائے باہمی کا ماحول بنا رہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوا۔ سب لوگوں نے آزاد فضا میں سانس لی۔ تقسیم کے درد کے باوجود وہ اب آزاد ہیں، اس احساس نے انہیں دلی سکون پہنچایا۔ لیکن ہندستانی مسلمانوں کے بیچ وہ فطری جوش وخروش کی فضا نہیں بن سکی تھی، جیسی ہندوؤں کے بیچ بنی تھی، کیونکہ ''مسلمانوں نے تو پاکستان بنوا ہی لیا، اب ان کے لئے یہاں کیا بچا''، اس ذہنیت کا اظہار بھی لوگوں کی گفتگو اور رویوں سے ہو رہا تھا۔ سنجیدہ لوگوں نے اس رویے کو آنے والے دنوں کے لئے اچھا شگون نہیں مانا تھا۔ اس ''پاکستان بنوا لینے'' کے الزام میں کتنا وزن ہے، اس کی ہی تفتیش کرنے کی چھوٹی سی کوشش یہاں ہم نے کی ہے۔ ان گمراہ کرتے حقائق کی اصلیت کو سامنے لانا چاہا ہے، جن کی وجہ سے ہندستان کی حالت اکثر الجھتی رہی ہے اور یہاں کی دوسری بڑی آبادی،

جو "مسلمان" ہے، کی تصویر دھندلی ہوتی ہے، اور وہ بلاوجہ اکیلے احساس گناہ کے بوجھ تلے دبے احساس کمتری میں مبتلا اپنے گھروندوں میں سمٹے ہوئے ناانصافیاں جھیل رہے ہیں، ان کی صلاحیتوں کا ملک کی تعمیر میں مناسب استعمال ممکن نہیں ہو رہا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ایک خطرناک سیاسی سازش کے تحت سیکولر ہندستان کے نظام کو چیلنج کرتے ہوئے بابری مسجد کو توڑے جانے کے بعد ہندستان فرقہ وارانہ فسادات کی سونامی سے دو چار ہو گیا۔ ۶ دسمبر کا حادثہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین تھا، جو ۲۲-۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ کی رات میں ایودھیا میں شروع ہوا تھا۔ ساڑھے چار سو برس پرانی آثار قدیمہ کی اہمیت والی مسجد کی اس دن شہادت نہیں تھی، بلکہ رواداری ہندستانی روایت اور گنگا جمنی ثقافت کے دامن کا تار تار کیا جانا تھا۔ اس کے بعد گجرات، مہاراشٹر اور کئی جگہوں پر فرقہ وارانہ فسادات کا ایسا خونی منظر دیکھنے میں آیا، جہاں سرکاری مشنری بھی سرگرمی سے فسادیوں کے ساتھ معاون بنی دکھ رہی تھی۔ بدحواس ہندستانی مسلمان اپنے کو ایک ایسے چوراہے پر پا رہا تھا، جہاں ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ سیکولر اسٹیٹ کی مکمل ناکامی نے اسے مایوسی، غم اور غصے کے ذہنی تناؤ میں مبتلا کر دیا۔ وہ کرے، تو کیا کرے۔ اپنا درد کہے، تو کس سے کہے۔ یہ حالت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی بیچ بمبئی اور کئی شہروں میں سلسلہ وار بم بلاسٹ ہوئے۔ بہت سی بے گناہ جانیں گئیں اور لوگوں کو جو ذہنی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا، وہ الگ۔ بلاسٹ کی ذمہ داری کے شک کی سوئی اب تک کے اپنائے سرکاری رویے کے مطابق بغیر تحقیقات کئے فوراً مسلم تنظیموں کی جانب ہی گھومی تھی۔ بلاسٹ اور اس کے نتائج پر مسلمانوں کے درمیان ملا جلا ردعمل دیکھا گیا تھا۔ بلاسٹ کی مذمت تو چاروں طرف سے ہوئی، لیکن "اطمینان" کی ایک عجیب لہر بھی ان کے درمیان محسوس کی گئی، "ٹھیک ہی تو ہوا ہے، یہ تو ہونا ہی چاہئے تھا۔" مجھ جیسے لوگوں کے لئے یہ "سوچ" آنے والے دنوں کے لئے اچھے اشارے نہیں تھے۔ میں نے اپنے احساسات کا اپنے دوستوں سے اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "بابری مسجد کا نکلا جن" اب شاید ہندستان کو چین سے نہیں رہنے دے گا۔ حالات کی نزاکت کے مدنظر اسی وقت اس کتاب کا منصوبہ بنایا اور کام کرنا شروع کیا، تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ موجود ان غلط فہمیوں کو جن کو بنیاد بنا کر سیاسی فائدے کے لئے حالت کو الجھایا جاتا رہا ہے، تاریخی حقائق کی روشنی میں دور کرنے کی کچھ کوشش ممکن ہو سکے۔ اپنے بزرگ دوست کلدیپ نیر، پربھاش جوشی، (جواب نہیں رہے)، شری کانت، تاریخ کے کئی پروفیسر دوست اور دلت آندولن

میں گہری دلچسپی رکھنے والے ای۔ راجندر پرساد وغیرہ سے جب اس کتاب کا میں نے ذکر کیا، تو ان لوگوں نے نہ صرف پسند کیا، بلکہ مجھے کافی حوصلہ بھی دیا۔ میں ان سب دانشوروں کے قیمتی مشوروں کے لئے ان کا دل سے شکرگزار ہوں۔

ہندو مسلم رشتوں کے اتار چڑھاؤ اور پاکستان کے بننے کے بارے میں جھوٹی سچی جانکاریوں سے پھیلی غلط فہمیوں کو میں نے تاریخی حقائق کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم لوگ ہر چیز کو '' ہندستانی ''، نہیں، '' ہندو '' اور '' مسلم '' ہونے کے نظریے سے دیکھنے کے عادی سے ہو گئے ہیں، اس لئے ہر مسئلہ پر شک پیدا ہونے کی گنجائش تو ہمیشہ بنی ہی رہتی ہے اور آگے بھی بنی رہے گی۔ حقائق کی گہرائیوں میں جا کر جب ہم غیر جانب داری سے غور کرتے ہیں، تو ہندو مسلم رشتوں کے کئے تجزیے میں انصاف کا پہلو کمزور نظر آتا ہے اور غریبی، جہالت اور شدید کسمپرسی میں جیتا مسلمانوں کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وجہ چاہے جو بھی رہی ہو، آزادی کے بعد کئے گئے سارے من لبھاون وعدوں اور دعووں کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر گوپال سنگھ، جسٹس رنگناتھ مشر اور جسٹس سچر کمیشن کی رپورٹیں اسی تلخ حقیقت کو اجاگر کر رہی ہیں۔

بابری مسجد کی مسماری کے بعد ملک میں جو فرقہ واریت کا طوفان آیا، اس سے پورا ملک متاثر ہوا۔ مہاراشٹر، گجرات اور بھارت سرکار کی مسلمانوں کے تئیں اپنائی گئی پالیسیاں سوالوں کے گھیرے میں آ گئیں۔ سنگھ پریوار سے جڑی تنظیموں کی جگ ظاہر '' شدت پسند فرقہ واریت '' کے ساتھ کانگریس کی '' لطیف در پردہ فرقہ واریت '' اور سیکولر پارٹیوں کی '' بے حسی '' بھی دیکھنے میں آئی، آخر انہیں بھی تو ووٹ کی سیاست کرنی ہے۔ '' سرکار '' اور '' سرکاری مشنری '' کے دوہرے کردار نے یہ واضح کر دیا کہ ہندستان کا '' سیکولرزم '' اور سارے قانونی تجاویز اقلیتوں کے لئے زیادہ تر کاغذوں کی زینت بڑھانے تک ہی محدود رہے ہیں۔

مسلمانوں نے بابری مسجد کے توڑے جانے کے درد کو شدت سے محسوس کیا، جب کہ سنگھ پریوار اور ان سے نزدیکی رکھنے والوں نے اسے اپنی بہادری کا کارنامہ مانا اور '' یوم شجاعت '' کا جشن منا کر سیکولرزم کو شرمسار کیا۔ لیکن اسی مایوسی کے ماحول میں خشونت سنگھ، کلدیپ نیر، سریندر موہن، وی۔ ایم۔ تارکندے، راجندر سچر، برکھا دت، راج دیپ سردیسائی، اوشا مہتا، تیستا شیتل واڈ، اے۔ کے۔ ہنگل، مہیش بھٹ، پربھاش جوشی، ہرش مندر، رام پنیانی جیسے سیکڑوں

انسانیت نواز مسلم حمایتیوں کا فرقہ وارانہ طوفان کے خلاف مضبوطی سے میدان سنبھالنے کی نظیر بھی سامنے آئی۔ یہی مثبت سوچ (Silver lining) سیکولر ہندستان کے وجود کی مضبوط ضمانت ہے۔

میرے ڈرافٹ کو کتاب کی شکل دینے میں آصف وصی کا اہم رول رہا ہے۔ میری کمزور لکھاوٹ کے ساتھ کمپوزنگ، ڈیزائننگ اور اسے طباعتی مرحلے تک پہنچانے کا پورا کریڈٹ ان کو ہی جاتا ہے۔ وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ پروف ریڈنگ کے مشکل اور ٹیڑھے کام کو کمار انل نے بخوبی انجام دیا ہے، ہم ان کے بہت احسان مند ہیں۔ اشاریہ تیار کرنے میں لائبریری کے ہمارے رفیق کار سدرشن رام نے بھی کافی محنت کی ہے، وہ بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

ریفرنس کتابوں کے مصنفوں اور ناشروں کا بہت احسان مند ہوں کیونکہ ان کی کتابوں نے ان تاریخی حقائق کو جاننے اور سمجھنے کا بہترین موقع دیا، جن کی بنیاد پر اس کتاب کا تانا بانا ممکن ہو سکا ہے۔

میں وانی پرکاشن کے ارون ماہیشوری کا خاص طور سے شکر گزار ہوں کیونکہ شری کانت جی کے ساتھ ان کے تقاضوں کا بھی اس کتاب کے لکھے جانے اور طباعت میں اہم رول رہا ہے۔

آخر میں میں کہنا چاہوں گا کہ کچھ واقعات کی غلط ترجمانی کو لمبے عرصے تک مشتہر کرنے کے اثر سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں، ان کو ملک کی بہتری میں دور کرنا میرا مقصد ہے، تاکہ ہمیں ان المیوں سے پھر نہیں گزرنا پڑے اور کثیر سماجی بناوٹ والے ہندستان کی آنے والی نسلیں اپنے بزرگوں والی غلطیاں پھر نہ دہرائیں اور ان کے اندر کا انسان تڑپے نہیں، مرے نہیں۔

میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

رضی احمد

گاندھی سنگرہالیہ
اتر۔ پچھم گاندھی میدان
اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱
۱۵ اگست ۲۰۱۳

ہمیں بھی کچھ کہنا ہے......!

ہم لوگوں نے ہندستان کی آزادی کی لڑائی کا وہ آخری دور دیکھا ہے، جب ''انگریزو بھارت چھوڑو'' اور ''لڑ کے لینگے پاکستان، مر کے لینگے پاکستان'' کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی اور یوروپی ملکوں کی آپسی رقابت اور رسہ کشی کی پیداوار دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۱۹۴۵) اختتام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ گریٹ برٹین سمیت یورپ کے دوسرے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کے دعویدار سامراجی ملکوں کی حالت ہر زاویہ سے خستہ ہو چکی تھی اور ایک سپر پاور کی حیثیت میں امریکہ دنیا کے نقشہ پر ابھر رہا تھا۔ جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے باوجود ۶ اگست ۱۹۴۵ کو ہیروشیما اور ۹ اگست ۱۹۴۵ کو ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اپنی اس عظیم قوت کا وہ مظاہرہ کر چکا تھا، جس کے بل پر وہ منٹوں میں لاکھوں لوگوں کو تڑپا تڑپا کر موت کے منہ میں جھونک سکتا تھا۔ ادھر ہندستان میں اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش کے نتیجے میں بکھرے قومی تانے بانے نے بھیانک فضا بنا رکھی تھی۔ بڑے پیمانے پر ہو رہے خون خرابے کے اسی ماحول میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ اسی تکلیف دہ ماحول میں ہندستان کی کوکھ سے نئے ملک ''پاکستان'' کا جنم ہوا تھا۔ ہندو مسلم فسادات کی تپش ہم نے بھی محسوس کی۔ بہتوں کو پاکستان جاتے دیکھا۔ ان میں اپنے عزیز بھی تھے اور علاقے کے جانے پہچانے لوگ بھی۔ ہمارے علاقے کے زیادہ تر لوگ پہلے سے جانا پہچانا بنگال، جو بعد میں مشرقی پاکستان بنا (اور اب بنگلہ دیش ہے) گئے تھے۔ یہاں کے لوگ پہلے سے ہی وہاں کے جٹ کلوں اور دال کی ملوں کے کاروبار سے جڑے ہوئے تھے۔ ڈھاکہ، چٹگاؤں، دیناجپور، سید پور وغیرہ جگہوں میں بہتوں کی دکانیں اور دال کی ملیں تھیں۔ بہت سے لوگ ریلوے کی نوکریوں کے سلسلے میں بھی وہاں پہلے سے تھے اور بٹوارے کے باوجود برابر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پچاس کے عشرے میں جب دونوں ملکوں کے درمیان ویزا سسٹم لگا، تب ہم لوگوں کو احساس ہوا کہ وہ دوسرا ملک بن چکا ہے۔ یہاں سے ''پاکستان'' جانے اور وہاں سے

''ہندستان'' آنے والوں کی بربادی کی دردناک داستانوں نے بھی ہمیں پریشان کیا۔ اس وقت جو حالت بنی تھی، اس میں اپنے اور اپنے علاقے کے مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کا سوال بڑا نازک تھا اور آنے والے دنوں کی پیچیدگیوں کے تصور نے بھی ہماری نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ ان پریشانیوں کے ذمہ دار کون ہیں، اس حساس سوال نے بھی ہمیں کافی الجھنوں میں ڈالا۔ لیکن اس الجھی حالت کی سچائی کا پتا لگانا اس وقت آسان نہیں تھا۔ اگر تاریخ کا چکر بے رحم ہے، تو وقت بھی کم طاقتور نہیں۔ بڑے سے بڑے زخموں کو بھر دینے کی وہ صلاحیت تو رکھتا ہی ہے، سچائیوں کو بھی وہ سامنے لا دیتا ہے۔ کچھ دنوں بعد ہی تاریخی حقائق کی کھوج شروع ہوئی اور ان حقائق پر مبنی تحقیقی کتابیں سامنے آنے لگیں۔ ان کتابوں کے غیر جانب دارانہ تجزیے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی گئی کہ اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش اور باعزت بقا کی جد و جہد (Struggle for existence) کے سیاسی حمام میں سب دعویداروں کی ایک ہی کیفیت رہی ہے۔ سب ننگے ہیں۔ ہاں کوئی کچھ کم، تو کوئی کچھ زیادہ۔ کہیں ہندو اپنی حدوں سے باہر نکلے نظر آتے ہیں، تو کہیں مسلمان اور سکھ۔ اور اس قومی المیہ سے لطف اندوز ہوتی نظر آتی ہے برٹش سامراجیت اور اس کی پروردہ طاقتیں۔ جب حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر ابھری ہندو مسلم رشتوں کی تلخیاں نہ سلجھنے کی حدوں تک پہنچ گئیں، تو اس سے نمٹنے کے لئے ملک کے بٹوارے جیسے تکلیف دہ متبادل کو اپنانا پڑا تھا۔ لیکن اس تکلیف دہ فیصلے کا انجام بھگتنے کے باوجود ہندستان میں ہندو مسلم رشتوں کی الجھنیں جیوں کی تیوں بنی رہیں اور آج بھی وہ متعدد پریشانیوں کی وجہ بنی ہوئی ہے۔

ہندستان کے الجھے سماجی حقائق کے پس منظر میں تحریک آزادی کی کمان سنبھالے ہوئے گاندھی جی نے ہندستان کی آزادی، اس کی سالمیت، فروغ اور ترقی کے لئے ہندستان کی دونوں اہم اکائیوں کے مخلصانہ رشتوں کو ہمیشہ فوقیت دی۔ اسی سلسلے کی پہلی بڑی اہم کوشش تھی ۱۹۲۰ء کے اسپیشل کانگریس اجلاس میں تحریک خلافت اور عدم تعاون تحریک کا بنا سنگم، تحریک خلافت کو کانگریس کا پروگرام مان لینا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی بہتری کے راستے وہ ہمیشہ بتاتے رہے، لیکن یہاں کے ذمہ دار لوگوں نے سیاسی وجوہات سے اکثر انہیں نظر انداز کیا۔ ہندو اور مسلمان آپس میں خوب لڑے اور پھر ملک کا بٹوارا بھی ہو گیا۔

یہ تاریخی سچائی ہے کہ جب مجموعی طور پر ہندو مسلم رشتے معمول پر تھے، ہندو مہا سبھا اور کانگریس کے معزز لیڈر لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۲۳-۱۹۲۴ میں ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ قوم مان لیا تھا اور اسی بنیاد پر ۱۹۲۸-۱۹۲۹ میں ونا یک دامودر ساورکر نے اپنے "ہندتو" اور "ہندو راشٹر" کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ آگے چل کر ڈاکٹر ہیڈگواڑ، گرو گول والکر اور ان کے ماننے والوں نے تو دس قدم آگے بڑھ کر مسلمانوں کو ہندستانی ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش میں ہندوؤں کی ایک بڑی بااثر جماعت کے ذریعہ اپنائے ہوئے اسی فارمولے کو اپناتے ہوئے گوکھلے کے شاگرد اور تلک کے رفیق کار کانگریس کے بڑے لیڈر رہے مسلم لیگ کے لیڈر محمد علی جناح نے بھی اپنی "دو قومیت" کے نظریہ کو ۱۹۴۰ میں سیاست کی بساط پر رکھ دیا اور حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش کا نیا باب شروع ہو گیا۔ انگریزوں کی موجودگی میں 'دو قومیت' کے نظریے نے رنگ لایا اور اس کا سیاسی اثر پورے ملک پر پڑا۔ حالات نے جو کروٹ لی، وہ المیوں سے بھری رہی۔ جو حالت بنی تھی، اس میں مسلمانوں کو ہی زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندستانی مسلمانوں پر یہاں کی زمین جب تنگ ہوتی جا رہی تھی، اس وقت گاندھی جی نے خلوص دل سے ان کی پشت پناہی کی۔ تنگ نظر شدت پسند ہندوؤں نے اسے پسند نہیں کیا اور آخر کار انہیں مار ہی ڈالا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی آپسی رقابت اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش بن چکی تھی۔ اس نے انگریزی سامراجیوں کو اپنی سازش کے آخری پانسے کو پھینکنے کا موقع بھی دے دیا۔ ہندو اور مسلمانوں کی باعزت جینے کی جد و جہد کو حالات نے جس موڑ پر لا دیا، وہ اس برّ اعظم کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ (Turning Point) ہونے کے ساتھ بہت افسوس ناک باب بھی ہے۔ المیوں کا نہ ختم ہونے والا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ملک کے بٹوارے کی شکل میں اپنی آخری حد تک پہنچا۔ ساری کوششوں کے باوجود گاندھی جی بھی اس انہونی کو نہیں ٹال سکے۔

تنگ نظر شدت پسند عناصر کی موجودگی کے باوجود آزادی کی لڑائی کے درمیان گاندھی جی کی قیادت میں بقائے باہمی اور تمام مذاہب کے احترام پر مبنی سیکولرزم کا رنگ لئے جو ذہنیت پروان چڑھی تھی، آزادی کے بعد بھی کانگریس نے بہت حد تک اسے برقرار رکھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سیاسی وجوہات سے اس کی مضبوط گرفت کمزور ہوتی گئی۔ لیکن وہ ذہنیت ایک دم مری

نہیں۔ آزادی کے بعد جس طرح کی فضا بنی اور "فرقہ واریت" نے جس آگ اور خون کے طوفان سے پیچیدہ ماحول بنایا تھا، اسی سیکولر کلچر میں یقین رکھنے والوں نے فرقہ واریت کے خلاف کامیابی سے میدان سنبھالا۔ ان کی اس مہم میں کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا بھی اہم کردار رہا۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ نہیں رکا ہے اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی ہیں، کل بھی اقتدار کی حصہ داری اور نیتاؤں کی انا کے ٹکراؤ نے مسائل کو الجھایا اور آج بھی کم و بیش وہی حالت ہے، لیکن اب اس کی شکل کچھ بدلی ہوئی ہے۔ آج انگریز نہیں ہیں، لیکن پارلمانی جمہوریت میں ووٹ پر مبنی جمہوری نظام کے غلط استعمال کے بڑھے رجحان نے سماجی تانے بانے کو الجھانے کے ساتھ ہندو مسلم رشتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اصولوں کی نفی کرتے اقتدار کی سیاست اور قدروں پر پڑ رہی چوطرفہ چوٹ کے اثر سے جو ذہنیت پنپی اور مضبوط ہو رہی ہے، اقتدار کی کش مکش میں ہندو مسلم رشتوں پر بھی اس کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

مجموعی طور پر ہندستان کی صورت حال مایوس کرنے والی رہی ہے اور اکثر لوگوں کو کہتے بھی سنا جاتا ہے کہ "ہندوؤں" کا "مسلمانوں" سے اتحاد ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ایک ساتھ خیر سگالی کے ماحول میں رہ ہی نہیں سکتے، کیونکہ دونوں کے سوچ میں ہی کچھ بنیادی فرق ہے۔ اس نتیجے پر پہنچنے والوں نے شاید یہ غور نہیں کیا کہ انسانی تہذیب نہ تو سیدھی ڈگر پر فروغ پائی ہے اور نہ ہی ہندستانی سماج کبھی سیدھا سپاٹ سماج رہا ہے۔ اگر تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر ہم دیکھیں تو پتا چلے گا کہ نام نہاد اختلافوں کے مقابلے میں دونوں اہم اکائیوں کے درمیان جوڑنے والے ہزاروں عناصر یہاں موجود رہے ہیں۔ تاریخی وراثت، موسیقی، فن تعمیر، ثقافت اور تہذیب کی رنگینیاں سب ساجھی اور ایک ہیں۔ اگر ان جوڑنے والی باتوں کے تعمیری پہلو پر دھیان دیا جائے، دلایا جائے، تو بھید بھاؤ پیدا کرنے والی ذہنیت کو ابھرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ یہاں ہمارے بیچ سیاسی قوت ارادی اور اختلافوں کو ایمان داری سے سلجھانے کے منشا کا فقدان نظر آتا ہے، یہی ہماری سب سے بڑی بدقسمتی، کمزوری اور المیہ رہا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہندستان کی دو خاص اکائیوں، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور دوستانہ رشتوں کی بنیاد پر ہی ہندستان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ لہٰذا اختلاف

پیدا کرنے والی باتوں کے سلسلے میں کافی محتاط رہنے کی ہمیں ضرورت ہے اور اختلافوں کو دور کرنے کے لئے ایک دوستانہ ماحول تیار کرنا ضروری ہے۔ آپسی اختلافوں کی بنیاد پر ٹکراؤ اور خاص کر فرقہ وارانہ فسادات، ہمارا ایسا الجھا ہوا قومی مسئلہ ہے، جس کی وجہ سے عالمی برادری کے سامنے اکثر ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ یہ بیماری بہت خطرناک ہے، اکثریتی طبقہ کے لوگ اس سے زیادہ فکرمند نہیں نظر آتے، یہ بھی حقیقت ہے۔ چونکہ فسادوں اور فرقہ وارانہ دنگوں کے زیادہ تر شکار اقلیتی طبقہ کے لوگ ہی ہوتے ہیں، یہ سوال بھی پوری طرح ان کا ہی مان لیا گیا ہے، جو کسی بھی حالت میں مناسب نہیں ہے۔ فسادات کے نتیجے میں جان و مال اور ذہنی اذیت کو زیادہ تر اقلیتی طبقہ ضرور جھیلتا ہے، لیکن فساد تو پورے سماج کو متاثر کرتے ہیں۔ پورا سماج ہی الجھ جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مسئلہ کو اقلیتی طبقہ کے لوگ جس نظریے سے دیکھتے ہیں، اکثریتی طبقہ کا وہ نظریہ نہیں ہے۔ فسادات سے جڑے مسئلے اکثریتی طبقہ کو اس طرح نہیں جھنجھوڑتے، جس طرح اقلیتی طبقہ کو پریشان کرتے ہیں۔

ہندستان کی تاریخ متعدد سماجی مصلحوں کی حصولیابیوں کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان بڑے لوگوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن ہی۔ اس کے باوجود ایک سچائی سامنے آتی ہے کہ موجودہ ہندستانی مُصلحوں میں مہاتما گاندھی کی شخصیت ہمہ جہتی اور زیادہ جاذب نظر رہی ہے۔ تحریک آزادی کی انہوں نے کامیاب قیادت کی اور سیاست میں اخلاقی اقدار کو قائم کرتے وسائل کی پاکیزگی کو اولیت دی، تاکہ جو بھی تعمیری تبدیلی سماج میں آئے، وہ دیرپا، مسلّم اور عالم گیر ہو۔ لوگوں کے مسائل کو اس کی گہرائی میں جا کر سمجھا، اسے جیا اور جھیلا اور ان الجھنوں سے نکلنے کی اپنی قدروں کی بنیاد پر مناسب راہ ہموار کی۔ ہندستان کی پلورل بناوٹ اور یہاں کی پیچیدہ مذہبی اور سماجی تانے بانے کے مدنظر ''ہر مذاہب کے احترام'' کی بنیاد پر سب ہندستانیوں کے جذبات کو ایک مضبوط لڑی میں پرونے کی انہوں نے کوشش کی۔ ایک مذہبی آدمی ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے مذہب کو کبھی بھی سب سے اعلیٰ مذہب نہیں کہا، دنیا کے تمام مذاہب کی اچھائیوں پر زور دیا۔ اپنے سناتن دھرم کے تئیں مکمل اعتقاد رکھتے ہوئے اقدار پر مبنی سول سوسائٹی کا ایک خوب صورت خاکہ انہوں نے تیار کیا۔ اس کے مختلف گوشوں میں تنوع کے باوجود ''اتحاد'' کا خاص پہلو ہمیشہ برقرار رہا، تاکہ مختلف مذاہب کو ماننے والوں کی اپنی پہچان

بھی بنی رہے اور وہ جذباتی طور پر ایک اکائی کے دھاگے میں متحد اور منظم بھی رہیں۔ موجودہ ہندستان کے ایک شخص جس پر سب ہندستانیوں کو فخر ہونا چاہئے تھا، وہ بلاشبہ مہاتما گاندھی ہیں۔ لیکن عجیب المیہ رہا کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے انہیں مسلمانوں کا مخالف مانا، ان کے خلوص پر بھروسہ نہیں کیا اور ہندوؤں کے ایک طبقہ نے انہیں ہندو اور ہندستان کا دشمن نمبر ایک مانا۔ ان کا وجود بھی ان کے لئے نا قابل برداشت ہو گیا اور ان لوگوں نے انہیں قتل ہی کر دیا۔

ہندو مسلم رشتوں کی پیچیدگیاں بہت حساس ہیں اور ملک کی بھلائی کے مد نظر ان کا سلجھانا نہایت ضروری ہے۔ ہندستانیوں کے عمومی سوچ پر اس مسئلہ کا حل کل بھی منحصر تھا اور آج بھی منحصر ہے۔ اس حساس مسئلہ پر جتنی سنجیدگی اور گہرائی سے گاندھی جی نے سوچا اور دھیان دیا، شاید ہی کسی اور نے دیا ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ہندستان کی دونوں اہم اکائیوں کے درمیان سیاسی وجوہات کی وجہ سے اتحاد قائم نہیں ہو سکا اور اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر ملک تقسیم ہو گیا۔ ملک کی تقسیم نے لوگوں کو جو گہرا زخم دیا تھا، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو گہری خلیج پیدا ہوئی تھی، اس کو پاٹنے میں، زخموں پر مرہم لگانے میں ان کا رول قابل تعریف ہے۔ امن اور خیر سگالی کا ماحول پیدا کرنے کی کوششوں میں وہ شہید ہی ہو گئے۔

ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ آزاد ہندستان میں ہزاروں چھوٹے بڑے ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ کچھ فسادات کے بعد جانچ کمیشن بحال ہوئے، ان کی رپورٹیں بھی آئیں۔ کہیں کہیں ان کی سفارشوں پر کچھ عمل بھی ہوا۔ لیکن عام طور پر انہیں سرد خانے میں ہی بند کر دیا گیا، کیونکہ ان کی روشنی میں قدم اٹھانے کی سیاسی قوت ارادی کا ہمیشہ فقدان رہا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بات ہوتی ہے بہت چھوٹی سی، لیکن اگر ایک فریق ''مسلمان'' ہے، تو بڑی آسانی سے اسے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بات بڑے فساد کی وجہ بن جاتی ہے اور آج کی سیاست اس آگ پر گھی کا کام کر جاتی ہے۔ معاملہ زمین جائداد کا ہو، تجارت یا سیاست کی رقابت، مسلمانوں کی شکل میں غیر ملکی حملہ آور، ملک کو تقسیم کرانے والے مسلمان کی شکل ہندوؤں کے ذہن پر ابھر آتی ہے اور معاملہ الجھ جاتا ہے۔ مسلمانوں کو غدار اور پاکستان کا ایجنٹ قرار دے کر انہیں آسانی سے پریشان کیا جاتا ہے، اذیت دی جاتی ہے۔ قانون کی آڑ میں بغیر مناسب جانچ پڑتال کے

انہیں جیلوں میں بند کر دیا جانا عام بات ہے۔ پورے ملک میں ایک نہیں سیکڑوں مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں، جہاں بے وجہ بےقصور مسلمان جسمانی اور ذہنی اذیتیں جھیل رہے ہیں۔ ہندستان کی اپنی رواداری ثقافتی وراثت یہاں ناکام اور جھینپی جھینپی سی نظر آتی ہے۔ سیکولر ذمہ دار اسٹیٹ کٹہرے میں نظر آتی ہے اور مسلمان خود کو ٹھگا سا محسوس کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد ان ۶۴ برسوں میں ہندستان کے ہر علاقے میں مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔ یہاں سیاسی پختگی کا احساس مضبوط ہوا ہے۔ اپنے اردگرد کے ملکوں کے مقابلے میں یہاں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں پُرامن طریقے سے اقتدار میں تبدیلی ہوتی ہے، جو تیسری دنیا کے دوسرے ملکوں کے لئے ایک مثالی نمونہ ہے۔ سیاسی کردار میں آتی جا رہی گراوٹ کو عام طور پر لوگ پسند نہیں کرتے، یہ فضا یہاں مضبوط ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ صورت حال بھی تکلیف دہ ہے کہ لیڈروں کی لمبی قطار میں کوئی مدبّر سیاست داں نظر نہیں آتا، جو آنے والے دنوں کے گمبھیر چیلنجوں کی الجھنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے یہاں فضا بنائے، لوگوں کو تیار کر سکے۔ ساری چیزیں اقتدار، عہدہ، عزت اور نمود کے اردگرد گھومتی نظر آ رہی ہیں اور اس ماحول میں تنگ اور کٹر نظریوں کو بڑھاوا دینے کے سنہرے مواقع بھی موجود ہیں۔ اپنی خود غرضیوں کی حصولیابی کے لئے اس ذہنیت کا استعمال کرنا آسان ہو رہا ہے۔ انگریزوں کی موجودگی میں اپنی کمزوریوں کو چھپا کر اپنی ساری الجھنوں کو انگریزوں کے سر تھوپ دینا آسان تھا۔ آج جب مذہب، ذات پات، زبان اور علاقائیت کی آڑ میں عام ہندستانیوں کے درمیان جو کش مکش کی حالت بن رہی ہے وہ آخر کار ہندستان کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوگا، آج کی حالت کے لئے ہم کسے ذمہ دار مانیں؟ ہندو مسلم اختلافوں کے سوال ہندستان کو الجھانے کے لئے کافی تھے، اب ہندو عیسائی، ہندو سکھ تلخی بھی ابھر رہی ہے اور بین الذاتی ٹکراؤ تو آنے والے دنوں میں بھیانک روپ لینے والا ہے، ایسی فضا بن رہی ہے۔

آزادی کی لڑائی کی تاریخ خاص طور سے کانگریس پارٹی کی بڑی چھتری کے تحت چلے جد و جہد کی تاریخ رہی ہے۔ ۱۸۸۵ کے بعد سے ہی اس نے ملک کے حقائق کے مدِ نظر ہندستانیوں میں تعمیری ذہنیت فروغ دینے کی کوشش کی۔ ۱۹۲۰ کے بعد سے آزادی کی لڑائی کی تاریخ گاندھی عہد کی تاریخ مان لی گئی اور اس مدت میں ان کے سوچ اور بنائے منصوبے کا خاص

رول رہا۔ کچھ تنگ نظر تنظیموں کو چھوڑ کر یہاں سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں نے بھی ملک میں سیکولر اور تعمیری ذہنیت کو مضبوط بنانے کی اہم کوشش کی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ پہل کمزور ہوتی گئی ہے۔ جس قسم کی عوامی خدمت اور سپردگی کے جذبہ کی تربیت سیاسی کارکنوں کو پہلے دی جاتی تھی، اب وہ حالت نہیں رہی ہے۔ سیاست اور پارٹیوں کے کردار میں اب بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ سیاست دانوں کی ترجیحات کے ساتھ ان کے سوچ میں بھی گراوٹ آئی ہے، ان کے طریقہ کار سے سیاسی کینواس کی شبیہ بدل گئی ہے۔ تحریک آزادی کے دور میں قربانی کے جو جذبے تھے، باوقار ملک کے لئے نیتاؤں کے دل میں جو آرزو تھی، ملک کی تعمیر نو کا جو حوصلہ بھرا امنگ تھا، بدقسمتی سے آج کے سیاست دانوں میں ان کا ایک شائبہ بھی نہیں بچا ہے۔ ملک اور سماج کے لئے ایثار اور قربانی کی جگہ حصول اقتدار کی دوڑ، کنبہ پروری اور خودغرضی نے لے لیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مال و دولت جمع کر لینا آج کی سیاست کا خاص مقصد بن کر رہ گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے آس پاس کے ملکوں کے مقابلے میں یہاں جمہوریت کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں اور ملک کے مستقبل کے بارے میں لوگ حساس ہیں۔ اس کی سالمیت پر اب کسی طرح کی چوٹ پڑنے نہیں دینا چاہتے۔ لیکن عام لوگوں کے درمیان اپنی سیاسی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں ابھی ویسی بیداری نہیں پائی جاتی، جیسی ۶۴ برسوں کے تجربے کے بعد پائی جانی چاہئے تھی۔ صالح جمہوریت کے جو بنیادی تقاضے ہیں، ان کے تئیں جو شعور متوقع تھا، ہمارے درمیان نہیں پیدا ہو سکا ہے۔ ہم ووٹ ضرور دے دیتے ہیں، لیکن پھر پانچ برسوں تک ہمارا کوئی رول ہی نہیں رہ جاتا۔ یہ حالت جمہوریت کی صحت کے لئے ٹھیک نہیں۔ اور وہ جمہوریت، جس کا خواب آزادی کی لڑائی کے دوران دیکھا گیا تھا، وہ تو ابھی خواب ہی ہے۔ ہم نے ''سوراجیہ'' کا خاکہ تیار کیا تھا اور عوامی اشتراک پر مبنی جمہوریت (Participatery Democracy) ہماری منزل تھی، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہم مغربی جمہوریت کے ماڈل پر آ کر ٹھہر گئے ہیں۔ نتیجتاً عوام ووٹ دینے کے بعد اپنے نمائندوں کے کالے سفید کارناموں کو سہتی رہتی ہے۔ ووٹ کے دباؤ کی سیاست کے تجربے اچھے نہیں رہے ہیں۔ اپنے نمائندوں پر ہم کیسے لگام لگائیں، یہ کوشش چلی تھی اور Right to Recall پر تبادلہ خیال بھی ہوا، لیکن بات آگے نہیں بڑھ سکی۔

گاندھی جی نے اپنی قابل فخر وراثت کے پس منظر میں آزاد ہندستان کا ہمہ جہتی بلو پرنٹ تیار کیا تھا۔ ۱۹۰۹ میں شائع ان کی کتاب ''ہند سوراجیہ'' سے ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ کے ''آخری وصیت نامے'' تک کی مدت گاندھی جی کی مصروف ترین زندگی، عدم تشدد پر مبنی ہندستان کی آزادی کی لڑائی، ہندستانیوں کی بہتری اور انسانیت کی فلاح کے لئے خود سپردگی اور مستعدی کی پرکشش داستان ہے۔ ساری مصروفیتوں کے درمیان وہ اہم مسئلہ، جسے انہوں نے اولیت دی تھی، وہ تھا ہندو مسلم اتحاد کا سوال۔ جنوبی افریقہ کے دنوں سے ہی گاندھی جی ہندو مسلم خیر سگالی اور یکجہتی کے سوال پر سب سے زیادہ حساس رہے۔ ہندستان کی پلورل بناوٹ اور یہاں کے سماجی تانے بانے کی کمزوریوں اور پیچیدگیوں کے سلسلے میں بھی گاندھی جی بہت محتاط تھے۔ رائج ذات پات والے نظام کی خرابیاں اور ناسور بنا چھوا چھوت ان کے لئے ناقابل برداشت اذیتیں تھیں۔ چھوا چھوت کی لعنتی ذہنیت کو وہ ہندو سماج کا کوڑھ مانتے رہے۔ جنوبی افریقہ سے آنے کے بعد جب انہوں نے احمد آباد میں کوچرب آشرم کی بنیاد ڈالی تھی، تو اسی وقت اس مسئلہ سے انہیں دو چار ہونا پڑا تھا۔ لوگوں کو جب پتا چلا کہ آشرم میں ایک ہریجن خاندان بھی رہتا ہے، تو ان لوگوں نے آشرم چلانے کے لئے مالی تعاون دینا بند کر دیا تھا۔ گاندھی جی اس خاندان کو وہاں سے ہٹائیں، ان پر چہار جانب سے دباؤ ڈالا گیا۔ لیکن انہوں نے دباؤ کے آگے جھکنا قبول نہیں کیا۔ کچھ دنوں کے بعد آشرم کی حالت معمول پر آ گئی اور لوگوں کا تعاون ملا۔ بعد میں وہ آشرم سابرمتی ندی کے کنارے لے جایا گیا اور وہ ''ہریجن آشرم'' ہی کہلانے لگا اور آج بھی وہ ''ہریجن آشرم'' کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ گاندھی جی یہیں رکتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ہندستان میں رائج توہم پرستی سے وہ مضطرب رہے اور جتنی بھی غیر فطری سماجی رسومات تھیں، ان کے تصور کو ہی انہوں نے بدل دیا۔ اسی سلسلے میں سناتن ہندو دھرم کو دھرم کے ٹھیکیدار، پونگا پنتھیوں سے نجات دلانے کی بھی پہل کی۔ مندروں کے دروازے سب کے لئے، خاص طور سے اچھوت ہریجنوں کے لئے کھلیں، اس کے لئے ملک گیر مہم چلائی اور شدت پسند ہندوؤں کے ہاتھوں کئی بار بے عزت بھی ہوئے۔ تعلیم کو ''کتابوں'' تک محدود نہیں رہنے دیا، اسے جسمانی محنت سے جوڑا۔ گاندھی جی نے Bread labour کی اہمیت پر زور دیا اور اسے ہندستان کے لئے مفید نئے تعلیمی نظام کا ایک ضروری حصہ مانا۔ ذات پات پر مبنی نظام کے بندھنوں کو توڑتے ہوئے اس

کے ایک اہم ستون ''چھتریہ'' یعنی ''سینانی'' کے مفہوم کو بھی بدل دیا۔ آزادی کی لڑائی میں ''ستیہ گرہ'' کے عدم تشدد کے ہتھیار کو اپنائے لوگوں کو انہوں نے ''مجاہد آزادی'' کا نام دیا۔ ان مجاہدوں نے سرکار کی اذیتیں جھیلیں، گولی کھائی، پھانسی پر بھی چڑھے، لیکن تشدد کے راستے کو اپنانے سے گریز کیا۔

۱۹۰۵ میں روس۔ جاپان جنگ میں ایشیا کے ایک چھوٹے سے ملک جاپان کے ہاتھوں یورپ کے روس جیسے بڑے ملک کی شکست نے یورپ کے ماتحت ایشیا کے نوآبادیاتی ملکوں میں ایک نئی بیداری پیدا کی تھی۔ ان ملکوں میں خود اعتمادی کا جذبہ ابھرا اور ثقافتی قومیت (Cultural Nationalism) کی ہلچل شروع ہوئی تھی۔ نتیجتاً ہندستان میں بھی نشاۃ ثانیہ کی لہر نے بیداری لا دی۔ بنکم چندر، تلک، گوکھلے، دیانند سرسوتی، رانا ڈے، فیروز شاہ مہتا، اروند گھوش، شاہ ولی اللہ، سرسید احمد خاں، امیر علی، چراغ علی، مولانا حالی، ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہ نے اس سلسلے کو اس مقام سے آگے بڑھایا، جہاں متعدد سماجی مصلحوں نے پہلے لا کر چھوڑا تھا۔ اسی دوران ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انگریزوں کے ذریعہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس کا سخت تشدد آمیز ردعمل ہوا۔ بنگال کے انقلابیوں نے سودیشی آندولن کے تحت بڑے حصے میں سرکاری نظم ونسق کو چیلنج کرنا شروع کیا۔

تشدد میں یقین رکھنے والے بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے (بال، پال، لال) کے ساتھ تنگ نظر قومیت کے بانی ونایک ساورکر، ڈاکٹر ہیڈگوار اور گروگول والکر نے ہندتو، ہندو قوم اور ہندو عہد کی شاندار ماضی کے پرکشش نعروں کے تحت ہندوؤں کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا خیال پنپ رہا تھا کہ انگریزوں کو تو جانا ہی ہے۔ اس لئے ان کے جانے کے بعد ہندستان میں اکثریتی ہندوؤں کی ہی حکومت قائم ہوگی اور ہونی ہی چاہئے۔ لیکن حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر مسلم لیگ کی قیادت میں کچھ پڑھے لکھے مسلمان بھی اب متحرک ہو چکے تھے لہٰذا مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی کش مکش دھیرے دھیرے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ بنتا گیا۔ وہابی تحریک کے گہرے اثرات کے ساتھ ۱۸۵۷ کے بعد کی پیدا صورت حال میں مسلمانوں نے انگریز دشمنی میں ہر اس چیز کی مخالفت کی، جس کا انگریزوں سے واسطہ رہا۔ یہاں تک کہ انہوں نے انگریزی تعلیم کا بھی بائیکاٹ کیا۔ انگریز مخالف ذہنیت کی وجہ

سے انیسویں صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لائق وہ نہیں رہے۔ نتیجتاً ہر میدان میں وہ پچھڑتے چلے گئے تھے۔ بعد میں سر سید احمد خاں اور ان کے احباب نے انگریزی تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور اسے اپنانے کی مہم چلائی تھی۔ ان اقدام کا مثبت اثر مسلمانوں پر پڑا۔ مسلمانوں کے درمیان بھی اب پڑھا لکھا ایسا طبقہ پیدا ہو چکا تھا، جس نے ۱۸۵۷ کے ہولناک المیہ کی مار جھیلی ذہنیت سے اوپر اٹھ کر اپنی باعزت بقا کی دوڑ میں متحرک ہو کر ہندوؤں کے مقابلے میدان سنبھال لیا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس نے ہندستانیوں کے اندر سیاسی شعور پیدا کر دیا تھا، لہذا حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کی دونوں میں کش مکش جاری تھی۔ گاندھی جی نے دونوں فریقوں کے بیچ پُل بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن انگریزوں کی نپی تلی پالیسیوں کے باعث حالت الجھتی ہی گئی اور وہ اپنی کوشش میں مات کھا گئے۔

ایسے ہندو جو تنگ نظر ہندتوا اور ثقافتی مذہبی قومیت کے حامی تھے، ان کے لئے انسانیت کو چیلنج دیتے عناصر، انگریزوں اور مسلمانوں سے نمٹنے سے زیادہ مشکل سناتن دھرمی ہندو گاندھی اور ان کے انسانی اقدار پر مبنی تحریک ثابت ہو رہی تھی۔ آزادی اور اقتدار کی منتقلی کی فضا بن رہی تھی، لیکن وہ حکومت صرف ہندوؤں کو نہیں سونپی جانی تھی، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو حکومت کا حصہ دار بنایا جانا تھا۔ یہ صورت حال تنگ نظری کے حامل ہندوؤں کو کسی طرح گوارا نہیں تھی۔ سب کو برابری کی بنیاد پر یکساں طور پر حکومت سونپی جائے، گاندھی جی اسی کے حامی تھے۔ ہندوؤں سے مسلمان الگ نہیں ہیں، مسلمانوں سے ہندو الگ نہیں ہیں، دونوں کو سمجھانے کی انتھک کوششوں میں وہ لگے ہوئے تھے۔ شدت پسند ہندوؤں کی نظر میں گاندھی جی مسلمانوں کی بے جا پشت پناہی (Appeasement) کر رہے تھے۔ اسی دوران سیاسی تگ و دَو نے ملک کے بٹوارے کی بات سامنے لا دی اور آزاد ہندستان میں سیکولر جمہوریت قائم ہونا بھی طے ہو گئی۔ ہندستان نہ ہندو ملک بنا، نہ حکومت صرف ہندوؤں کو سپرد ہوئی، بلکہ ملک تقسیم ہو گیا اور زیادہ تر مسلمان یہیں رہ بھی گئے اور ہندوؤں کے برابر سب قانونی اختیار بھی انہیں ملنا طے تھا، یعنی شدت پسند ہندوؤں کے لئے حالت کریلے پر نیم ثابت ہو رہی تھی۔ تنگ نظر قوم پرستوں کے لئے وہ فضا نا قابل برداشت تھی لہذا انہوں نے اپنا سارا غصہ کمزور، نہتھے گاندھی جی پر ہی اتار دیا۔ پرارتھنا سبھا میں جاتے ہوئے انہیں شہید کر اپنی سمجھ سے اپنی بہادری اور بے حد "دلیر جانباز

محب وطن'' ہونے کا ثبوت دیا۔

گاندھی جی کا مارا جانا ایک تکلیف دہ المیہ تھا۔ لیکن ان کے قتل نے گاندھی جی کو ''حق'' کی تلاش میں شہید ہونے والے عیسیٰ مسیح (عیسائیوں کے مطابق)، سقراط، منصور، گیلیلیو جیسی عظیم ہستیوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ساورکر اور ان کے سازشی سنگھ پریوار کے افراد کو اگر یہ اندازہ ہوتا کہ گاندھی کو مار دینے سے گاندھی اور بھی بڑے اور عظیم ہو جائیں گے، تو شاید وہ یہ قدم نہیں اٹھاتے۔ آزادی کی لڑائی کا ۱۹۲۰ کے بعد کی تاریخ گاندھی عہد کی تاریخ رہی۔ لیکن جب آزاد ہندستان نے گاندھی کے خوابوں کے خاکے میں رنگ بھرنے کی طرف توجہ دینا بھی ضروری نہیں سمجھا، تو ملک کی حالت بدلی۔ سوراجیہ کا خواب ادھورا رہ گیا اور آج گلوبلائزیشن کے شکنجے میں جکڑا ہندستان پھر غلامی کے دہانے تک پہنچ چکا ہے۔

جس وقت ہندستان کے افق پر اپنی شان و شکوہ کے ساتھ آزادی کا سورج طلوع ہوا، یہاں کا ماحول جلی ادھ جلی لاشوں کی بدبو سے متعفن تھا اور لٹے جلے اثاثے اپنی بربادی کا ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ دو قومی نظریہ، نیتاؤں کی تنگ نظری، ان کا تکبر، ان کی ضد اور بے لچک ذہنیت کے ساتھ سامراجی سازش کی چال بازیوں نے کچھ ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ آزادی کی برسوں کی تمنا پوری ہو جانے کے باوجود ماحول ماتم کا بنا رہا۔ ہندستان اور پاکستان میں خوشی و مسرت کی جو فطری فضا ہونی چاہئے تھی، وہ تھی نہیں۔ ملک کی تقسیم کا درد ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔ حکومت کی منتقلی ہوئی اور آزادی کی قیمتی دولت ہمیں نصیب ہوئی، لیکن زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صدیوں کے میل جول کے نتیجے میں رشتوں میں جو گرماہٹ تھی، وہ بہت حد تک سرد ہو چکی تھی۔ مضبوط رشتے کمزور ہو چکے تھے۔ کچھ گھروں اور سرکاری عمارتوں پر چراغاں کئے گئے، جشن بھی منایا گیا، لیکن سب کے سب بے جان تماشے لگ رہے تھے اور وہ شخص، جس کی رہنمائی میں ملک آزاد ہوا، وہ کلکتہ کے بیلیا گھٹا کے حیدری ہاؤس کے ایک اندھیرے کمرے میں مایوس، گم صم بیٹھا تنہا اپنے ٹوٹے خوابوں کا درد جھیل رہا تھا۔ اس کے کمرے میں چاروں طرف شیشے کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے، فسادیوں نے کھڑکیوں پر پتھر مار مار کر اسے بدشکل بنا دیا تھا۔

لگ بھگ ڈیڑھ سو برسوں کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستانیوں نے آزاد فضا میں

سانس لی تھی، لیکن اس مقصد کی حصولیابی کے لئے انہیں بڑی قیمت چکانی پڑی۔ انہیں آگ اور خون کی ندی سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ ہندستان جو تنوعات میں اتحاد و یگانگت (Unity in Diversity) کا زندہ نمونہ کبھی سمجھا جاتا تھا اور وہ ہندستانی جو مالے کے دانے کی طرح الگ ہونے کے باوجود پیار اور مشترکہ ثقافتی وراثت کے ایک قیمتی دھاگے میں پروئے ہوئے تھے، یکا یک الگ ہو گئے، دھاگا ٹوٹ گیا اور دانے بکھر سے گئے۔ بے شمار لوگوں کو اِدھر سے اُدھر جانا اور اُدھر سے اِدھر آنا، راستوں کے جان لیوا حملے، دونوں طرف سرحدوں پر قتل اور تباہی کے واقعات، کچھ ایسی انہونیاں تھیں، جن کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والی دو خاص اکائیاں ایک دوسرے سے بُری طرح ڈرنے لگیں، مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دوسرے کے تئیں جو اعتماد کا رشتہ تھا، وہ ہمیشہ کے لئے ختم سا ہو گیا۔ حالت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک کے ہندستان کی تاریخ کو عدم اعتمادی، نفرت، خون خرابے اور شیطانی رقص کی تکلیف دہ تاریخ اگر کہی جائے، تو وہ غیر مناسب نہیں ہوگا۔

مذہب کے نام پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے پر جو قہر ڈھایا تھا، وہ مذہب کی بے عزتی تھی۔ وہ ہندو دھرم جو ذرے ذرے میں ایشور کو دیکھتا ہو اور وہ اسلام جو پورے عالم کے لئے امن کا پیغام لے کر آیا، کیسے اس بات کی اجازت دے سکتے تھے کہ آدمی، آدمی کو اس طرح ذلیل کرے، ایک دوسرے کا بدخواہ بن جائے اور سر پر حیوانیت اتنی چڑھ جائے کہ اچھے اور بُرے کی تمیز بھی ختم ہو جائے۔ اس دور میں یہاں قتل، لوٹ مار، آگ زنی، اجتماعی عصمت دری، اغوا اور وہ کون سی بربریت تھی، جس کا مظاہرہ جے بجرنگ بلی، ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ نہیں کیا گیا۔

ہندستان کے بڑے حصے میں آگ اور خون کی جو ہولی کھیلی گئی تھی، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجود اختلافوں کے پہنچنے کی انتہائی حد تھی۔ جب آپسی اختلاف نفرت کی شکل لے لیتا ہے، تب انسانیت کو غیر تصوری بربادی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ہندستان اسی المناک حالت سے گزر رہا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان دو قومیت کی لہر بنگال سے پنجاب تک چلی تھی اور نتیجہ کے طور پر ایک نیا ملک پاکستان، ہندستان کے ایک حصے کو کاٹ کر بنا تھا۔ اس نظریہ کی بنیاد پر بنے نئے ملک کے ناخدا ہندستان کے مختلف حصوں میں بسنے والے اس نظریہ کے

حمایتی اور مخالف مسلمانوں کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر اپنی نئی جنت بسانے میں لگ گئے تھے۔ بربادی اور بھگدڑ کے اس ماحول میں دہشت سے روبرو ہندستانی مسلمان، جنھوں نے پاکستان کی مانگ کی حمایت کی ہو یا جنھوں نے مخالفت، نئی صورت حال میں بالکل بے یار و مددگار نہیں ہوئے۔ قومی المیہ کے اس خطرناک ماحول میں جب ''کوئی کسی کا نہیں'' کی حالت تھی، بدحواس نیشلسٹ مسلمانوں کے ساتھ انسانی اقدار اور سیکولر خیالات میں یقین رکھنے والے بہت سے باثر ہندو آگے آئے۔ ان کے کندھوں پر پیار بھرا ہاتھ رکھا اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی مدد کی، انہیں تحفظ فراہم کیا اور پوری ایمان داری سے یہ چاہا کہ مسلمان وطن چھوڑ کر پاکستان نہ جائیں۔ انہیں یقین دلایا کہ ہندستان میں رہنے والے مسلمانوں کی بھی ملک کی حکومت میں ویسی ہی حصہ داری ہوگی جیسی دوسرے ہندستانیوں کو حاصل ہوگی۔ وہ اختیار مسلمان کو بھی حاصل ہوں گے جو ہندوؤں یا دوسرے ہندستانیوں کو ملیں گے اور اس مضبوط ارادے کو حقیقی شکل دینے میں گاندھی جی سب سے فعال اور سرگرم تھے۔ ادھر پاکستان سے ہندو اور سکھ بھاگ رہے تھے، بھگائے جا رہے تھے۔ لٹے پٹے ہزاروں ہزار کی تعداد میں پناہ گزیں پانی پت، کروچھیتر سے دلی کی گلیوں تک پناہ کی تلاش میں پریشان بھٹک رہے تھے اور مسلمانوں کا وجود انہیں کھٹک رہا تھا۔ انارکی کے ماحول میں بدحواسی میں مبتلا کس مسلمان کو یقین ہو سکتا تھا کہ ہندستان میں ان کو وہی اختیار اور سہولیت اور مواقع حاصل ہوں گے، جو ان لوگوں کو حاصل ہوں گے، جنھوں نے پاکستان کے نظریے کی مخالفت کی تھی۔ لیکن ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کی شام جب گاندھی جی اپنی متحدہ قومیت، انسان دوستی اور انسانی اقدار کو مستحکم کرتے مسلمانوں کی پشت پناہی کے جرم میں شہید کر دئے گئے، تو یہ بات صاف ہوگئی کہ شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، ہندستان کی روایت ابھی مری نہیں ہے۔ اس کی کشادہ دلی ابھی زندہ ہے اور مسلمان ہندستان کے ویسے ہی باعزت شہری ہیں اور رہیں گے، جیسے کہ دوسرے لوگ، کیونکہ راشٹر پتا (بابائے قوم) مہاتما گاندھی کی شہادت سے بڑھ کر اس دعوے کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دوسرا ثبوت پیش کرنا ناممکن تھا۔

جیوں جیوں ہندستان کی آزادی نزدیک نظر آنے لگی تھی، حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش تیزتر ہوئی۔ اپنی پہچان کو برقرار رکھنے اور اپنے دعووں کو صحیح ثابت کرنے کی

کوشش میں مستعد کانگریس اور مسلم لیگ کا آپسی اختلاف ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ نتیجتاً سیاست میں دلچسپی رکھنے والے تو الگ، عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی تناؤ بڑھتا گیا۔ مسلمانوں کی حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر دو قومیت کا سوال مسلم لیگ نے سامنے لایا تھا، اسی طرح ہندوؤں کے درمیان کٹر، تنگ نظر خیالات والی مسلم مخالف تنظیم آر۔ایس۔ایس اور ہندو مہا سبھا کافی مضبوط تھی جو کانگریس اور خاص کر گاندھی جی کی عالمی اخوت کی بنیاد پر ترقی یافتہ متحدہ قومی نظریہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ جب ملک تقسیم ہو گیا، تو ایسی تنظیموں کی، گاندھی اور کچھ مسلمانوں کی پارٹی رہی مسلم لیگ دشمن ذہنیت کو بڑی تقویت ملی۔ اب اس نے کھلے طور پر کہنا شروع کیا...... دیکھو اس گاندھی کو، مسلمانوں نے ملک کا بٹوارا کرا دیا، پاکستان بھی بنوا لیا، اس کے باوجود گاندھی اور ان کے ہم نوا مسلمانوں کی حمایت کر رہے ہیں اور یہاں رہ گئے مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر ہی اختیار اور سہولیت دی جائے، اس پر زور دے رہے ہیں...... حد ہو گئی، بھارت ماتا اور ہندوؤں کی اس سے زیادہ اور کیا بے عزتی ہو سکتی ہے؟

ہندستان کی جغرافیائی، ثقافتی، تاریخی، سماجی اور نسلی بناوٹوں کو نظر انداز کرتا صرف گنتی کی پہیلیاں بجھاتا وہ تنگ نظر ہندو مہا سبھائی ذہنی رجحان، جس کا نمائندہ بن کر ناتھو رام گوڈسے سامنے آیا تھا، کچھ دنوں سے بہت سرگرم تھا، لیکن گاندھی جی کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے رفقائے کار کی مقبولیت کے سبب اسے کھل کر سامنے آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ملک کی تقسیم نے اسے اپنے نظریے کے ''وزن'' کو ثابت کرنے کا اچھا موقع دے دیا۔ لوگوں کے سامنے گاندھی جی اور کانگریس کی پالیسیوں کو وہ ملک اور خاص کر ہندوؤں کے لئے نقصان دہ ثابت کر سکے، ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ابھار سکے، اس کا اب پورا موقع اسے حاصل تھا۔ اسے اپنی کوششوں میں کامیابی بھی ملی، کیونکہ ہندستان کا ماحول کچھ ایسا زہریلا ہو گیا تھا کہ ایسے لوگ جن کے مسلمانوں سے دانت کاٹی روٹی کا تعلق تھا اور جنہوں نے خون خرابے اور ظلم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو کبھی پسند نہیں کیا، وہ بھی گمراہ ہو گئے۔ ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں بھی یہ بات ابھر رہی تھی کہ مسلمانوں کے یہاں رہنے کا اب کوئی جواز نہیں......۔

دور مغلیہ کی شان و شوکت کی علامت شاہ جہاں کا بنوایا ہوا دہلی کا لال قلعہ اور اس کے

دیوان خاص اور دیوان عام، ہندستان کی تاریخ کے کئی نشیب و فراز کے چشم دید گواہ ہیں، ان میں وہاں چلے تین مقدموں کی بڑی اہمیت ہے۔ اس تاریخی لال قلعہ کے در و دیوار نے اس وقت خون کے آنسو بہائے ہوں گے، جب اس کے بانیوں کی نسل کے آخری تاج دار وارث مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر پر انگریزوں کی مخالفت کرتے ۱۸۵۷ کے باغی فوجیوں کی قیادت کرنے کے جرم میں غداری کا مقدمہ اسی صحن میں چلایا گیا۔ دیوان عام کے اس جھروکے پر ابھی وہ انگریز سازشی جنرل بیٹھا تھا، جہاں سے مغل شہنشاہ لوگوں کو کبھی دیدار کرایا کرتے ان کی فریاد سنا کرتے تھے۔ وہ دیدار کرانے والا آخری شہنشاہ مجرموں کی طرح جھروکے کے نیچے آج ہاتھ باندھے کھڑا ہونے پر مجبور تھا۔ انگریزی فیصلے کے مطابق اسے ہندستان کا دشمن ثابت کر رنگون جلا وطن کر دیا گیا اور اس کے ساتھ مغل سلطنت کا افسوس ناک خاتمہ ہوا۔ سازشی انگریز ہندستان کے مالک بن بیٹھے۔ تمثماتی انگریزی نوآباد سرکار نے لال قلعہ کے دیوان عام میں اسی جگہ دوسرا غداری کا مقدمہ آزاد ہند فوج کے جاں باز ہیرو 'دلی چلو' کی آواز بلند کرنے والے نیتا جی سبھاش چندر بوس کے معاونوں لکشمی سہگل، ڈھلوں اور جنرل شاہ نواز پر چلایا تھا۔ اور اب ایسا تیسرا موقع تھا، جب اسی جگہ آزاد ہندستان کے "راشٹر پتا" کے قاتلوں پر آزاد ہندستان کی سرکار کے ذریعہ مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔

انڈین سول سروس، جیوڈیشیل برانچ کے معزز ممبر آتما چرن اگروال کی خصوصی عدالت میں ۲۲ جون ۱۹۴۸ سے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزم تھے:

۱۔ ناتھورام گوڈسے، عمر ۳۷ سال، ایڈیٹر۔ ہندو راشٹر، پونا
۲۔ گوپال گوڈسے، عمر ۲۷ سال، اسٹور کیپر، آرمی ڈپو، پونا
۳۔ نارائن آپٹے، عمر ۳۴ سال، مینیجنگ ڈائرکٹر، ہندو راشٹر پرکاشن لیمیٹڈ، پونا
۴۔ وشنو کرکرے، عمر ۳۷ سال، احمد نگر کے ایک ہوٹل کا مالک
۵۔ مدن لال پہوا، عمر ۲۰ سال، احمد نگر رفیوجی کیمپ
۶۔ شنکر کشٹیا، عمر ۲۷ سال، گھریلو نوکر، پونا
۷۔ دتاتریا پرچرے، عمر ۴۹ سال، ڈاکٹر، گوالیار
۸۔ ونایک دامودر ساورکر، عمر ۶۵ سال، بیرسٹر، بمبئی

تین فرار ہو گئے ملزموں: گنگا دھر ڈنڈو تے، گنگا دھر یادو اور سریو دیو شرما پر بھی ان کی غیر موجودگی میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔

سرکار کی جانب سے اس وقت کے بمبئی کے سنیر وکیل سی۔ کے۔ دفتری نے کارروائی شروع کی۔ ۲۴ جون ۱۹۴۸ سے گواہیاں گزرنی شروع ہوئیں، جو ۶ نومبر کو ختم ہوئیں۔ اس مقدمے کی کارروائی پر پوری دنیا کی نظر لگی ہوئی تھی۔ کارروائی کے دوران صحافیوں کو کارروائی لکھنے اور انہیں شائع کرنے کی پوری اجازت تھی۔ ہزاروں لوگوں نے کارروائی کو دیکھا، بہت سارے گواہ گزرے اور بڑی تعداد میں دستاویزوں کی پرکھ اور جانچ کی گئی۔ لگ بھگ ایک ماہ بحثوں کا سلسلہ چلا اور ۱۰ فروری ۱۹۴۹ کو فیصلہ سنایا گیا۔ فیصلے کے مطابق ونایک دامودر ساورکر کو Benefit of Doubt کی بنیاد پر آزاد کر دیا گیا۔ ناتھورام گوڈسے اور اس کے ساتھی نارائن آپٹے کو پھانسی کی سزا دی گئی اور بقیہ پانچ ملزموں کو تاعمر قید کی سزا دی گئی۔ ملزموں کو ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت بھی دی گئی۔ چار دنوں کے بعد سات آدمیوں نے اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ ناتھورام گوڈسے نے اپنے لئے سزائے موت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کرنے سے انکار کر دیا، لیکن سازش کے سوال پر اس نے اپیل کی اور مہاتما گاندھی کے قتل کی پوری ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے اس میں کسی اور کے شریک رہنے کے امکانات سے انکار کیا۔

ان دنوں پنجاب ہائی کورٹ شملہ میں ہوا کرتا تھا۔ تین ججوں، جسٹس جی۔ ڈی کھوسلا، جسٹس یو۔ این۔ بھنڈاری اور جسٹس جے۔ اچھورام کی بنچ میں عالمی تاریخ کو متاثر کرنے والے اس مقدمہ کی سنوائی ہوئی۔ ۲ مئی ۱۹۴۹ کو مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ آپٹے اور مدن لال پہوا کی جانب سے پیروی کے لئے کلکتہ کے ایک سنیئر وکیل بنرجی، کرکرے کے لئے ڈگلے اور پنجاب ہائی کورٹ کے ایک وکیل اوتھی کو لوگوں نے کشٹیا کی جانب سے رکھا تھا۔ بمبئی ہائی کورٹ کے انعامدار، پرچرے اور گوپال گوڈسے کی جانب سے پیروی کے لئے عدالت میں موجود تھے۔ ناتھورام گوڈسے نے اپنا کوئی وکیل نہیں رکھا تھا، اس نے خود ہی اپنے مقدمے کی پیروی کی۔ استغاثہ کی جانب سے بمبئی کے سنیئر وکیل دفتری، این۔ کے۔ پانگر اور کرتار سنگھ چاؤلا پیش ہوئے۔ کارروائی شروع ہوئی اور لمبی بحثیں ہوئیں۔ ناتھورام گوڈسے نے اپنی بحث شروع کی اور

بڑے مدلل انداز میں گاندھی جی کے قتل کی اپنی گھناؤنی حرکت کو جائز ٹھہراتے ہوئے پانچ گھنٹوں تک بیان دیا تھا۔ جسٹس کھوسلا نے اپنی کتاب "The Murder of Mahatma" صفحات ۲۰۱۔۲۴۵، میں اس مقدمہ کی روداد پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گوڈ سے نے جو انداز بیان اپنایا تھا، اس سے مقدمے کی کارروائی کے دوران ہائی کورٹ میں موجود لوگوں پر سکتے کی حالت چھائی ہوئی تھی۔ اس کا طرز بیان اور واقعات کی سلسلہ وار کڑی کی تفصیل کے ساتھ اپنی مذموم حرکت کی تائید میں مذہبی کتابوں سے دئے گئے حوالوں نے لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے ہمدردی پیدا کردی تھی۔ جب اس نے اپنا بیان ختم کیا، تو عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ جذباتی ہو رہے تھے اور وہاں موجود عورتوں کی آنکھیں نم تھیں اور دبی دبی سسکیوں کے درمیان کھانسنے کی آواز ادھر ادھر سے سنائی دے رہی تھی۔ جسٹس کھوسلا کا کہنا ہے کہ اگر اس دن کارروائی کے دوران کورٹ میں موجود لوگوں کے ہاتھ میں مقدمہ کا فیصلہ دے دیا جاتا، تو لوگ ناتھورام گوڈ سے کو یقینی طور پر الزام سے بری کر دیتے۔

ہائی کورٹ نے آپٹے اور ناتھورام گوڈ سے کی پھانسی کی سزا کو جائز ٹھہرایا۔ پَر چُر ے اور شنکر کشٹیا کو Benefit of Doubt کی بنیاد پر بری کر دیا اور پانچ دوسرے ملزموں کی تا عمر قید کی سزا برقرار رہی۔ آپٹے اور گوڈ سے کو ۱۵ نومبر ۱۹۴۹ کو انبالا جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

گاندھی جی کے قتل کے بعد گوڈ سے کو اپنا بیان تیار کرنے کا کافی موقع ملا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تو تھا ہی، لہٰذا اپنی گھناؤنی حرکت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے تفصیل سے مواد جمع کیا اور سو فیصد جھوٹ کو صحیح بتانے کی کامیاب کوشش کی۔ ایک وکیل اپنی دلیل سے ججوں کو اکثر لاجواب کر دیتا ہے، مگر جھوٹ ہمیشہ جھوٹ ہی ہوتا ہے، وہ سچ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا بڑی کوششوں کے باوجود گوڈ سے بھی اپنے جرم سے بری نہیں ہو سکا۔

گوڈ سے نے گاندھی جی کے قتل کو جائز بتاتے ہوئے عدالت میں ایک وکیل کی طرح جو دلیل دی، وہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی تو تھی ہی، لیکن اس کے کچھ حصے دلچسپ ہیں۔ اس نے کہا تھا:

> ''......میں مذہبی برہمن گھرانے میں پیدا ہوا، اس لئے میں ہندو دھرم، ہندو تاریخ اور تہذیب کا شیدائی ہوں۔ ہندو ہونے پر مجھے فخر ہے۔ جیوں جیوں

بڑا ہوتا گیا، آزادانداز میں سوچتا رہا۔ کبھی مذہبی یا سیاسی شدت پسندی کو نہیں اپنایا۔ میں نے چھوا چھوت ختم کرنے جیسے کاموں میں دلچسپی لی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ بنا پیشہ وارانہ بھید بھاؤ کے سب ہندو برابر ہیں اور مذہبی نظریے سے انہیں ایک ہی ماننا چاہئے......

میں نے دادا بھائی نورو جی، وویکانند، گوکھلے اور تلک کی تحریروں کے ساتھ قدیم اور موجودہ ہندستان کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انگلینڈ، فرانس، روس اور امریکہ کی تاریخ بھی پڑھی ہے۔ یہی نہیں، میں نے کمیونزم اور سوشلزم کا بھی وسیع مطالعہ کیا ہے۔ ویر ساورکر اور گاندھی جی کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کا بھی دعویٰ کر سکتا ہوں۔ ان کی تحریر وتقریر نے میری شخصیت کو بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ موجودہ ہندستان کے پچاس برسوں کی تاریخ پر ان دونوں لوگوں کی گہری چھاپ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان مطالعوں نے مجھے ہندوؤں کے فروغ اور ہندو ملک کی فلاح کے لئے ایک محب وطن اور انسان دوست کے روپ میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کیا، وجہ صاف ہے، تیس کروڑ ہندوؤں کی آزادی، ان کے اختیار اور فلاح کی بات کرنا پوری دنیا کی آبادی کے پچاسویں حصہ کی خدمت کرنے جیسا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت میں ہندو تنظیم کا سرگرم ممبر بنا۔ جب شیاما پرساد مکھر جی ہندو مہا سبھا کے صدر ہوئے، اس وقت یہ تنظیم کانگریس کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ اس وقت گاندھی جی اور ان کے ماننے والے ایک جیسی پالیسی پر چل رہے تھے، جو ہندوؤں کے لئے زہر جیسا تھا اور دوسری طرف مسلم لیگ ہندوؤں کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ہندو مہا سبھا اتنی طاقتور نہیں تھی کہ ایک ساتھ دونوں سے ٹکر لے اور میں اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور تھا کہ مہا سبھا ہندوؤں کو منظم کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اس لئے اپنے خیالات سے متفق ہندو نوجوانوں کی ایک الگ تنظیم بنانی طے کیا۔ اس طرح میں نے بزرگ نیتاؤں سے صلاح لئے بغیر گاندھی واد اور مسلم لیگ سے ایک ساتھ

مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

...... ۱۹۴۶ اور اس کے آس پاس بنگال کی سہروردی سرکار کی حوصلہ افزائی سے نواکھالی میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر جو ظلم کئے، اس سے ہمارا خون کھولنے لگا تھا۔ ذلت برداشت کرنے کی ہماری حد اس وقت ختم ہوئی، جب گاندھی جی سہروردی کی ڈھال بن گئے اور اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں شہید سہروردی کہہ کر انہیں مخاطب کیا۔ یہی نہیں، جب وہ دہلی آ گئے، تو بھنگی کالونی کے مندر میں پجاریوں اور دوسرے لوگوں کی مخالفت کے باوجود قرآن پڑھوانا شروع کر دیا۔ کسی مسجد میں گیتا پڑھوانے کی انہیں ہمت نہیں ہوئی، کیونکہ مسلمان اس کی مخالفت کرتے۔ اس لئے انہوں نے ہندوؤں کی وسیع القلبی اور فراخ ذہنیت کو ہی چوٹ پہنچائی۔ میں نے بھی اسی وقت طے کیا کہ گاندھی جی کو بتا دینا ہی چاہئے کہ جب ہندوؤں کی عزت نفس پر چوٹ پہنچتی ہے، تو وہ قوت برداشت کی حدوں کو توڑ بھی سکتے ہیں۔ اس لئے ہم لوگوں نے منصوبہ بنایا کہ ان کی پرارتھنا سبھا میں گڑبڑی پیدا کریں گے...... اسی دوران پنجاب اور دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی فرقہ واریت رنگ لانے لگی۔ جب ہندوؤں نے بہار، کلکتہ، پنجاب اور دوسری جگہوں پر ردعمل کا مظاہرہ کیا، تو کانگریس سرکار نے بے رحمی سے انہیں گولی ماری، ان پر مقدمے چلائے اور انہیں پریشان کیا۔ جب پنجاب میں ہندوؤں پر قیامت ڈھائی جا رہی تھی، ان کا خون پانی کی طرح سستا ہو گیا تھا، شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر یہاں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کا جشن منایا جا رہا تھا۔ ہمارے معاون مہا سبھائیوں نے جشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ لیا اور مسلم ظالموں سے مقابلہ کرنا طے کیا۔

...... پانچ کروڑ ہندستانی مسلمان اب یقینی طور سے ہمارے ملک کے باشندہ نہیں۔ پچھم بنگال میں اقلیتوں کا صفایا کیا جا چکا ہے۔ صدیوں سے بنی بنائی ان کی گرہستی برباد کر دی گئی ہے۔ ان کی جڑیں کھودی جا رہی ہیں۔ ان کو قتل

کیا گیا، ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہی سلسلہ مشرقی پاکستان میں بھی چل رہا ہے۔
لاکھوں لاکھ اجڑ گئے، اس میں کچھ مسلمان بھی ہوں گے، مگر ابھی تک گاندھی
جی مسلمانوں کی بے جا مصلحت خواہ پشت پناہی (Appeasement) کی
پالیسی پر ہی جمے ہوئے تھے۔ ہمارا خون ان چیزوں کو دیکھ کر ابل رہا تھا، اس
لئے ان کو اور برداشت کرنا ہمارے لئے ناممکن تھا...... گاندھی جی نے
انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کو کامیاب بنا دیا، انہوں نے
ہندستان کی تقسیم میں انگریزوں کی مدد کی۔...... گاندھی جی کی ۲۲ برسوں کی
اشتعال پیدا کرنے والی کوشش اپنی انتہائی حد پر اس وقت پہنچی، جب انہوں
نے مسلم حمایت میں ورت رکھا۔ یہ انتہا تھی میری قوت برداشت کی، اور میں
نے طے کیا کہ اب ان کو جلد سے جلد ختم ہی کر دینا چاہئے۔"[1]

گاندھی جی کا قتل کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔[2] ان کے قتل نے متعدد ایسے سوالوں کو سامنے لایا، جن کے حل کی تلاش اسی وقت سے ہو رہی تھی، جب انگریزوں کے آنے اور یہاں جم جانے کے بعد منظم طریقے سے ہندستان میں ایک نئی حالت اور نظم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور ہندو اور مسلمان کسی نہ کسی وجہ سے مد مقابل فریقوں کی طرح آمنے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ آج بھی وہ سوال اپنی جگہ پر جیوں کے تیوں موجود ہیں اور مناسب حل کی تلاش بھی جاری ہے۔ پورے برصغیر ہند، پاکستان اور بنگلہ دیش کی فی الوقت ترقی اور روشن مستقبل اسی تلاش کی کامیابی پر منحصر ہے۔

ہندستان میں جب جب ہندوؤں کی بیداری کی کوشش ہوئی یا ان کے درمیان سماجی اصلاح کی تحریک چلی، جانے یا انجانے وہ تحریک ایک ایسے موڑ پر جا پہنچی ہے، جہاں یہ فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ ہندوؤں کے اندر نئی سوچ پیدا کرنا چاہتے ہیں یا مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو متحد کرنا ان کا خاص مقصد رہا ہے۔ کم و بیش یہی حالت مسلمانوں میں شروع ہوئی اصلاحی تحریکوں کی بھی رہی، ان کی حدیں بھی ہندو مخالفت کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری دور اور بیسویں صدی کے شروع کے چوتھائی برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اصلاح کی کئی تحریکیں چلیں۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا، جب اپنی اصلاح اور غیر ملکی حکومت

سے نجات پانے کی کوشش کے بجائے اس نے انہیں ایک دوسرے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ انہیں اتنا گمراہ کیا کہ منزل پر پہنچنا تو دور، ساتھ مل کر منزل کی تلاش بھی جاتی رہی، وہ ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے۔ غیر ملکی سامراجی حکمرانوں نے ان گمراہ ہندستانیوں کو اور گمراہ کیا۔ ہندستان کے تاریخی حقائق کو اتنا توڑا مروڑا گیا کہ صحیح جانکاری ناممکن ہوگئی اور غلط فہمیوں کی چادر دونوں فریقوں کے درمیان نفرت کی مضبوط دیوار ثابت ہوگئی۔ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کا طرح طرح سے غلط استعمال کیا گیا، جن کی وجہ سے یہاں کی حالت الجھتی ہی گئی۔

یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ صدیوں ایک ساتھ رہنے کے باوجود آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت ایک دوسرے کے رسم و رواج، شادی بیاہ کے طور طریقے اور کھان پان کے ڈھنگ سے اچھی طرح واقف نہیں۔ سیکڑوں برسوں سے ایک ساتھ رہ رہے لوگوں کو جس طرح گھل مل جانا چاہیے تھا، ویسا ہو نہیں پایا۔ اور ''اس'' نہیں ہونے میں تاریخی وجوہات کا جتنا ہاتھ نہیں رہا، اس سے زیادہ سیاست اور خاص کر اقتدار کی سیاست کرنے والوں کی منصوبہ بند شاطرانہ چال رہی ہے۔ شروع ہی سے انگریز حکمرانوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کو اپنایا اور مختلف معاشرتی طبقوں کے درمیان موجود اختلافات سے مناسب فائدہ اٹھایا۔ انہیں متحد تو ہونے نہیں ہی دیا، ان کے اختلافوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اس پالیسی کی کامیابی میں انہیں اپنے ''استحکام'' کی جڑیں نظر آئیں۔ اس لئے انہوں نے ایسی پالیسی اپنائی جس کی وجہ سے یہ دوری بڑھتی گئی اور جتنی یہ دوری بڑھتی گئی، ہندستان میں ان کا مستقبل اتنا ہی روشن ہوتا چلا گیا۔ ایک منظم منصوبے کے تحت عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت پر سرکار نے خاص دھیان دیا۔ اسکول اور کالج کھولے گئے، تاکہ ان کی تربیت لئے تعلیم یافتہ افراد کا ایک طبقہ تیار ہو، جو ان کے دور رس منصوبوں کی کامیابی کے باربردار بن سکیں۔ سچائیوں کو توڑ مروڑ کر تاریخ کی ایسی کتابیں تیار کرائی گئیں، جس کی وجہ سے نئے تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کی خلیج کافی گہری ہو گئی۔

۱۸۵۷ کی عوامی بغاوت کے بعد کی صورت حال سے انگریز اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مختلف مذہبوں کو ماننے والے ہندستانی سماج میں موجود کمزوریوں اور اختلافوں کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی جڑیں زیادہ گہری نہیں ہیں۔ اورنگ زیب کے

انتقال (۱۷۰۷) کے بعد زوال پذیر مغل سلطنت کا بکھرنا شروع ہو چکا تھا اور نظم و نسق کی حالت تشویشناک حد تک بگڑ گئی تھی۔ کمزور مرکزی سرکار آخری سانسیں لی رہی تھیں اور ہر صوبے میں مرکزی سرکار سے بغاوت اور خودمختاری کی فضا بن چکی تھی۔ سچائی تو یہ تھی کہ دہلی کے آس پاس بھی مغل شہنشاہ کی حکومت نہیں کے برابر ہی تھی۔ لاقانونیت کی حالت تھی۔ اس کے باوجود کہ آئے دن مغل سلطنت کے بکھراؤ کی بُری خبریں ہی سننے میں آ رہی تھیں، لیکن اس مدت میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہب کے نام پر کسی ٹکراؤ کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ طویل مدت تک مسلم حکومت رہنے کے باوجود ان دونوں اہم فرقوں کے درمیان نفرت کی کوئی غیر دوستانہ فضا نہیں بنی تھی اور جب انگریزوں سے بغاوت کا وقت آیا، تو ہندستان کے باغی ہندو راجاؤں اور مسلمان نوابوں نے لڑکھڑاتی مغل سلطنت کے ''شہنشاہ'' بہادر شاہ ظفر کو ہی اپنا قائد بنایا۔ ۱۸۵۷ کی بغاوت کو سختی سے دبا دیا گیا۔ اس سلسلے میں ہندستانیوں پر جو مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے، اس نے انگریزوں کے مہذب قوم ہونے پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا۔ اس بغاوت سے انگریزوں نے ایک اہم سبق لیا، وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار نہیں کھڑی کی جاتی، ہندستان میں ان کی حکومت مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انہوں نے بڑی مستعدی سے لڑانے اور حکومت کرنے کی پالیسی پر دھیان دینا شروع کیا۔

انگریزوں نے شروع سے ہی نپی تلی دوہری پالیسی اپنائی تھی، تاکہ حکومت چلانے میں کوئی دقت نہیں ہو۔ ۱۸۵۷ کی بغاوت کو دبا دئے جانے کے بعد آخری مغل شہنشاہ ملک سے غداری کرنے کے مجرم قرار دے کر رنگون جلاوطن کر دئے گئے۔ بغاوت کے دوران ہی ان کے وارثوں کے کٹے سر انہیں پیش کر کے واضح کر دیا گیا تھا کہ اب ان کا نام لیوا بھی کوئی نہیں رہا اور مغل حکومت ختم ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ان کا قہر مسلمانوں پر ٹوٹا۔ مسلمان نواب، جاگیردار، رئیس اور کھاتے پیتے لوگ ان کے ظلموں کے شکار ہوئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو بے دردی سے پھانسی دے دی گئی۔ ان کی جائداد ضبط کر لی گئی اور ہر وہ ممکن طریقے اپنائے گئے، جن سے ان کی کمر بالکل ٹوٹ جائے اور دوبارہ سر اٹھانے کی ہمت بھی ان کے اندر پیدا نہیں ہو سکے۔ حکومت گئی، نوابی گئی، ریاست ختم ہوئی، مغل دربار سے ملنے والے وظیفے اور تنخواہیں بند ہوئیں، جاگیرداریاں نیلام ہوئیں، یعنی دیکھتے دیکھتے رئیس و امیر بھکاریوں کی قطار میں لا کر کھڑا کر دئے

گئے۔ ادھ مرے مسلمانوں کو حالات کی مار نے سسک سسک کر جینے پر مجبور کر دیا۔ ایک طرف ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کی یہ خستہ حالت بنائی گئی، تو دوسری طرف سرکار نے ہندوؤں کے لئے پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کے دروازے کھول دئے۔ انہیں سرکاری نوکریاں دی گئیں، اعزازات سے نوازا گیا۔ سرکار کی پوری کوشش رہی کہ ان کی مالی اور سماجی حالت ایسی اچھی ہو جائے کہ لٹے پٹے مسلمان رئیس اور امیروں کے دلوں میں ان کے تئیں نفرت پیدا ہو جائے۔ لارڈ الیمبرو نے ڈیوک آف ولنگٹن کو واضح لفظوں میں لکھا تھا: ''ہمیں اس حقیقت سے آنکھ نہیں بند کرنی چاہئے کہ مسلمان عام طور پر ہمارے مخالف ہیں۔ اس لئے ہماری پالیسی ہے کہ ہندوؤں کو اپنا حمایتی بنایا جائے، ان کی دل داری کی جائے۔''[۳۰] اس پالیسی پر پوری مستعدی کے ساتھ کام کیا گیا، جس کا حسب خواہش نتیجہ جلد سامنے آیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوئے حسد نے دھیرے دھیرے ہندوؤں کے تئیں ان کے دلوں میں نفرت کے بیج بو دئے اور ان کی ہندوؤں سے دوری بڑھتی چلی گئی۔ جب مسلمانوں کے درمیان ہندوؤں کے تئیں نفرت کی جڑیں پوری طرح جم گئیں، تب انگریزوں نے دوسرا پانسہ پھینکا۔ مصائب سے گھرے، سسک سسک کر دم توڑ رہے کبھی کے معزز رہے مسلم طبقوں کی پیٹھ تھپتھپانی شروع کی۔ انگریز آقاؤں نے ان کے ساتھ مہربانیاں شروع کیں، ان کے درمیان خطاب والقاب بانٹے۔ بدلتی ہوئی صورت حال کا جو ضروری نتیجہ سامنے آنا چاہئے تھا، وہ ابھر کر سامنے آیا۔ خاص مقام پر فائز بااثر ہندو طبقہ انگریزوں کے رویے سے چونکا اور اس نئی پہل کے تئیں اس کے درمیان منفی ردعمل ہوا۔ اس کے اندر بھی اب مسلمانوں کے تئیں وہی حسد و کینہ ابھرا، جو مسلمانوں کے اندر کبھی اس کے تئیں ابھرا تھا۔ سر جان اسٹریچی نے واضح لفظوں میں کہا تھا: ''ان دو مخالف خیموں کی موجودگی ہمارے سیاسی استحکام کا بہت ہی اہم پہلو ہے۔ مسلمانوں کا بااثر طبقہ ہمارے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہے، جو ہماری طاقت کے لئے ضروری ہے، وہ ہماری کمزوری نہیں۔ یہ تعداد میں کم ضرور ہیں، مگر بااثر اور فعال ہیں۔ سیاسی نظریہ سے ان کی ثقافت ہم سے ملتی جلتی ہے۔'' اسی درمیان ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "The Indian Musalmans" سامنے آئی، جہاں بنگال کے مسلمانوں کی افسوسناک حالت کو اجاگر کرتے خوب آنسو بہائے گئے اور سرکار سے سفارش کی گئی کہ مسلمانوں کی حالت کو ترجیحی بنیاد پر سدھارا جانا چاہئے۔ یعنی انگریزی سرکار نے اپنی جڑوں کو مضبوط بنانے

کے لئے ہندستان کے دو بڑے فرقوں کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرنا ضروری سمجھا، جس کے آگے آپسی رقابت، عدم اعتمادی اور ایک دوسرے کے تئیں شبہات ہی موجود تھے۔

یہ تاریخی سچائی ہے کہ کانگریس پارٹی نے آزادی کی لڑائی میں سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے بینر تلے ملک آزاد ہوا اور گاندھی جی اس تنظیم کے متفقہ قائد رہے۔ ان کی انتھک کوشش رہی کہ کانگریس پارٹی اصولوں پر مبنی ایک ایسی پارٹی بنی رہے، جسے ملک کے ہر طبقہ اور مذہب کے ماننے والوں کا اعتماد حاصل ہو اور وہ تنظیم قومی شعور اور امنگوں کی ''نمائندہ'' سمجھی جائے۔ کانگریس پارٹی اور آزادی کی لڑائی کا گاندھی دور جب شروع ہوا، تو دھیرے دھیرے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ گاندھی جی کسی خاص مٹی کے بنے ''رہنما'' ہیں اور ان کے حوصلے کی منزلیں کچھ اور ہی ہیں۔ اب تک کانگریس چیمبری سیاست کرنے والے بڑے لوگوں، خاص کر وکیل اور بیرسٹروں کی پارٹی تھی۔ اس کے سالانہ اجلاس ہوتے، کچھ تجویز پاس ہوتی، جنہیں سرکار کو بھیج دیا جاتا اور لوگ بے فکر ہو جاتے۔ ان کے سالانہ اجلاسوں یا ہر ایک اجلاس میں منظور تجاویز سے عام لوگوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ کانگریس کے بانی اے۔او۔ ہیوم (A. O Hume, 1829-1912) کے سامنے جس ہندستانی قومی کانگریس کی تنظیم کا نقشہ تھا، وہ سب ہندستانیوں کی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے کسی واضح تصویر کی شکل میں رنگ بھرنے کا نہیں تھا۔ کچھ پڑھے لکھے با اثر اور خاص لوگوں کے اختیار اور فائدوں کی ضمانت اور سرکار سے ان کے اچھے تعلق بنائے رکھنے کے لئے یہ تنظیم بنائی گئی تھی۔ لیکن، جب بات آگے بڑھی، تو اس میں اہم تاریخی باب جڑتے چلے گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ یہ عام ہندستانیوں کے جذبات اور خواہشات کی علامت بن گئی۔ ۱۸۸۵ میں مشکل سے ایک سو لوگ اس تنظیم سے جڑے تھے، لیکن ۱۸۸۶ میں اس کے ممبروں کی تعداد ۴۳۴ اور ۱۸۸۷ میں نمائندوں کی تعداد ۶۰۷ ہو گئی۔[۴] بڑی تیزی کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس کے ممبروں کی تعداد بڑھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے مقاصد اور پروگرام بھی واضح اور وسیع ہوتے چلے گئے۔ وہ اب چند مخصوص لوگوں کی نمائندہ نہیں رہی، اس کے دائرے میں عام ہندستانی اور مکمل ہندستانی سماج آ گیا۔ ایچ۔ این۔ کنجرو نے کانگریس کے پھیلتے دائرے کے بارے میں لکھا کہ کانگریس ایک خاص جماعت یا علاقہ کی ترقی کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے متحرک ہے۔[۵] سریندر ناتھ بنرجی نے اور وضاحت سے

کہا، ہمارے سامنے ایک متحدہ ہندستان ہے، جو ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی اور سکھوں پر مشتمل ہے۔ ہمارا پلیٹ فارم اجتماعی ہے۔ یہاں ہم نے اپنے اختلافات کو ختم کرنے کا عہد کیا ہے۔ ہم ایک ہی سرکار، سیاسی عقیدہ اور حکومت کے ماتحت ہیں۔ ہمارے اختیار اور شکایتیں بھی ایک جیسی ہیں۔[6]

سماجی اور سیاسی مسئلوں کو لے کر ہندستان میں متعدد تحریکیں چلیں۔ ان میں کانگریس کے ذریعہ چلائی گئی تحریک ایک مقبول عام وسیع تحریک رہی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ وہ یہاں کے ہر طبقہ اور اس کے سوچ، ہر علاقہ کے لوگوں کے جذبات کی نمائندگی کر سکے۔ اس کوشش میں بڑی حد تک اسے کامیابی بھی ملی۔ لیکن یہ سچائی بھی اپنی جگہ بہت دلچسپ ہے کہ ۱۸۸۶ کے دوسرے کانگریس اجلاس کے بعد سے ہی اس تنظیم کے مقاصد اور کاموں کو چیلنجوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اسی پلیٹ فارم سے آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحانات اور شمالی ہندستان میں بنگالیوں کے بڑھتے دبدبے کی مخالفت میں سوال اٹھائے گئے۔ کچھ ہندو احیا پرست عناصر کے ذریعہ کانگریس پر حاوی ہونے کی کوشش بھی ہوئی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان مقبولیت حاصل کرنے میں کانگریس کو بڑی دشواری ہوئی۔ ایک طرف کانگریس بحیثیت ایک تنظیم کوشاں رہی کہ اس کا حلقہ وسیع ہو اور وہ کسی خاص مذہبی یا علاقائی سوچ رکھنے والوں کی نمائندہ نہ بنے، تو دوسری طرف بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال، مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے جیسے اہم نیتاؤں نے قومیت کو مذہب کا لبادا اوڑھے ''ہندتو'' سے اسے جوڑنا چاہا، جس کی وجہ سے غیر ہندوؤں کے درمیان اس کے تئیں شبہات پیدا ہوئے۔ تلک اور ان کے مہاراشٹر کے معاونوں نے سیاسی مقاصد سے سماج میں اپنی گرفت مضبوط بنانے کے لئے مسلم مغل حکمرانوں سے برسر پیکار رہے شیوا جی کو ''ہندوؤں'' کے پیش رو قائد کی شکل میں پیش کیا۔ بات یہیں پر نہیں رکتی، کانگریس کے پلیٹ فارم سے گائے کے تحفظ کی تجویز منظور کی گئی۔ کانگریس اور تحفظ گائے کمیٹی کے مشترک اجلاس منعقد ہوئے۔ کانگریس کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے وائسرائے لینڈس ڈاؤن نے کانگریس پارٹی کو شدت پسند ہندوؤں اور عام ہندوؤں سے رابطہ قائم کرنے والی کڑی مانا۔ اس لئے شروع سے ہی کچھ ہندو احیا پرستوں کی سرگرمیوں کے سبب مسلمانوں کے دانشور طبقہ نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا اور اس سے الگ رہنے کی اپنی کوششوں کو نہ صرف جائز مانا، بلکہ

اس کے مقابلے میں ایک مناسب بدل کی تلاش انہیں ہمیشہ رہی۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنے ابتدائی دنوں میں کانگریس کے رہنماؤں نے اپنے بڑے بڑے دعووں کے مدنظر اپنی اندرونی کمزوریوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا، اس لئے انگریزوں نے اور خود ہندستانی مخالفوں نے آگے چل کر اس تنظیم کے لئے دشواریاں پیدا کیں۔ سب کی نمائندگی کا دعوی کرنے والی کانگریس اختلاف رائے کے سبب غیر متنازع نہیں رہ سکی۔

ہندستان میں غلام خاندان (۱۲۰۶۔۱۲۹۰) کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ہی یہ واضح ہو گیا تھا کہ اب مسلمانوں نے اپنی قسمت ہندستان کی سرزمین سے جوڑ دینا طے کر لیا ہے۔ سیکڑوں برسوں کی ان کی حکومت اور اس کی ہمہ جہتی حصولیابیاں ثابت کرتی ہیں کہ مسلمانوں نے ہندستان کو ترقی یافتہ بنانے اور ایک ہمہ جہتی انفراسٹکچر کے اعتبار سے ہندستان کو مضبوط بنانے میں کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک کے عہد حکومت کو (۱۲۰۶۔۱۸۵۷) اگر غیر جانب دارانہ انداز سے دیکھا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں نے ہندستان کو اپنا مادر وطن مانا۔ اپنی مہارت اور صلاحیت کا استعمال ہندستانی سماج کے ہر میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک پر کشش رنگ بھرنے میں کیا اور اپنے مادر وطن کو جنت نشاں ہی نہیں سونے کی چڑیا بھی بنایا۔ مسلمان یکایک فاتح کی حیثیت میں یہاں نہیں آئے تھے۔ عربوں اور عرب ملکوں سے ہندستان کا گہرا تجارتی اور ثقافتی تعلق بہت پرانا ہے۔ ملک کافور کے جنوبی ہندستان میں پہنچنے سے بہت پہلے مسلمان تاجر یہاں آباد ہو چکے تھے۔ مقامی راجاؤں نے انہیں مسجدیں بنانے کی اجازت دے دی تھی اور مقامی لوگوں وہ میں گھل مل چکے تھے اور یہی میل جول نے Ravettans & Labbese فرقوں کو جنم دیا۔ ان کی اپنی کامیاب تجارتی سوجھ بوجھ، مقامی فلاحی کاموں کے تئیں مستعدی کے سبب انہیں سیاسی تحفظ اور سماجی وقار بھی حاصل ہوا تھا۔ مارکو پولو نے راجا سندر پانڈیان کے ایک با اثر مسلمان وزیر تقی الدین کا ذکر اپنی خود نوشت یادداشت میں کیا ہے۔ اس کے لڑکے سراج الدین اور پوتے نظام الدین کو بھی وہی عزت راج دربار میں حاصل تھی۔ قبلئی خان (۱۲۸۶) کے دربار میں پانڈیان راجا کا جو سفیر گیا تھا، وہ مسلمان فخر الدین احمد نامی آدمی تھا۔ ملک کافور کی فوج کا راجا ویر بلال کی فوج سے گھمسان جنگ ہوئی تھی، جس میں بیس ہزار فوجی مسلمان تھے۔[۷] اس لئے جب مسلمان فاتح کر بن ہندستان آئے، تو

یہاں کے ماحول میں گھل مل جانے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ روادار ہندو فلسفہ پر مبنی ہندوؤں نے مذہب کی بنیاد پر ان کی کبھی مخالفت نہیں کی، فراخ دلی سے انہیں قبول کیا۔ یہاں کی سماجی زندگی کو دونوں نے مل کر اور پرکشش بنایا اور مقامی لوگوں کے میل جول سے ایک نئی گنگا جمنی تہذیب کو جنم دیا۔ ہندی کے مشہور شاعر و ادیب رام دھاری سنگھ دنکر کہتے ہیں: ''جب اسلام آیا، اسے اس ملک میں پھیلنے میں دیر نہیں لگی۔ تلوار کے ڈر یا عہدہ کے لالچ سے بہت تھوڑے ہی لوگ مسلمان ہوئے، زیادہ تو ایسے ہی تھے، جنہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔ بنگال، کشمیر، پنجاب میں گاؤں کے گاؤں ایک ساتھ مسلمان ہو گئے۔ [۸]

یہاں ایک تاریخی حقیقت دھیان میں رکھنی چاہئے کہ دوسرے حملہ آور اور ہندستان کو وطن بنانے والی دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں نے یہاں کے سماجی نظام کو قبول کیا، لیکن اس میں اپنے کو پوری طرح تحلیل نہیں کیا، اپنی پہچان کو باقی رکھا۔ آریوں سے لے کر افغانوں کے آنے تک ہون، شک، سیتھین، کشان وغیرہ کئی گروپ فاتح کی شکل میں ہندستان آئے اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ یہاں کے مقامی رنگ میں پوری طرح رچ بس گئے۔ ان کی اپنی شناخت باقی نہیں رہی۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے یہاں شادی بیاہ کئے، رسم و رواج کو اپنایا، کھان پان اپنائے، لیکن اپنی الگ پہچان بنائے رکھی۔ تحریک آزادی کے دوران کانگریس کے رہنماؤں کے شعور میں بھی یہ سچائی موجود رہی اور شروع سے ہی اس بات کا ہر ممکن خیال رکھا گیا کہ مسلمانوں کی اندیکھی نہیں ہو۔ کانگریس نے اپنے ہر ایک فیصلے میں مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اس وقت کی مسلم تنظیموں سے اسے پورا تعاون ملا۔ سریندر ناتھ بنرجی نے کلکتہ کے سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن، جس کے قائد جسٹس امیر علی تھے، سے مدد لی۔ لکھنؤ اور الہ آباد کے بزرگ مسلم رہنماؤں سے بھی مدد لینے کی پوری کوشش رہی، تاکہ اس ملک گیر تحریک میں ملک کی دوسری سب سے بڑی مذہبی اکائی حصہ دار بنے۔ کسی غلط فہمی کی بنیاد پر کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اس کا پورا دھیان رکھا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے وقار اور آپسی خیر خواہی کے مدنظر ایک مضبوط پالیسی کانگریس نے تیار کی تھی۔ اسی کی روشنی میں امیر علی، سید احمد خان، عبداللطیف، بدرالدین طیب جی جیسے معزز مسلم دانشوروں کی حمایت پانے کی کوشش ہوئی۔ کانگریس کے شروع کے دنوں میں مسلمانوں نے پورا اخلاقی اور مالی تعاون اسے دیا بھی۔ شروع

میں ہی میر ہمایوں جاہ نے کانگریس کو پانچ ہزار روپے بطور عطیہ دیا تھا اور علی محمد بھیم نام کے بمبئی کے ایک بڑے تاجر نے کانگریس کے مقاصد کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے بہت سی جگہوں کا دورہ کیا۔ علی گڑھ کے لطف اللہ اور مظفر نگر کے ملا محمد مراد نے ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے کے فتوے بھی جاری کئے تھے۔

حواشی

۱۔ جی۔ ڈی۔ کھوسلا، دی مرڈر آف مہاتما، شیٹو اینڈ ونڈس، لندن، ۱۹۶۳، ص ۲۳۸۔۲۴۰۔ گوپال گوڈسے، گاندھی ودھیہ کیوں، دی آستا پرکاشن، پونا، ۱۹۷۲، ص ۶۲۔۷۲۔

۲۔ گاندھی کے سکریٹری، پیارے لال نے اپنی کتاب ''دی لاسٹ فیز'' حصہ ۲، ص ۱۹۷ میں پوری تفصیل دی ہے۔

۳۔ ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ، ماڈرن اسلام ان انڈیا، وکٹر کولنس، لندن، ۱۹۴۶، ص ۱۹۰۔

۴۔ مشیر الحسن، نیشلزم اینڈ کمیونل پالیٹکس ان انڈیا، منوہر پبلیکیشن، نئی دلی، ۱۹۷۹، ۱۹ بحوالہ ''ٹریبون'' الہ آباد، ۲۳ر جنوری ۱۸۸۹۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۶۔ اسپیچیز اینڈ رائٹنگس آف سریندر ناتھ بنرجی، ص ۲۶۵، بحوالہ مشیر الحسن، ص ۳۰۔

۷۔ اشوک مہتا اور اچوت پٹوردھن، دی کمیونل ٹرینگل ان انڈیا، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۴۲، ص ۱۱،۱۲۔

۸۔ رام دھاری سنگھ دنکر، سنسکرتی کے چار ادھیائے، راجپال اینڈ سنس، دلی، ۱۹۵۶، ص ۲۰۷۔

ہندو اور مسلمان: رشتوں کے تانے بانے......

ساتھ ساتھ رہنے کی جتنی لمبی تاریخ ہوگی، آپسی اختلافات کی فہرست کے طویل ہونے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ہے ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا۔ آج یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کے اسباب میں صرف مذہب کبھی نہیں رہا ہے۔ لیکن اپنی فرقہ واریت کو چھپانے کے لئے مذہب کا نام ضرور لیا جاتا رہا ہے۔ سیکڑوں برسوں کی ہندستانی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ ڈاکٹر رام گوپال نے اپنی کتاب "Indian Musalmans" میں بڑی سنجیدگی سے ہندستان کے اس پیچیدہ سوال پر روشنی ڈالی ہے اور جواہر لال نہرو اس مسئلہ پر لکھتے ہیں: ''ور حقیقی فرقہ واریت ہے اور سیاسی ردعمل نقلی۔''[1] اس نظریہ کی تصدیق ڈبلیو۔سی۔ اسمتھ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: ''فرقہ داریت مالی، نفسیاتی، مذہبی وغیرہ متعدد الجھے ہوئے مسائل کے سبب ہیں۔ ان میں کون سب سے زیادہ اہم ہے، کا مطلب یہ ہے کہ کس کو آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔''[2] ہمارے اپنے تجربے بتلاتے ہیں کہ مذہب آدمی کا ایک ایسا حساس پہلو ہے، جسے بڑی آسانی سے مشتعل کیا جا سکتا ہے اور عوام کے مشتعل جذبات کو مذہبی جنون کی حد تک پہنچا دینا اکثر بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ہندستان کی سیاسی تاریخ کے نشیب و فراز کے مطالعہ سے بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں فرقہ واریت کے الجھے سوال کو دیکھنا مناسب ہوگا اور تب ہی ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک مغربی دانشور کا یہ نظریہ کافی اہمیت کا حامل ہے: ''وہ لوگ جنہوں نے پاکستان کے لئے جدو جہد کیا، ان کا پس منظر مذہبی اور شرعی قوانین کا نہیں تھا۔ وہ سیاسی تھے اور مغربی قانون دانی ان کا میدان تھا، دیوبند کی جگہ کیمبرج اور انس آف کورٹ کے وہ پیداوار تھے۔ مسٹر جناح اور ان کے دایاں ہاتھ مانے جانے والے لیاقت علی خان نے پاکستان بنوایا تھا۔ یہ

لوگ مذہبی نہیں کہے جا سکتے۔ انہوں نے سیاسی جدوجہد کی اور مذہب کے نام پر ایک حکومت قائم کی۔"۳

ہندستانی سماج کے الجھے تانے بانے اور پیچیدہ سیاست کی نبض پر گرفت رکھنے والے مشہور سماجوادی مفکر مجاہد آزادی جے پرکاش نارائن نے ۱۹۴۴ء میں اس مسئلہ پر بڑی گہرائی سے روشنی ڈالی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

"اکثر یہ سننے میں آتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے مذہب ہی سب کچھ ہے، مگر مجھے اس میں یقین نہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی، تو مسلمانوں پر علما اور ان کے فتووں کا اثر ہونا چاہئے تھا نہ کہ سیاست دانوں اور خان بہادروں کا۔ یہ تعجب خیز حقیقت ہے کہ علما ہمیشہ نیشلسٹ رہے، مگر عام لوگوں نے مسلم لیگ کا ہی ساتھ دیا۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مسٹر جناح میں مولانا مدنی بلا شبہ اسلام کے صحیح نمائندہ کہے جا سکتے ہیں، لیکن قائد اعظم مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے نمائندہ کہلائے، مولانا نہیں۔ میرے خیال میں ہندستان کی سیاست مکمل طور سے متوسط طبقے کی سیاست ہے، دوسروں کی طرح ہی مسلم متوسط طبقہ کے سامنے بھی مذہب سے زیادہ نوکریاں، اقتدار، سہولت اور پہنچ کا سوال ہے اور ان میدانوں میں علماء کا اثر نہیں۔ عام مسلمان مذہبی ہیں لیکن وہاں تک علماء پہنچتے نہیں۔ سیاست کے میدان میں بھی متوسط طبقہ کا ہی دبدبہ ہے، وہ عوام کی رائے کو متاثر کرتے ہیں۔ علماء غریب ہیں اور نواب زادے امیر، علماء انگریزی کے جانکار نہیں، نائٹس (Knights) جانکار ہیں۔ علماء انگریزی کے مخالف رہے ہیں، وہ وائسرائے کونسل کے ممبر نہیں ہو سکتے، اعلی عہدوں کے خواہاں نہیں ہو سکتے ہیں۔ علما سیاسی کھیل کے ماہر نہیں، جب کہ سیاست داں وکیلوں کی یہی پونجی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ مسلمانوں کے لئے روٹی کے علاوہ مذہب سب کچھ نہیں، تو بھی بہت کچھ ہوتے ہوئے علماء ان کے قائد نہیں بن سکے۔ ان کے رہنما تو وہ چالاک متوسط طبقہ کے لوگ

ہوئے، جن کے لئے مذہب نے ایک اوپری لبادہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھا۔"[۴۰]

ہندستان کی سیاست اور یہاں کی فرقہ واریت کو پوری طرح مذہب سے جوڑنا مناسب ہی نہیں، بلکہ غیر منطقی بھی لگتا ہے۔ پاکستان کا حصہ رہے موجودہ بنگلہ دیش میں مسلم پاکستانی فوجیوں کے ذریعہ کیے گئے ظالمانہ برتاؤ، خون خرابہ کی کوکھ سے پیدا ہوئے بنگلہ دیش، اس کے بعد بنگلہ دیش میں غیر بنگالی، جو عام طور سے بہاری مسلمان کہلاتے ہیں، کے ساتھ کیے گئے بنگالی مسلمانوں کے وحشیانہ سلوک، اس حقیقت کو کیا واضح نہیں کرتے کہ مذہب اور مذہبی تنگ نظری ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کے اختلافات کی واحد وجہ نہیں؟ آپسی تضاد اور اختلافات کی جڑیں ہمیں تاریخ اور موجودہ سماجی، سیاسی اور معاشی کش مکش کے پس منظر میں تلاش کرنی ہوگی۔

تاریخ انسانی کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مختلف دور میں ماضی کے اختلافات اور بقا کی آپسی کھینچا تانی کی دبی دبی یادیں موجودہ دور کی کش مکش اور زندگی کی بھاگ دوڑ کے الجھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستوں میں زندہ ہو جاتی ہیں اور طرح طرح کے شبہات اور مسائل پیدا کر دیتی ہیں۔ ہندستان کے ہندو مسلم رشتوں کی الجھنوں کو اس نظریے سے بھی دیکھنا ہوگا تاکہ کوئی واضح رائے بنانے یا مسئلہ کے حل کی تلاش میں کچھ مثبت پہل ممکن ہو سکے۔ ہندستان میں صدیوں تک چلی مسلمانوں کی حکومت کی یادیں، مقامی ہندوؤں کی اپنی تاریخ اور قابل فخر روایت، انگریزوں کا آنا اور ان کی حکومت کا قائم ہونا، پھر اس حکومت کے استحکام کے لئے اپنائی گئی ان کی خطرناک دوہری پالیسی، سب نے مل کر ایک ایسی صورت حال کو جنم دیا، جہاں سارے مسائل ایک دوسرے میں اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ ایک دوسرے کو الگ کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔ یہاں اگر سماجی نظریہ سے اس مسئلہ کو دیکھتے ہیں، تو سماج کی پیچیدہ بناوٹ کے باوجود لوگوں کے آپسی مضبوط تعلقات کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور جب اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش ہوتی ہے، تو دو تہذیبوں کی آپسی کش مکش اور ٹکراؤ سامنے آتا ہے۔ معاشی تنگ و دو کے ٹکراؤ سے پیدا صورت حال اور اقتدار اور اس میں مناسب حصہ داری کے سوال سے پیدا ہونے والی الجھنوں کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور، جب ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کسی نتیجہ

پر پہنچنے کی کوشش کی جائے گی، تو ایک نیا پہلو سامنے آئے گا کہ مختلف زمانے میں انہیں صورت حالوں میں الجھنوں کی شکل ایک جیسی نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں کا ہندستان سے ابتدائی رشتہ تجارتی رہا۔ پھر حملہ آور کی شکل میں عرب سندھ تک آئے، آگے نہیں بڑھے۔ دوسرا دور لوٹ کھسوٹ اور جنگ کے بعد ہاتھ لگے مال و دولت کا آیا، لیکن جب فاتح بن کر یہاں آئے اور اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی، یہیں کے ہو رہنے کا طے کیا، تو دوسری اور الگ صورت حال پیدا ہوئی۔ یہاں کی ہندو اکثریت اور مقامی راجاؤں کو اپنے شاندار ماضی کا گہرا احساس رہا ہو یا نہیں رہا ہو، لیکن اپنی روایت، اپنا دھرم اور اپنا وطن، یہ احساس تو ضرور رہا ہوگا۔[۵] اور جب باہر سے آئے مسلمانوں نے یہاں کے متعدد علاقوں کو زور زبردستی سے اپنے ماتحت لایا ہوگا، تو ان کے دلوں میں ان کے تئیں نفرت پیدا ہوئی ہوگی۔ خودسپردگی کے کچوٹتے زخم اور اپنی کمزوریوں کے احساس سے لوگوں کی خودداری کو چوٹ بھی ضرور پہنچی ہوگی۔ لیکن مسلمانوں کی فوجی برتری اور شاہی دبدبہ کے آگے انہوں نے خود کو مجبور پایا ہوگا اور حالات سے سمجھوتا کیا ہوگا، مگر ان کے دل سے نفرت، حسد اور انتقام کا جذبہ مرا نہیں ہوگا۔ اسی وقت متعدد مسلم صوفیائے کرام یہاں آئے۔ ان صوفیوں نے اپنے ساتھ مساوات، محبت اور تحمل کے اصولوں پر مبنی اسلام لایا تھا۔ ان کے جذبہ خدمت اور خلوص کے قائل مقامی لوگوں نے اسلامی اصولوں کو اپنایا۔ اسلام اور اس کے انصاف اور بھائی چارہ کے اصولوں پر مبنی امن اور انسان دوستی کے پیغام کا تعمیری اثر ہوا۔ نتیجتاً بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس پہل کا اچھا نتیجہ سامنے آیا۔ مقامی لوگوں کی مخالفت میں وہ زور باقی نہیں رہا۔ مذہبی تعلق قائم ہو جانے کے بعد لوگوں کے سوچنے کا انداز بدلا اور بڑی تعداد میں لوگ نئی حکومت کے حمایتی بن گئے۔[۶]

یہاں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ جاگیردارانہ فیوڈل دور تھا اور وہ فیوڈل دور وہ دور نہیں تھا، جو آج ہم مغربی مفکروں کے نظریات کے مطابق سمجھتے ہیں۔ عوام اور حکمراں طبقہ کا آپسی تعلق نہیں کے برابر تھا۔ حکمرانوں کا عوام سے کوئی براہ راست واسطہ تھا ہی نہیں۔ عوام اور حکمرانوں کے درمیان نظم و نسق کی کئی سیڑھیاں تھیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکمراں طبقہ اپنی رعایا سے پوری طرح کٹا ہوا تھا۔ درمیان کے کارکن ہی کام کرنے والے ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ہندستانی حکمراں ہوں یا غیر ملکی انتظامیہ،

عوام کے طرز زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ مقامی انتظامیہ وہی رہی اور کوئی براہ راست نمایاں فرق نہیں پڑا۔ صوفیوں کی خانقاہوں کے دروازے عوام کے لئے ہمیشہ کھلے رہے اور سماج پر عقیدت بھرا ان کا دبدبہ قائم تھا۔ فی الوقت امیروں اور بادشاہوں نے بھی ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یعنی خانقاہیں ایسے مراکز تھے، جہاں بادشاہ اور رعایا دونوں یکساں عقیدت سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے آپسی رشتوں کے بہتر ہونے میں بہت مدد ملی۔ حکومت کی جانب سے ملنے والی سہولتیں اور اعزاز، خطاب والقاب کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتوں نے مقامی لوگوں کے زخموں پر مرہم لگانے کا کام کیا اور ایک نئی فضا بنی۔ مغل دور میں یہ رشتے اور بھی مضبوط ہوئے۔ حکمراں طبقہ اور اس کے ماتحت رئیسوں اور سرداروں کے درمیان بڑی تعداد میں شادی بیاہ کے رشتوں نے بالکل نیا ماحول پیدا کردیا۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت بنی رہی کہ ''ہندو ہندو'' ہیں اور ''مسلمان مسلمان''۔ چاہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے رشتوں میں تلخی نہیں رہی ہو، لیکن ان کے شعور میں کہیں نہ کہیں ''الگ الگ'' ہونے کی بات بیٹھی رہی ہوگی۔ اسی درمیان انگریز یہاں آتے ہیں اور اپنے قدم جمانے کی کوشش میں ہر وہ ممکن اوچھے ہتھیار استعمال کرتے ہیں، جو باہر سے آئے فاتح حکمرانوں کو یہاں اپنی حالت کو مستحکم کرنے کے لئے کرنا چاہئے۔ ان کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پڑی لطیف سی مذہبی اور سماجی تفریق کی لکیر کو خوب ابھار کر سامنے لانا بہت آسان اور فائدہ مند رہا۔

کوئی سماج نہ ویکیوم میں پنپتا اور ترقی پذیر ہوتا ہے اور نہ ہی اپنے اردگرد کے واقعات کے اثر سے اچھوتا رہتا ہے۔ یہی سچائی ہندستان کی بھی رہی ہے۔ ہندستان کا جب یورپ سے تعلق قائم ہوا، تو یورپ میں چل رہی نشأۃ ثانیہ کی لہروں کا اثر یہاں بھی محسوس کیا جانے لگا۔ انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں نوآبادیات کا جنم ہو چکا تھا اور بازار کی تلاش میں نکلے انگریزوں کی، مقامی سیاسی مسائل میں مداخلت بھی ہونے لگی تھی۔ انگریزوں کے جب یہاں قدم جم گئے تب صنعتی انقلاب کی مثبت حصولیابیوں سے زیادہ اس کی بُرائیاں یہاں کے حصے میں آئیں۔ انگریزوں نے اپنی حالت کو مستحکم بنانے کے لئے مقامی لوگوں کی حمایت حاصل کرنے پر دھیان دیا۔ اسی سلسلے میں کلرک پیدا کرنے کی پالیسی کے تحت انگریزی تعلیم کی تشہیر واشاعت

شروع کی۔ اس ضمن میں اپنی روایتی تعلیم کے علاوہ مغربی تعلیم کے مشہور مراکز تک ہندستانیوں کی پہنچ ممکن ہوئی، خیالات کے تبادلے کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندستان میں بھی نشاۃ ثانیہ کی لہریں اٹھیں۔ اس مدت میں انگریزوں کے علاوہ دوسرے یوروپی ملکوں سے بھی ہندستان کا رابطہ قائم ہوا اور وہاں سے دانشوروں کی آمد ورفت شروع ہوئی اور ان کی کوششوں سے ہندستان کے پرکشش ماضی کے صفحات پر جمی دھول کی تہیں جھڑیں اور دھیرے دھیرے ہڑپا، موہن جوداڑو، اجنتا اور ایلورا کی شاندار تاریخی حصولیابیاں سامنے آئیں۔ تعلیم یافتہ ہندستانیوں نے اپنی قدیم تہذیب اور ثقافتی اثاثوں کی تلاش پر بڑے لگن اور سنجیدگی سے کام کرنا شروع کیا۔ انگریزوں نے ان کو پورا تعاون دیا، کیونکہ اس نشاۃ ثانیہ کی اٹھی لہر کا فوری نتیجہ ان کے فائدے میں ہی جانے والا تھا۔ یعنی ہندستانیوں کے ماضی کی تلاش ہندوؤں کی ترقی یافتہ ثقافت کی ہی تلاش تھی اور اس ماضی کی ترقی میں مسلمانوں کا کوئی رول نہیں رہا۔ ہندستانی نشاۃ ثانیہ نے ہندوؤں کے اندر فطری طور پر فخر کے جذبے کو ابھارا۔ انگریز حکمرانوں نے اس ذہنیت کو حوصلہ دیا اور ہمیشہ کوشش کی کہ ہندوؤں کے اندر یہ جذبہ ابھرے اور مسلمانوں کے تئیں ان کا رویہ تلخ ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آپسی اختلاف کے جذبات کی جڑوں کو خوب سینچا گیا اور کمال یہ کہ اسے ظاہر بھی نہیں ہونے دیا۔ وہ دونوں کے ہی خیر خواہ بنے رہے اور اس سازش کا آگے چل کر بڑا خراب نتیجہ دیکھنے کو ملا۔ پڑھے لکھے ہندوؤں کے درمیان اپنی رنگا رنگ ثقافتی روایت پر فخر کرنے والوں کی بڑی تعداد سامنے آئی، جس نے ہندستان میں مسلمانوں کے آنے اور ان کی حکومت کو ہندستانی ثقافت اور تہذیب کے لئے نقصان دہ ماننے کی ذہنیت کو مضبوط کیا۔ انگریزوں کی حمایت پائے متعصب فرقہ پرست عناصر نے مسلمانوں کے طویل عہد حکومت میں جو کچھ ہندستان کو بنانے اور سجانے کے کام ہوئے یا گنگا جمنی ثقافت کی جو مضبوط بنیاد ڈالی تھی، اسے نہ صرف ہندستان کی تاریخ کا سیاہ باب مانا، بلکہ اس کی معنویت اور ثقافت کے تسلسل کی دائمیت کی کڑی ہونے سے بھی انکار کیا۔ انگریزوں کی خطرناک ڈپلومیسی کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی کش مکش کا سلسلہ چلتا رہا، لیکن کھل کر دشمنی کی شکل میں وہ کبھی ابھرا نہیں، معاملہ سماج کے اونچے طبقہ تک ہی محدود رہا۔ بعد کے دنوں میں ایک سجھی بوجھی پالیسی کے تحت انگریز سامراجیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات سے خوب فائدہ اٹھایا۔

ہندستان میں نشأۃ ثانیہ کی اٹھی لہروں کے اثر سے مسلمان بھی اچھوتے نہیں رہے، لیکن یہاں اس کی نوعیت کچھ الگ رہی۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد لگ بھگ سبھی صوبوں نے خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ درّانی اور احمد شاہ ابدالی کے لگاتار حملوں کے سبب دلّی کی کمزور حکومت لڑکھڑائی ہوئی تھی۔ دلّی اور اس کے آس پاس مرہٹوں کے حملوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اور کبھی سکھ، تو کبھی جاٹ دلّی پر آفت کی طرح چڑھ دوڑتے۔ پنڈاریوں کے خرافاتی طوفان بھی نہیں تھم رہے تھے۔ ایسی افراتفری کی حالت میں بھی مذہب کی بنیاد پر ہندو اور مسلمانوں کے اختلاف کا سوال کبھی نہیں اٹھا۔ مغل سلطنت کے بڑے حصے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلے گئے، لیکن مسلمانوں نے اسے مقامی مسئلہ ہی مانا، اسے ہندوؤں کے ہاتھ اپنی ہار نہیں سمجھی، اس کی وجہ سے عام ہندوؤں کے لئے ان کے دلوں میں کبھی نفرت یا دوری کا تلخ جذبہ نہیں پیدا ہوا۔ لیکن جب انگریزوں نے ان پر (مسلمان) اپنا سیاسی دبدبہ قائم کر لیا، تو مسلمانوں نے اسے انگریزوں کے ہاتھوں اپنی شکست مانی، ان کی حکومت انگریزوں نے چھینی، یہ بات ان کے دلوں میں بیٹھ گئی، اس لئے انگریزوں کے خلاف ان کے دلوں میں غیض و غضب اور نفرت کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا انگریزوں کے ذریعہ اٹھائے گئے ہر قدم کو انہوں نے اپنے لئے سازش ہی سمجھا، یہاں تک کہ انگریزی تعلیم کی بھی سخت مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی انقلاب کی برکتوں کی شکل میں جو سماجی، معاشی اور ثقافتی تبدیلی ہوئی، مسلمانوں نے نہ صرف اسے اپنانے سے انکار کیا، بلکہ اس کی شدید مخالفت کی۔ انگریزوں نے بھی شروع میں مسلمانوں کے جذبات پر گہری چوٹ پہنچائی، معاشی طور پر انہیں مجبور بنا کر چھوڑ دیا۔ نوابوں، امیروں، جاگیرداروں اور رئیسوں کو حکومت کی کرسیوں سے ہٹا کر پھانسی کے تختے پر پہنچایا، ہر قدم پر انہیں ذلیل کیا۔ ذہنی طور سے پہنچائے گئے ان تکلیف دہ زخموں نے مسلمانوں کو پست ہمت اور مجبور بنا کر رکھ دیا۔ ایک طرف ہندوؤں کے درمیان نشأۃ ثانیہ کے نتیجے میں فخریہ جذبہ کا جوش اور انگریز حکمرانوں کا تحفظ حاصل تھا، تو دوسری طرف مسلمانوں کے لئے زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ بدحواسی کے عالم میں انہیں نہ تو اپنی بہادری یاد آ رہی تھی اور نہ اپنی شاندار کارگزاریاں اور صلاحیت، نہ اپنے فن تعمیر اور شان و شوکت کے گواہ دلّی، آگرہ، مرشد آباد، لاہور، حیدر آباد، جون پور، احمد آباد، لکھنؤ اور ہندستان کے دوسرے علاقوں میں پھیلے ہزاروں بے مثال کارنامے۔

ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ موجود تو تھا ہی، ان کے مداح اور کل کے مسلمانوں کے ماتحت رہے ہندوؤں کے تئیں بھی غصہ، نفرت اور حسد کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔ لیکن انگریزی انتظامیہ کی موجودگی میں اسے ظاہر کرنے کی حالت میں وہ نہیں تھے، اس لئے اپنے آپ میں یہ بھی اندر اندر کڑھتے اور سلگتے رہے اور جب موقع ملا اپنی اپنی جگہوں پر سلگنے والے یہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بھڑ پڑے۔ ماضی کے شکوہ و شکایت نے موجودہ ماحول کو پراگندہ کر دیا اور انگریز سامراجوادی عناصر نے اسی ذہنیت کو بڑھاوا دیا، زور دیا۔

ہندستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی کوئی ایک وجہ نہیں رہی۔ کبھی مذہب نے براہ راست رول ادا کیا، تو کبھی معاشی بھاگ دوڑ، سیاسی دبدبہ اور حکومت اور اقتدار میں حصہ داری کی کھینچا تانی نے۔ کچھ مفکروں نے اس مسئلہ کی جڑیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ''جدیدیت'' کے رجحانات کو نہیں اپنانا مانا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے درمیان شدت پسند جاگیردارانہ رجحان کی جڑیں زیادہ گہری ہونے کے سبب ''جدیدیت'' کی حصولیابیوں سے وہ زیادہ دنوں تک محروم رہے اور انگریزی حکومتوں کی برکتوں کو انہوں نے بہت دیر سے سمجھا۔[۷] جواہر لال نہرو بھی اسی نظریہ کو مانتے تھے۔ اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے مڈل کلاس کے درمیان ایک نسل یا اس سے زیادہ کا فرق رہا ہے اور یہ فرق آج بھی سیاسی، معاشی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں موجود ہے۔ اس فرق اور پچھڑے پن نے مسلمانوں کے درمیان احساس کم تری اور خوف کی ذہنیت پیدا کر دی تھی۔''[۸]

جواہر لال نہرو نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس تنازع کو مڈل کلاس کا مسئلہ مانا اور واضح لفظوں میں کہا کہ ایک فرقہ کی معاشی اور سیاسی بہتری کے لئے ہم مذہبوں کے جذبات کو استعمال کیا گیا۔ اس نظریہ کو رجنی پام دت نے اور واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''کٹر فرقہ وارانہ سوچ کے پیچھے سماجی اور معاشی سوال ہے۔ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے فرقہ پرست لوگوں کی اپنی پوزیشن اور حکومت حاصل کرنے کی برابر کوشش سے یہ واضح ہو جاتا ہے، اس کا فوری اثر عام لوگوں

پر پڑنا بھی ضروری اور فطری ہے۔ بنگال اور پنجاب کے ہندو زمیندار اور مہاجن ہیں۔ ان کا تجارتی اور سودی لین دین کا کاروبار ہے۔ مسلمان اکثر و بیشتر غریب کسان ہیں اور سود کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ جہاں مسلمان زمیندار ہیں، وہاں ہندو غریب کسان ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بار بار کا ٹکراؤ حقیقت میں مسلم کسانوں میں ہندو زمینداروں کے خلاف ناراضگی کا ہونا اور مسلم قرض داروں کا ہندو مہاجنوں کے خلاف غصے کا اظہار ہے۔"[9]

اس متوسط طبقاتی تھیوری پر زور ڈالتے ہوئے اے۔ آر۔ دیسائی واضح کرتے ہیں:

"مسلمانوں کے درمیان جدید انداز لئے مسلم دانشور متوسط طبقہ، ہندوؤں کے درمیان ابھرے متوسط طبقہ کے مقابلے میں دیر سے ابھرا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی حیثیت والے ہندوؤں کو سرکاری نوکریوں، صنعت و تجارت میں کافی جما ہوا پایا۔ اس لئے اس نوکری، صنعت اور تجارتوں میں اپنے کو مستحکم کرنے کی دوڑ میں عام مسلمانوں کی حمایت اور مدد حاصل کرنا ان کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ لہٰذا اپنے طبقے کی کوششوں اور مقابلہ آرائیوں کو فرقہ پرستی کا غلط رنگ دے دیا گیا اور آگے چل کر یہ جھگڑا ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا بن گیا۔"[10]

انگریزوں کی حکومت جب مستحکم ہو گئی، تو اونچے عہدوں اور با اثر جگہوں پر مقرر مسلمانوں کی جگہ آہستہ آہستہ ہندوؤں نے لے لی۔ مسلمان امیر دامرانہ صرف انگریزی انتظامیہ کی مہربانیوں پر منحصر ہو گئے، بلکہ اونچے عہدوں سے محروم ہو کر ان کے عتابوں کے شکار بھی ہوئے۔ ہندوؤں کی حالت دوسری رہی۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں کچھ اصلاحات کو چھوڑ کر، مقامی نظام کو پہلے ہی کی طرح رکھا گیا تھا، اس لئے سرکاری کارکنوں کی اکثریت ہندوؤں کی ہی رہی، وہی مہاجن اور تاجر تھے اور وہی درباروں سے جڑے لوگ، جاگیروں کے مالک بھی۔ جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والے ہندوؤں کے پاؤں کے نیچے سے جب زمین کھسکی، تو ان کے درمیان پہلے سے موجود چھوٹے سرمایہ دار، تاجر اور نوکر شاہی سے متعلق طبقہ نے اپنی کوشش سے

اپنی حالت کو مضبوط بنایا، جس نے ہندوؤں کی گرتی ہوئی عزت کو سہارا دیا، اس طبقہ کو معاشی اور ذہنی طور سے مکمل تباہ اور مجبور نہیں ہونے دیا۔ ماہر معاشیات گنار مرڈل کی تعریف کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی دور میں جدیدیت کا اثر ہندوؤں پر ایک ہی وقت میں Spread اور Backward Affect دونوں شکلوں سے پڑا، جب کہ مسلمانوں کو Backward Affect سے ہی واسطہ پڑا، کیونکہ دوسرے دروازے ان کے لئے بند تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی عزت، اپنی حکومت، اثر اور معاشی وقار کے خاتمہ نے ان کے وجود کو ہی خطرے میں ڈال دیا۔ اس لئے حالات کی پیچیدگیوں نے مسلمانوں کے اندر اپنے تحفظ کے رجحان کو جنم دیا اور یہی وہ رجحان تھا، جس نے مسلم دانشوروں کو آگے چل کر عام مسلمانوں کی بھلائی اور ان کے حقوق کے سوال کو اٹھا کر ان کے لئے ایک الگ ریاست کا دعویٰ پیش کرنے کا موقع دیا۔ ایک وقت ایسا آیا، جب اس مطالبہ کی تائید مسلمانوں کے تقریباً تمام طبقوں نے کیا اور مذہب کو بھی اس کے لئے استعمال کیا گیا۔ الگ ریاست کے خوابوں کو عملی شکل دینے میں مسلمانوں کے ہر چھوٹے بڑے طبقہ نے (خاص طور پر ہندو ساہوکاروں اور زمینداروں کے ذریعہ ستائے ہوئے لوگ) اپنے کو محفوظ سمجھا اور اپنی ہمہ گیر ترقی کے راستے کو سہل اور محفوظ سمجھتے ہوئے ہندو دباؤ سے آزاد منزل مانا۔[11]

مشہور چینی فلاسفر لاؤتسے کا ماننا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ ہی سماجی بُرائیوں کے بانی اور مُربّی ہوتے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو پڑھنے لکھنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس سوچ میں وزن ہونے کے باوجود تعلیم کی روشنی نے انسان کو جہالت کے گہرے اندھیروں سے باہر نکالا ہے اور تہذیب کے فروغ کی منزلوں کی تکمیل میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ لیکن عجیب بدقسمتی رہی کہ جدید تعلیم کا ہندستانی سماج کو توڑنے اور خاص کر فرقہ واریت کو بڑھانے میں بھی بڑا رول رہا ہے اور لاؤتسے کے خیالات صحیح ہوتے نظر آتے ہیں۔ انگریزوں کے یہاں آنے اور جم جانے سے پہلے تک ہندستان میں تعلیم روزی روٹی حاصل کرنے کے لئے ضروری شرط کبھی نہیں رہی۔ مارکشیٹ اور ڈگریاں اچھی نوکریوں کی ضمانت نہیں تھیں، کیونکہ سماج کی بناوٹ ہی دوسری تھی اور نوکری کرنی عزت کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ انگریزوں کے قدم جب اچھی طرح یہاں مستحکم ہوگئے، تو اپنے انتظامیہ کو اچھی طرح چلانے کے لئے انہیں مقامی کامگاروں اور کلرکوں کی

ضرورت ہوئی اور اس کے لئے انگریزی اسکول اور کالج کھولے گئے۔ ڈگریاں دی جانے لگیں۔ وہی ڈگریاں اچھی نوکریوں اور سرکاری مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہوئیں اور آگے چل کر وہی ڈگری یافتہ طبقہ انگریزوں کے نظام کو قائم رکھنے کی ضمانت بنا۔ انگریزی تعلیم کو پہلے بنگال میں ہندوؤں نے خوش دلی سے اپنایا۔ ہندوؤں کے اندر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد جیسے جیسے بڑھتی گئی، ان کے درمیان ایک متوسط طبقہ ابھرتا چلا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا دائرہ بڑھتا اور پھیلتا گیا اور سماج میں اس کی حیثیت قائم ہوتی گئی۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لئے یہاں کی زمین سکڑ چکی تھی اور وہ معاشی اور ذہنی چوٹ کھائے ہوئے پریشان تھے، وہ سنبھلنے کی حالت میں بالکل نہیں تھے۔ ان کی حالت لگاتار بگڑتی اور پست ہوتی گئی۔ یہاں بھی انگریزوں نے نپے تلے انداز میں اسی نفسیاتی مار کے ہتھیار کو استعمال کیا، تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کے اختلافات کا دائرہ بڑھتا رہے اور دونوں کے درمیان مسلسل ٹکراؤ کی حالت بنی رہے۔

۱۸۷۱ میں ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی کتاب "Indian Musalmans" سامنے آئی۔ اس کتاب میں بنگال کے مسلمانوں کی حالت پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی اور یہ واضح کیا گیا کہ انگریزوں کی جانبدارانہ پالیسیوں کا مسلمانوں پر کس طرح بُرا اثر پڑا اور ان کی حالت کتنی خستہ ہوگئی ہے۔ اس کتاب نے مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ کو جھنجھوڑ دیا۔ نتیجتاً ان کے اندر نہ صرف حصول تعلیم اور اس کی اشاعت کا شوق پیدا ہوا، بلکہ اپنی تکلیف دہ حالت سے نجات پانے کی راہ تلاش کرنے کی ہمت بھی پیدا ہوئی۔ اس کتاب میں اجاگر کئے گئے حقائق کی وجہ سے مسلمانوں کی قابل رحم حالت سے دوسرے لوگ بھی واقف ہوئے اور ان کے لئے عام ہمدردی کا ماحول بنا۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، لیکن وہاں ہندوؤں کے مقابلے میں ان کے درمیان تعلیم کی بہت کمی تھی۔ زیادہ تر مسلمان چھوٹے کسان اور بے زمین مزدور تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کا تناسب اور بھی کم تھا۔ اس وقت کئے گئے ایک سروے کے مطابق اسکولوں میں مسلم طالب علموں کی حالت حسب ذیل تھی:

۱۸۷۲-۱۸۷۱

صوبے	مسلم آبادی کا تناسب	اسکولوں میں مسلمانوں کا تناسب
مدراس	6.0	4.4

بمبئی	15.4	8.42
بنگال اور آسام	32.3	14.4
اودھ	9.92	5.3
پنجاب	51.6	34.9

مندرجہ ذیل اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ بعد کے دنوں میں بھی صورت حال بہتر نہیں ہوئی:

۱۹۳۱۔۱۹۳۲

صوبے	مسلم آبادی	اسکول میں مسلم طلبا
مدراس	7.1	10.9
بمبئی	20.4	19.9
بنگال	54.9	51.7
مہاراشٹر	11.3	13.5
یوپی	14.8	18.6
پنجاب	56.5	50.6
سی۔پی۔برار	4.4	10.7
آسام	32.0	29.0

۱۹۲۷۔۱۹۳۲ کی تعلیمی رپورٹ کے مطابق بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اعلیٰ تعلیمی میدانوں کی حالت حسب ذیل تھی:

حلقہ	ہندو	مسلمان
قانون اور عدالت	۲۰۶۱	۴۴۴
ڈاکٹر	۱۱۴۴	۱۰۴
انجنیئر	۲۵۹	۳۴
کامرس	۶۵۴	۱۵

یونیورسٹیوں اور انٹرمیڈیٹ میں پڑھنے والے ہندو طلبا کی کل تعداد ۱۱۰۱۷ تھی اور ان میں

مسلم طلبا کی تعداد ۵۷۔ ۲۸ تھی، جب کہ ۱۹۱۱ کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی آبادی بنگال میں 52.7 فیصد تھی۔[۱۲] ایسے صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، وہاں تقابلی نظریہ سے حالت کچھ بہتر تھی۔ آبادی کے تناسب سے ان کے یہاں تعلیمی سرگرمیاں بہتر تھیں۔ بمبئی پریسیڈنسی میں (سندھ کو چھوڑ کر) مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کی 8.6 فیصد ۱۹۲۷ میں تھی اور طلبا کی کل تعداد میں 13.8 فیصد مسلمان تھے۔ بہار، اڑیسہ، مدراس اور یوپی میں مسلمانوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ ۱۹۲۷ میں 14.4 فیصد مسلمانوں کی آبادی تھی، جب کہ اسکولی طلبا کی تعداد 18.1 تھی۔ کالج میں پڑھنے والے مسلمان طلبا کی تعداد 24.1 فیصد تھی۔ بنگال کے مقابلے میں ہندستان کے دوسرے علاقوں میں انگریزی تعلیم کو دیر سے اپنایا تھا، اس لئے ہندستان میں انگریزی پڑھے لکھوں کی تعداد بنگال میں سب سے زیادہ تھی اور اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس لئے جب پورے ہندستان کا نقشہ سامنے رکھ کر تناسب کا تجزیہ کریں گے، تو مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے اور سرکاری نوکریوں کی بات آئی، تو مسلمانوں کے حصے میں کم ہی نوکریاں آئیں۔ جب ہندوؤں سے موازنہ کرنے کا سوال اٹھا، تو مسلمانوں نے اپنے آپ کو بہت خسارے کی حالت میں پایا۔ اس لئے اترپردیش میں، جہاں مسلمانوں کو کبھی دبدبہ حاصل تھا، سرکاری نوکریوں میں وہاں ریزرویشن کی باتیں اٹھیں، جو آگے بڑھتے بڑھتے خاص اختیار کی مانگ سے لے کر علاحدگی تک پہنچ گئی۔[۱۳]

ذرا ایک نظر ہم مڑ کر تاریخ کی طرف دیکھیں۔ پلاسی (۱۷۵۷) اور بکسر (۱۷۶۴) کی لڑائیوں نے انگریزوں کی فوجی اور سیاسی برتری ثابت کر دی تھی اور دیواروں پر لکھی سچائی ابھر کر سامنے آ گئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے تجارتی اغراض سے ہی سروکار نہیں ہے، وہ ایک مضبوط سیاسی طاقت کی شکل میں اپنی اہمیت ہندستانیوں سے منوانا چاہتی ہے۔ لڑکھڑاتی ہوئی مغل سلطنت اور مختلف ریاستوں کے خودسر بنے حکمراں اور آپسی مخاصمت میں ملوث باغی صوبہ دار مسلح انگریزی طوفان سے ٹکرانے کے لائق نہیں رہ گئے تھے۔ بکسر کی لڑائی میں (۱۷۶۴) بنگال، اودھ اور دلّی کے حکمرانوں کی اجتماعی طاقت کو شرم ناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا، اس سے انگریزوں کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ شاہ عالم ثانی سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی، جب انہیں ۱۷۶۵ میں ملی، تو ان کی آواز اور تیور ہی بدل گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کا دیا جانا ہندستان کی غلامی کا پروانہ

ثابت ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ مقامی طاقتیں مٹی کے مادھو بن کر رہ گئیں۔ انگریزوں کی سیاسی ڈپلومیسی، چالبازی، جوڑ توڑ، رشوت خوری اور فوجی دبدبہ کے سامنے ایک کے بعد ایک ہندستان کی ریاستوں نے گھٹنے ٹیک دیۓ اور انگریزوں کی ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے میں ہی انہوں نے اپنا بھلا دیکھا۔ ہر مورچہ پر انگریزوں کی لگاتار جیت اور ایک کے بعد ایک علاقوں کا ان کی ماتحتی میں جانا مسلمان رئیسوں کے لئے خاص طور سے آسمانی قہر ثابت ہوا، ان کے پاؤں تلے کی زمین زبردست جھٹکے کے ساتھ کھسک گئی۔

انگریزوں کے قہر کے پہلے شکار بنگال اور بہار (بہار اس وقت بنگال کا ایک حصہ تھا) کے مسلم رئیس ہوۓ۔ خودسر نوابوں کے دور میں یہ لوگ سرکار اور تحصیل داروں کے بیچ کی ایک کڑی محض تھے۔ ان کی کوئی اہم ذمہ داری نہیں تھی۔ اگرچہ ان کا وجود اہم نہیں تھا، لیکن مسلم حکمرانوں کے لئے عوام سے رابطہ کی وہی ایک اہم کڑی بھی تھے۔ ان کے مقامی اثر اور دبدبے کا فائدہ حکمرانوں کو ملتا تھا، لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے ان کی حیثیت نہیں کے برابر تھی۔ جب کمپنی نے اپنی حالت کو مستحکم بنالیا، تب ان رئیسوں اور امیروں کا وجود ان کے لئے بوجھ نظر آنے لگا۔ کمپنی نے ایک کے بعد ایک کئی اراضی اصلاحات کی پہل کی، جو ۱۷۶۳ میں دوامی بندوبست (Permanent Settlement) پر آکر ختم ہوئی۔ اس کے نتیجے میں امیروں کی بچی ہوئی ساکھ بھی ختم ہوگئی۔ ان کی جگہ ہندو تحصیل داروں نے لے لی اور مقامی طور پر وہی کمپنی بہادر کے نمائندہ مانے جانے لگے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی، اس لئے فوجی عہدوں سے انہیں برطرف کردیا گیا اور ان کے لئے روٹی روزی کا سوال بھی سنگین بن گیا۔ نتیجتاً نوابوں، امیروں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے لئے زمین پوری طرح تنگ ہوگئی۔

انگریزوں نے شروع میں چونکہ مسلمانوں کے ذریعہ نافذ عدالتی سسٹم کو باقی رکھا تھا، فارسی سرکاری زبان بنی رہی۔ لیکن دھیرے دھیرے ہندی کو فارسی کی جگہ پر استعمال کیا جانے لگا اور ایک وقت ایسا آیا کہ فارسی کو دفتری کاموں سے ہٹا دیا گیا۔ انگریزوں کے اس قدم نے ہندوؤں کے لئے عدالتی عہدوں کے دروازے کھول دیۓ، جو مسلمانوں کے لئے نیا اور گہرا زخم ثابت ہوا۔ پہلے گورنر جنرل وارن ہسٹنگس کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے لئے کلکتہ میں مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، جہاں روایتی طریقہ کی تعلیم کا نظم تھا اور یہاں سے پڑھ کر نکلے لوگ سرکاری

عدالتوں میں منصف وغیرہ بحال ہوتے تھے۔ بنارس میں سنسکرت کالج کا قیام بھی انہیں دنوں ہوا تھا، تاکہ ہندوؤں کے بیچ بھی ان کا روایتی تعلیمی نظام بھی فروغ پا سکے۔ یہاں سے پڑھ کر نکلے ہندو طلبا کو بھی اب عدالتوں میں نوکریاں ملنے لگیں۔

۱۸۱۳ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کو تجدیدی روپ دیا گیا اور مقامی لوگوں کے لئے جدید تعلیم کے دروازے کھولنا طے ہوا۔ اس کے لئے تعلیمی اداروں کو ایک لاکھ روپے تک کی سرکاری مدد کی گنجائش رکھی گئی۔ اس سہولت سے ہندوؤں نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ راجا رام موہن رائے نے سب سے پہلے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھا اور سرکاری پالیسیوں کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے ایک فعال تنظیم بنائی اور ۱۸۱۷ میں اعلیٰ تعلیم کے مقصد سے ایک ہندو کالج قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔[۱۴] ۱۸۱۸ میں کلکتہ کے پادری نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان انگریزی تعلیم کو رائج کرنے کے لئے کلکتہ میں متعدد ادارے قائم کئے۔ چونکہ اب روزی روٹی، عزت و توقیر انگریزی تعلیم سے جوڑی جا چکی تھی، انگریزی تعلیم کی اہمیت مقامی لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ نتیجتاً کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج میں انگریزی تعلیم کا نظم کیا گیا۔ ۱۸۳۵ میں ایک مسئلہ پیدا ہوا کہ تعلیم کا ذریعہ کون سی زبان ہو، فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی کے درمیان انتخاب کرنا تھا۔ Committee of Public Instruction نے فیصلہ کے لئے سرکار سے رابطہ کیا اور نتیجہ کے طور پر لارڈ میکالے کا مشہور تاریخی دستاویز سامنے آیا، جس نے انگریزی کی حمایت میں راستہ ہموار کر دیا۔

۷ مارچ ۱۸۵۳ کو گورنر جنرل نے لارڈ میکالے کے فارمولے کو منظوری دے دی اور فیصلہ کیا کہ انگریزی اور جدید سائنسی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے ہی اب سرکاری مدد ملا کرے گی۔[۱۵] اس پالیسی کے نتیجے کے طور پر مقامی تعلیمی طریقہ اور علم کے فروغ کے لئے کام کرنے والے ادارے اور طلبا کو ملنے والی مدد کے سرکاری دروازے مسلمانوں کے لئے بند ہو گئے۔ پڑھے لکھے ہندوؤں نے سرکار کی اس پالیسی کا خیر مقدم کیا، جب کہ مسلمانوں نے اس فیصلہ کو ہندستانیوں کو عیسائی بنانے کی سازش مانا اور اس کی مخالفت کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی کے توسط سے جدید علم کے جو دروازے ہندستانیوں کے لئے کھلے، مسلمانوں نے ان کا خیر مقدم تو الگ، ان کی طرف جھانکنا بھی گناہ سمجھا۔ اس وقت کے ہندو دانشوروں نے، خاص کر راجا رام موہن

رائے اور ان کے احباب نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی اور انگریزی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے ان کی مدد کی، ان کی ہمت بڑھائی۔ ۱۸۴۴ میں سرکار نے فیصلہ لیا کہ سرکاری نوکریوں میں انگریزی جاننے والے کو ہی فوقیت دی جائے گی، یعنی مسلمانوں کے لئے سرکاری نوکریوں کے دروازے پوری طرح بند کر دئے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والی سرکار کی یہ پالیسی بڑی خطرناک ثابت ہوئی، تو دوسری طرف اس کے فطری ردعمل میں ہندوؤں کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کی جڑیں مضبوط کرنے میں مددگار بھی ہوگئی۔ انگریزوں کی اس خطرناک پالیسی نے مستقبل کے ہندستان کے لئے سب سے پیچیدہ مسئلہ کی بنیاد ڈال دی۔ پڑھے لکھے بیدار دانشور ہندو، اکثر سرکار اور سرکاری پالیسیوں کے حمایتی ہو گئے اور مسلمان عام طور پر مخالفت میں سرگرم۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بنگال کے بڑے لیڈروں، دانشوروں اور اخباروں نے مسلمانوں پر اوچھے حملوں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ مسلم عہد حکومت کی سخت تنقید کی جانے لگی، اسے ہندستان اور ہندوؤں کے لئے لعنت مانا اور انگریزی سرکار کی پالیسیوں کی تعریف میں وہ بہت آگے نکل گئے۔ اس وقت ملک کے اندر جتنی بھی بُرائیاں موجود تھیں، ان کی صرف واحد وجہ مسلمانوں کی حکومت مانی گئی۔[۱۹] نتیجہ کے طور پر عدم اعتمادی کی فضا بنی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کی خلیج بڑھتی گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ مات کھائے ہوئے مسلمان امیروں اور رئیسوں نے عام مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف متحد ہونے کا ماحول بنا دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ دانشور متوسط طبقہ، جسے اعلی طبقہ کے لوگوں کی کھینچ تان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، وہ بھی ایک دوسرے کا مد مقابل مخالف بن گیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ پیدا ہوئی خلیج وقت گذرنے کے ساتھ بڑی گہری ہوتی چلی گئی۔

انگریزوں کے قدم جمنے کے کچھ دنوں کے اندر ہی مسلمانوں نے اپنی روایتی عزت اور دبدبہ کھو دیا۔ ۱۸۳۸ تک سرکاری عہدوں پر ان کا دبدبہ بنا رہا۔ ہندو و انگریز افسروں کی تعداد، جہاں سات ہوا کرتی تھی، وہیں مسلمان کم سے کم چھ ہوتے تھے۔ ۱۸۵۱ کے بعد جب انگریزی سرکاری زبان ہو گئی، حالت میں تیزی سے تبدیلی آنے لگی۔ ۱۸۵۲—۱۸۶۸ کے درمیان جو سرکاری وکیل بحال کئے گئے، ان کی تعداد ۲۴۰ تھی، ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور صرف ایک مسلمان۔ سرکاری نوکریوں میں تو مسلمان مشکل سے نظر آنے لگے۔ چونکہ مسلمانوں نے کئی

وجوہات سے، جن میں وہابی تحریک کا اثر اہم تھا، جدید انگریزی تعلیم کو نہیں اپنایا تھا، دوسرے میدانوں میں بھی ان کی تعداد ہندوؤں کے برابر دیکھی جانے لگی۔ ۱۸۶۹ میں سرکار سے منظور ڈاکٹروں کی تعداد ۱۰۴ تھی، ان میں ۹۸ ہندو، ۵ انگریز اور ایک مسلمان تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری پانے والے چار تھے، تین ہندو اور ایک انگریز۔[۱۷] ۱۹۰۱ کی مردم شماری کے مطابق سرکاری نوکریوں میں حالت حسب ذیل تھی:

	کل تعداد	ہندو	مسلمان
ہائی کورٹ جج	۳	۲	۱
ضلع سیشن جج	۱۰	۸	۲
سب جج	۶۲	۶۱	۱
منصف	۳۴۰	۳۲۲	۱۸
صوبائی جج	۳	۳	۰
ایڈیشنل جج	۷	۷	۰
کلکٹر ڈپٹی مجسٹریٹ	۵۲۹	۴۵۳	۷۶
سرکاری وکیل	۲۱۵	۲۰۴	۱۸

حالات کے غیر جانب دارانہ تجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منظم طریقے سے ہر میدان میں مسلمانوں کو درکنار کر سب سے زیادہ چوٹ پہنچائی جا رہی تھی۔ وہ پچھڑتے جا رہے تھے، ان کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ حالات کچھ ایسے بن رہے تھے کہ مسلمان ہندوؤں سے اور ہندو مسلمانوں سے بدگمان ہونے لگے، جس نے آگے چل کر ہندستان کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دے دیا۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ عام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اعلیٰ طبقہ کے احترام واکرام، نوکری اور سرکاری عہدوں کی چھینا جھپٹی سے کوئی سروکار نہیں رہا، لیکن دونوں طبقوں کے دانشور اعلیٰ طبقہ کی کھینچا تانی نے ملک کی سیاست کو متاثر کیا اور اونچے لوگوں کا وہ مسئلہ ہندو اور مسلمان کا مسئلہ بن کر ابھرا۔

مسلمانوں کی خستہ حالی کی تکلیف دہ داستان اس وقت کے اردو اخباروں میں شائع ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں کلکتہ سے عبدالرؤف کی ادارت میں شائع اخبار ''دوربین'' مورخہ ۱۴

جولائی ۱۸۹۹ کا یہ حصہ بہت اہم ہے:

"ہر طرح کی چھوٹی بڑی نوکریاں مسلمانوں سے چھین کر دوسروں کو، خاص کر ہندوؤں کو دی جا رہی ہے۔ سرکار کو اپنی سب رعایا کو ایک نظر سے دیکھنا چاہئے، لیکن اب ایسا وقت آ گیا ہے کہ سرکاری گزٹ اور اشتہاروں کے ذریعہ مسلمانوں سے بھید بھاؤ کیا جا رہا ہے، سرکاری نوکریوں میں انہیں نہیں لینے کی بات کی جاتی ہے۔ ابھی سندر بن کمشنر کے ماتحت بہت سے عہدوں پر بحالیوں کا اشتہار گزٹ میں دیا گیا، جہاں واضح لفظوں میں یہ کہا گیا کہ یہ نوکریاں صرف ہندوؤں کو دی جائے گی۔ اب مسلمان اتنے ذلیل ہو گئے ہیں کہ صلاحیت اور مہارت رکھنے کے باوجود سرکاری اشتہار دے کر نوکریوں میں ان کے لئے گنجائش نہیں رہنے دی جاتی ہے۔ ان مجبوروں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اعلی افسران تو ان کے وجود کو ماننے سے بھی انکار کرتے ہیں۔"[۱۹۰]

۱۸۷۱ میں ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کی کتاب سامنے آنے کے بعد جدید انگریزی تعلیم کو نہیں اپنانے کے نقصان دہ اثر نے لوگوں کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا تھا اور پڑھے لکھے مسلمانوں کے بیچ اپنی حالت کو بدلنے کا احساس جاگا۔ سرکار اور دانشور مسلمان کا دھیان بھی اس جانب گیا، نتیجتاً مسلمانوں کے درمیان تعمیری تعلیمی سرگرمیاں تیز ہوئیں۔ تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے متعدد ادارے پورے ملک میں قائم ہوئے۔ ۱۸۸۶ میں کلکتہ میں مسٹر عبداللطیف نے محمڈن لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی (Mohammdan Literary & Scientific Society) کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کے درمیان تعلیمی اشاعت شروع ہوئی۔ یوپی میں سرسید احمد خاں کی قیادت میں تعلیمی بدحالی کے حل پر بڑی مستعدی سے غور کیا گیا۔ انہوں نے ۱۸۷۱ میں مسلمانوں کی انگریزی تعلیم سے دور رہنے کے وجوہات کا پتا لگانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کی رپورٹ کی روشنی میں مسلمانوں کے اندر نشاۃ ثانیہ کا اپنا پروگرام تیار کیا۔ ۱۸۷۵ میں انہوں نے علی گڑھ میں مسلمان لڑکوں کے لئے ایک انگریزی ہائی اسکول اپنے ساتھیوں کی مدد سے قائم کیا۔ پانچ برسوں کے اندر اسے ڈگری کالج کی شکل دے دیا۔ یہاں جدید تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی نظم

کیا گیا۔ ۱۸۷۸ میں سرسید نے گذشتہ بیس برسوں کی مسلمانوں کی تعلیمی حالت جاننے کے لئے تعلیمی سروے کرایا۔ اس سے حاصل اعداد و شمار نے مسلمانوں کی تعلیمی بدحالی اور اس کے تقصاندہ پہلو کو اجاگر کیا تھا۔ اس رپورٹ نے مسلمانوں کی جہالت اور خاص کر نوکری پیشہ طبقہ کی تکلیف دہ حالت اور سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی گنجائش کا جو منظر پیش کیا، وہ بڑا چونکا دینے والا تھا۔ اس سروے کے مطابق قانونی ڈگری رکھنے والے ۱۵۵ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۵۷ تھی۔ یہی حال ڈاکٹری اور انجنیرنگ پیشوں کا تھا۔ آرٹ گریجویٹوں میں جب ہندوؤں کی تعداد ۱۳۷۳ تھی، تو مسلمان صرف ۳۰ تھے۔ ہندو ۱۲۶ ایم۔ اے تھے، تو مسلمان ۵۔[20] بنگال میں مسلمانوں کی حالت اور قابل رحم اور نازک تھی۔ ۱۸۸۰۔۱۸۸۱ میں ہائی اسکولوں کے ہندو طلبا کی تعداد ۳۶۶۸۶ تھی، جب کہ مسلمانوں کی صرف ۳۶۳ تھی۔[21]

یہی وہ وقت ہے، جب زبان اور ذریعہ تعلیم کی بات بھی اٹھی۔ بنگال میں بنگلہ جب سرکاری زبان بنی، تو غیر بنگلہ بولنے والے مسلمانوں کے لئے (خاص طور سے اعلیٰ طبقہ کے لئے) یہ بڑی پریشانی کی وجہ بنی۔ شمالی ہندستان میں اردو۔ ہندی کے سوال پر آپسی کش مکش بھی سامنے آئی، ساتھ ہی سنسکرت، فارسی اور عربی کے سوال بھی اٹھے۔ مدرسہ، مکتب اور اسکولوں میں ہندو استادوں کی بحالی، ان پر طرف داری کرنے کے الزام جیسے الجھنوں سے بھرے مسائل بھی سامنے آئے۔ جب ۱۸۸۳ میں فارسی رسم الخط کی جگہ دیوناگری رائج کرنے کا سرکاری اعلان ہوا، تو معاملہ ہندی۔ اردو سے آگے بڑھا، اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ بن کر ابھر آیا۔ مسلمانوں کے درمیان سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اور بنگال میں سید امیر علی کی کوششیں کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں۔ اسی وقت ہندستان میں آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحانات کی بات بھی چلی۔ ہندستان میں یہ امتحان منعقد ہو یا نہیں ہو، اس مسئلہ پر بہت بحثیں ہوئیں۔ سرسید احمد خاں وغیرہ نے ہندستان میں وہ امتحان ہو، اس کی مخالفت کی تھی۔ چونکہ مسلمانوں کے درمیان اعلیٰ تعلیم کی کمی تھی، اس لئے مسلمانوں کے لئے نامزدگی کو ہی بہتر بدل مانا۔ یہی سوال سرکاری نوکریوں سے متعلق بھی اٹھا اور آگے چل کر کونسل میں بھی سیٹوں کے ریزرویشن پر ختم ہوا۔

اب ایک کے بعد ایک حساس سوال اٹھنے لگے تھے اور سرکاری پالیسی حالت کو الجھانے والی ہی رہی، تاکہ ہندو اور مسلمان آپس میں الجھتے رہیں۔ علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل

مسٹر تھیوڈر بیک کے وقت میں حالت زیادہ الجھ گئی۔ کانگریس ایک بڑی تحریک کی شکل لینے لگی تھی۔ انہوں نے کانگریس کی سرگرمیوں کے دوررس اثرات کو اچھی طرح بھانپ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بہت جلد کانگریس، سرکار کے لئے مسئلہ پیدا کرنے والی ہے۔ مسٹر بیک نے اپنی ڈپلومیسی اور دوراندیشی کو چالاکی سے استعمال کیا اور علی گڑھ تحریک کو انگریزوں کے حق میں متاثر کرتے موڑنے کی کوشش کی۔ وہ تحریک سرکار مخالف تحریک نہ بنے، اس کوشش میں انہیں کامیابی ملی۔ انہوں نے پڑھے لکھے مسلمان نوجوان کے بیچ ایسی ذہنیت کا بیج بو دیا، جس نے آگے چل کر "Struggle for Existence" کی جد وجہد میں ہندو مخالفت کا پہلو اپنا لیا۔ ان دنوں ہندوؤں کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔ ۱۸۷۰ کے کلکتہ ریویو میں اس بارے میں جیمس اوک نیلی کی سلسلہ وار تحریر شائع ہوئی۔ انہوں نے مسلمانوں کی بدحالی کے مدنظر ان کو دی جانے والی امداد پر ہندوؤں کا جو تلخ ردعمل ہو رہا تھا، اس کا ایک مختصر تجزیہ شائع کیا، وہ کہتے ہیں:

> "جب انگریزوں اور مسلمانوں کا با اثر طبقہ سرکار پر زور دے رہا تھا کہ مسلمانوں کو ان کی بدحالی کی حالت سے اوپر اٹھایا جائے اور ان کو سرکاری رعایتوں سے فائدہ اٹھانے کے لائق بننے میں مدد کی جائے، ہندوؤں کا ایک ذمہ دار طبقہ سامنے آ کر لوگوں کو ورغلانے کی کوشش کرتا رہا کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ سرکار کا غیر وفادار ہے اور اسے عام طور پر بھی مسلمانوں کی ہمدردی حاصل ہے۔"[۲۲]

ہندوؤں کے سوچنے کے انداز اور ان کے تلخ ردعمل نے کریلے پر نیم کا کام کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کش مکش کے بڑھتے ہوئے رجحان کو ایسی ہی گھٹیا سوچ نے تقویت پہنچائی۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ تعلیم اور علم کی روشنی جہالت کے اندھیرے سے لوگوں کو باہر اجالے کی طرف لاتی ہے، تعلیم جس کا خاص مقصد انسانیت کو اونچائی عطا کرنا، انسانیت کے ہمہ گیر تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کرنا، لوگوں کی ذہنیت کو وسعت عطا کرنا، تحمل، یکسوئی اور انکساری کی خوبیوں سے مالا مال کرنا رہا ہے، لیکن اس نے انگریزوں کی پشت پناہی میں ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کو تنگ نظر بنا گمراہ کیا۔ ان کے اندر صرف سرکاری نوکریاں اور مال و عزت حاصل کرنے کی کش مکش پیدا کی۔ نتیجتاً فطری طور پر

ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کی کھینچا تانی نے دشمنی کی شکل لے لی۔ منصوبہ بند طریقے سے ایسے قدم اٹھائے گئے کہ کچھ پتا بھی نہیں چلا اور بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے مدِ مقابل کے روپ میں میدان سنبھال لیا۔

دلّی کے بادشاہ شاہ عالم ثانی کے ذریعہ انگریزوں کو ''دیوانی'' عطا کیے جانے (۱۷۶۵) سے ۱۸۵۷ تک ہندستانی تاریخ کو اختصار میں میکا ویلین پالیسی، سیاسی دور اندیشی، تجارتی رجحان کی پختگی اور ان کے ذریعہ ہندستان کی دولت کی لوٹ، ہندستانیوں کی آپسی کھینچا تانی، رقابت اور تصادم کی تاریخ کہی جا سکتی ہے۔ اس دور میں ہندستان اور ہندستانیوں پر کیا کچھ گزرا، کہنے کی یہاں گنجائش نہیں، صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ہندستانیوں پر انگریزوں نے چہار جانب سے حملہ کیا۔ یہاں کی معاشی، سیاسی، سماجی اور فوجی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہی نہیں، ذہنی اور اخلاقی طور پر بھی انہیں کمتری کے شکنجے میں بُری طرح جکڑ جانے پر مجبور کیا۔ ۱۸۵۷ میں جب اپنی لڑکھڑائی حالت، بے بسی اور اقدار میں گراوٹ کا احساس ہندستانیوں کو ہوا، تو بنگال سے دلّی تک بغاوت کا زبردست طوفان اٹھا۔ چراغِ سحری کی طرح ٹمٹماتے ہوئے مغل خاندان کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو باغی ہندستان کا شہنشاہ بنایا گیا اور ایسا لگا کہ اب انگریزوں کے پاؤں اکھڑنے ہی والے ہیں، مگر ایسا ہوا نہیں۔ باوجود اپنے اتحاد، بہادری اور قربانی کے جذبے کے یہ بغاوت انگریزوں کی ڈپلومیسی اور فوجی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ مقامی سرداروں کی غداری اور کچھ ملکی ریاستوں کی انگریز پرستی نے بچی کھچی ساکھ کو بھی ختم کر دیا۔ دلّی کے لال قلعہ سے بیرک پور چھاؤنی تک انگریزوں کے ظلم و بربریت کا ننگا ناچ ہوا۔ ہر جگہ پیپل، برگد اور دوسرے بڑے درختوں پر عزت نفس کے حامل ہندستانیوں کو پھانسی دے کر لٹکا دیا گیا۔ مغل شہنشاہ، ان کا خاندان، مغل شہزادے، مغل شہزادیاں، دلّی کے رئیس، خاص و عام ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لینے پر مجبور کر دئے گئے۔ ''شہنشاہ'' کے سامنے ان کے لڑکوں کے کٹے سر پیش کیے گئے۔ یہی نہیں، آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا اور وہیں ان کی موت ہوئی، مغل سلطنت کا چراغ سدا کے لئے بجھ گیا: ''دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں''۔ اس کے ساتھ ہی ہندستانیوں کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ ہو گیا، ان کا پورا دم خم نکل گیا اور وہ پوری طرح انگریزوں کے غلام بن گئے، ان کی جواں مردی تاریخ کے اوراق میں سمٹ گئی۔

انگلینڈ کے وزیر اعظم پامرسٹن (۱۷۸۴-۱۸۶۵) نے ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو اپنے مکتوب مورخہ ۹ اکتوبر ۱۸۵۷ کے ذریعہ حکم دیا کہ مسلمانوں کے تاریخی اور ثقافتی آثار کی گلکاریوں کی قابل نمونہ عمارتوں، جامع مسجد کو مسمار کر دیا جائے، تاکہ مسلمانوں کی قیمتی نشانیاں یہاں بچی نہ رہیں۔ اسی دوران بورڈ آف کنٹرول کے صدر مسٹر اسمتھ نے لارڈ کیننگ کو اطلاع دی کہ ٹائمس لندن نے 'کرسیڈ صلیبی جنگ' کے اعلان کے ساتھ مسلمانوں کے گلے میں صلیب اتار دئے جانے کا اعلان کیا ہے۔[۲۳] اس وقت کی سنگین صورت حال کا اندازہ ان خطوط سے ہی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خاص طور سے مسلمانوں پر ہی ظلم ہوئے، سازشوں کے وہی شکار بنے اور ان پر ہی خاص طور سے قہر ٹوٹا۔ ۱۸۵۷ کے بعد دلّی، میرٹھ، کانپور، جھانسی، لکھنؤ، پٹنہ، جون پور، بجنور، مرشد آباد، کلکتہ اور اس کے چاروں طرف کیا کیا ہوا، بہت سی کتابیں شائع ہو کر ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ اختصار میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ ۱۸۵۷ کے بعد کسی ہندستانی کو سر اٹھانے کی ہمت کرنے کے لائق بھی نہیں چھوڑا گیا۔ خاص کر مسلمانوں کو تو ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا گیا، جہاں ان کی حالت لٹے لٹائے قافلے کی ہوگئی۔ وہ سر چھپانے اور روزی روٹی کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ملک، جہاں ان کی طوطی بولا کرتی تھی، اس کا ہی ذرہ ذرہ نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو گیا، ان کے لئے زمین تنگ ہو کر رہ گئی۔

انگریزوں نے سب سے پہلے بنگال میں اپنے قدم جمائے اور پھر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ پورے ہندستان کے وہ حکمراں بن بیٹھے۔ شمالی ہندستان نے ہمیشہ ہندستان کے دل کی حیثیت رکھی ہے اور یہاں کے سیاسی تغیرات کا اثر ملک کے دوسرے جگہوں پر پڑتا رہا ہے۔ یہاں کافی زمانے تک کسی نہ کسی شکل میں مسلمان ہی حکومت میں رہے، اس لئے انہیں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ چونکہ مسلمانوں سے حکومت چھینی گئی تھی، انگریزوں کی کوشش رہی کہ پہلے ہر طرح سے ان کو اپنے رحم و کرم کا محتاج بنا دیا جائے اور جب مسلمانوں کو یہ احساس ہو جائے کہ بغیر انگریزوں کی مرضی کے وہ باعزت طریقے سے جی بھی نہیں سکتے، تو پھر ان پر کچھ مہربانیاں کی جائیں۔ اسی پالیسی کے مدنظر ہندوؤں کی کھل کر ہمت افزائی کی گئی۔ مسلمانوں پر واضح کر دیا گیا کہ ان کو بھی اب اگر باعزت طریقے سے جینا ہے، تو انہیں وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا، جو انگریز ان کے لئے طے کریں گے۔ اکبر اور اورنگ زیب کے کارنامے اور حصولیابیاں

عظمت کے پیمانے نہ ہو کر سموئل اسمائلس (Samual Smiles)، کابڈین اور برائٹ کے کاموں کو آئیڈیل ماننا ہوگا۔[۲۴]

مسلمانوں کے فاتح کی شکل میں آنے اور یہاں جم جانے کے بعد عام ہندو جس ذہنی حالت سے گزرے ہوں گے، حکومت چھن جانے کے بعد مسلمانوں کی بھی لگ بھگ وہی ذہنی حالت رہی ہوگی۔ مسلمانوں کے دلوں میں کڑواہٹ زیادہ رہی ہوگی، کیونکہ مسلمان جس وقت ہندستان آئے تھے، اس وقت کہیں آنا جانا، آمدورفت اور کسی سے رابطہ قائم کرنے کی دشواریوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہندستان میں کوئی ہندستان گیر نظریہ موجود نہیں تھا۔ ایک جگہ پر رونما ہونے والے واقعات کا اثر مشکل سے ہی دوسری جگہوں پر محسوس کیا جاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے طویل عہد حکومت میں قندھار سے کنیا کماری تک آمدورفت کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ اکبر اور اورنگ زیب کے زمانے میں تو مغل حکومت کی حدیں ہی بہت پھیل چکی تھیں اور ہندستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک رابطہ کا کوئی نہ کوئی کارآمد سلسلہ موجود تھا۔ جب مغلوں کا مرکزی نظم ونسق کمزور ہو کر ڈگمگایا، تو لگ بھگ سبھی صوبوں کے صوبہ داروں نے خودسر ہونے کا اعلان کرنے کے باوجود دلّی میں بیٹھے شہنشاہ کو ہمیشہ عزت دی اور جب وہ حکومت اپنی آخری سانس لے رہی تھی، تو ۱۸۵۷ میں آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو ہی سب نے اپنا پیشوا بننے پر مجبور کیا۔ شہنشاہ کو اس کے لئے بڑی قیمت چکانی پڑی۔ انگریزوں کے ذریعہ ان کے لڑکوں کے کٹے سر انہیں پیش کئے گئے۔ ہمایوں کے مقبرے میں مع خاندان انہیں پناہ لینی پڑی اور رنگون میں جلا وطنی کی حالت میں سسک سسک کر زندگی کے باقی دن گزارنے پڑے۔ اس ڈراپ سین کا آخری باب تو اور بھی المیوں سے بھرا ہوا رہا۔ اسے اس دیوان عام کے جھروکے کے نیچے جہاں ان کے دیدار کے لئے ہزاروں رعایا جمع ہوا کرتی تھی، ایک مجرم کی طرح ہاتھوں میں ہتھکڑیاں باندھے اپنے خلاف بغاوت کرنے کا فیصلہ سننا پڑا۔ مسلمانوں کو جن آزمائشی حالات سے لگاتار گزرنا پڑا، وہ بڑے تکلیف دہ تھے۔ اس نے ان کے اندر مایوسی کی ذہنیت پیدا کردی۔ اپنے وجود اور شناخت کے سوالوں پر وہ ہمیشہ محتاط رہنے لگے۔

حواشی:

١۔ جواہر لال نہرو، ریسنٹ ایسز اینڈ رائٹنگس، الہ آباد، ١٩٣٤، ص ٤٩

٢۔ ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ، ماڈرن اسلام ان انڈیا، لاہور، ١٩٦٩، ص ١٨٨

٣۔ کیتھ کلاڈ، پاکستان اے پولیٹیکل اسٹڈی، جارج السن، لندن، ١٩٥٧، ص ٢٠٠

٤۔ جے پرکاش نارائن، ان دی لاہور پورٹ، پٹنہ، ١٩٤٧، ص ١٣٦۔١٣٧

٥۔ ہندستان کی قدیم تاریخ اور روشن ماضی کی نشانیاں ہڑپا موہن جوداڑو سے لے کر اجنتا اور ایلورا تک کی زندہ جاوید قومی وراثت کی تلاش سب یورپ کے باشندوں اور خاص کر انگریزوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جس وقت مسلمان فاتح کی شکل میں یہاں آئے فی زمانہ ہندستانی راجاؤں کو اپنے عظیم ماضی، وہ ماضی جس پر آج ہم ہندستانی فخر کرتے ہیں، کا کبھی احساس بھی نہیں رہا ہوگا بلکہ مادر وطن اور دیش بھگتی کا تصور بھی وہیں تک محدود رہا ہوگا، جہاں تک ان کی حکومت رہی ہوگی۔

٦۔ دیش بھگتی اور مادر وطن کا جو تصور آج ہمارے سامنے ہے، وہ اس وقت ایک دم نہیں تھا۔ یہ تو انیسویں صدی کے آخری دنوں کی دین ہے۔ پھر عام لوگ کی حالت کا تصور آج کے عوام الناس کی حالت سے ہم نہیں کر سکتے ہیں۔ بیسویں صدی کی بھرپور حصولیابیوں کے باوجود آج دور دراز گاؤں کے بسنے والے ہندستانیوں کا حکمراں طبقہ اور ان کی نظر کرم سے کیا تعلق؟ دو وقت کی روٹی اور زندہ رہنا ہی بڑی بات ہے۔ کیسی جمہوریت، کہاں کی جمہوریت، کون سی جمہوریت اور اس کی نعمتیں؟ کیسا دیش اور کیسی دیش بھگتی، روزی، روٹی اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا جب آج بنیادی سوال ہیں، تو صدیوں قبل سامنتی (جاگیرداری) نظام میں کیا حالت رہی ہوگی، ہم تصور کر سکتے ہیں۔

٧۔ پی۔ سی۔ جوشی، بحوالہ بی۔ آر۔ نندا، ایسز آن انڈین ہسٹری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ١٩٨٠، ص ١٧١

٨۔ جواہر لال نہرو، ڈسکوری آف انڈیا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ١٩٨١، ص ٣٥٢

۹۔ رجنی پام دت، انڈیا ٹوڈے، پیپلس پبلیکیشن ہاؤس، بمبئی، ۱۹۴۹، ص ۴۲۸
۱۰۔ اے۔آر۔دیسائی، سوشل بیک گراؤنڈ آف انڈین نیشنلزم، پوپولر بک ڈپو، ۱۹۵۴، ص ۳۴۷
۱۱۔ پی۔سی۔جوشی، بحوالہ بی۔آر۔نندا، ایسز آن انڈین ہسٹری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۰، ص ۱۷۲۔۱۷۳
۱۲۔ بی۔آر۔نندا، ایسز آن انڈین ہسٹری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۰، ص ۲۲۵۔۲۲۶
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔۲۲۷
۱۴۔ ڈاکٹر رام گوپال، انڈین مسلمس: پولیٹیکل ہسٹری، ۱۸۵۸۔۱۹۴۷، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۹، ص ۱۷
۱۵۔ ایضاً، ۱۸
۱۶۔ ایضاً، ۲۰
۱۷۔ ایضاً، ۲۸
۱۸۔ املینڈ وڈے، اسلام ان ماڈرن انڈیا، مایا پرکاشن، کلکتہ، ۱۹۸۲، ص ۳۱
۱۹۔ ڈاکٹر رام گوپال، ص ۲۷
۲۰۔ ایضاً، ۳۴
۲۱۔ ایضاً، ۳۵
۲۲۔ طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۴۵، ص ۱۷۷
۲۳۔ ایضاً، ۱۷۷
۲۴۔ پی۔ہارڈی، دی مسلم آف برٹش انڈیا، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۲، ص ۷۱

جینے کی جدوجہد: مناسب راستے کی تلاش

عہد وسطیٰ کے ایشیا اور یورپ کے سماج میں توازن بنائے رکھنے میں مذہب اور مذہبی رہنماؤں کا اہم رول رہا ہے۔ سرکاروں کو بنانے اور بدلنے تک میں انہوں نے مؤثر پہل کی ہے۔ ہندستان میں ان کی گرفت کچھ اور زیادہ سخت تھی۔ روایات پر مبنی یہاں کے سماجی ڈھانچے پر صنعتی انقلاب کے نتیجے میں ترقی یافتہ ثقافتی نظریہ نوآبادکاروں کے ساتھ یہاں دیر سے پہنچی۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے تک نسلی نظام پر مبنی ہندستانی سماج میں صرف برہمن ہی تعلیم اور علم حاصل کرنے کے حقدار تھے۔ اس لئے برہمنوں کی گرفت سماج پر سب سے زیادہ تھی، انہیں دیوتاؤں کا مقام حاصل تھا۔ ان کی خواہش بھگوان کی اِچھا مانی جاتی تھی۔ راجا۔مہاراجا بھی براہمنوں کی مخالفت کی ہمت نہیں کرتے تھے اور جاہل سے جاہل برہمن بھی قابل پرستش مانا جاتا تھا، لوگ ان کی قدم بوسی کو اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے تھے۔ نسلی نظام اور اس کی پیداوار ذات پات کی ذہنیت کے سبب لوگوں کے درمیان گہری خلیج بنی ہوئی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی سماجی ساخت الگ رہی۔ مسلمانوں کے درمیان براہمنوں جیسی کوئی افضل ذات نہیں تھی۔ اسلامی عقائد اور تعلیم کی بدولت مساوات اور برابری کے اصولوں نے کبھی ''علماء'' کو برہمنوں جیسا مقام نہیں لینے دیا۔ برہمنوں کی طرح کوئی خاص جماعت کبھی بھی مسلمانوں کی گردنوں پر سوار نہیں ہوسکی۔ لیکن شریعت اور اسلامی جانکاریاں رکھنے کی وجہ سے سماج پر ان کی کچھ گرفت تو تھی ہی، لوگوں کی ذہنیت بنانے میں بلاشبہ انہوں نے اہم رول نبھایا ہے۔ مسلمان جب تک ''حکمراں'' کی شکل میں یہاں رہے، درباروں میں علما کی پوچھ تھی، کیونکہ اسلامی شریعت کے مطابق حکومتوں کے قانون بنائے جاتے تھے (ان قوانین پر اس وقت کے حکمرانوں اور ان کے افسروں نے کتنا عمل کیا، یہ اختلافی موضوع ہے)۔ جب مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی، تو علما کا احترام و اکرام جو درباروں میں تھا، وہ تو ختم ہوگیا، لیکن عوامی زندگی میں ان کا اثر باقی رہا۔ لیکن اب نئی صورت حال

تھی۔ انگریز حکمرانوں کی مدد سے عیسائی مشنری نے انگریزی تعلیم اور سماجی اصلاح کے کاموں کے توسط سے خود کو ہر دل عزیز بنا لینا اپنی منزل بنالی تھی۔ بنگال کے بڑے ہندو زمینداروں اور راجاؤں نے تو انگریزی تعلیم اور انگریزوں کے بڑھتے اثر کو مسلم اثرات سے اپنی نجات کا ذریعہ مانا اور انگریز پرستی میں اپنی حدوں کا بھی خیال نہیں رکھا۔ کچھ با اثر افراد نے تو عیسائی مذہب کو بھی اپنا لیا اور نئے حکمرانوں کے معاونین کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ لیکن علما کے اثر سے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم اور تعلیمی نظام کو اپنے لئے انگریزوں کی سازش مانا اور اس کی سخت مخالفت کی۔ نتیجتاً آگے چل کر اپنے اس رویہ کی انہیں بڑی قیمت چکانی پڑی۔

انگریزوں کے ہندستان میں مستحکم ہو جانے کے بعد بہت دنوں تک مسلمان ذہنی کشمکش کی حالت میں مبتلا رہے۔ انگریزوں کے چوطرفہ حملے اور اپنے ہم وطن ہندوؤں کے بدلے ہوئے تیور اور برتاؤ نے انہیں بہت دنوں تک اتھل پتھل کی حالت میں رکھا۔ معاشی دشواریوں کے سبب مصیبتوں کے آئے سیلاب کے ساتھ ذہنی اذیت کے چوطرفہ حملوں کا مسلمانوں نے ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اپنے وجود کو بچائے رکھنے کی کوششوں میں وہ کامیاب رہے، جسے ایک نہ یقین کرنے والا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اتھل پتھل کی اس طویل مدت میں علما نے سب سے زیادہ حوصلے، مضبوطی، تحمل اور پختگی کا ثبوت دیا۔ ایک ساتھ انگریزوں اور ہندو احیا پرستوں سے مقابلہ کرتے ہوئے عام مسلمانوں کے وہ رہنما بنے رہے۔ یہ ایک سچائی ہے کہ اس قیامت کی گھڑی میں، جب مسلمانوں پر ہر طرف سے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور مذہبی حملے ہو رہے تھے، اگر ان علما نے میدان نہیں سنبھالا ہوتا، تو آج اس برصغیر ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں جو مسلمان نظر آرہے ہیں، وہ ہرگز نہیں ہوتے۔ اسپین کی طرح ان کا بھی پورا صفایا ہو چکا ہوتا اور یہ تاریخ کا ایک افسوس ناک باب بن کر رہ گئے ہوتے۔

ہندستان میں مسلمانوں کی طویل حکومت رہی، یہاں کے لوگوں سے میل جول اور مغلوں کے وقت اپنائی گئی ''صلح کل'' کی سماجی پالیسیاں اور شادی بیاہ کے رشتوں کی وجہ سے مسلم سماج کے بنیادی ڈھانچے پر اکثریتی ہندوؤں کا بہت اثر پڑا۔ کٹر علما نے اس تبدیلی کو پسند نہیں کیا تھا اور اس باہری اثر سے اسلام کو پاک صاف کرنے کی وہ لگاتار کوشش کر رہے تھے۔ ان مصلحوں میں قابل ذکر تھے شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد بریلوی۔ ان کے ذریعہ چلائی گئی مسلم

نشأۃ ثانیہ کی تحریکوں نے عام طور پر مسلمانوں کے بھی طبقوں کو متاثر کیا تھا۔ ہندستان کے بڑے حصے میں ان کی تحریک چلی تھی۔ انگریزوں کے یہاں جم جانے کو ان علماء نے کبھی پسند نہیں کیا، ان کے خلاف ماحول بناتے رہے۔ نتیجتاً ایک ایسا ماحول بنا ہوا تھا، جہاں بعد کے دنوں میں انگریزوں کی حکومت کو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پورے ہندستان کے لئے نقصان دہ ثابت کرنا آسان ہوا۔ وہابی تحریک کی وجہ سے اس خیال کی، لوگوں نے تائید کی اور اسی درمیان انگریزی حکومت کے دارالحرب (جنگ کی جگہ) اور دارالسلام (امن وسلامتی کی جگہ) ہونے، نہ ہونے کی بحث مسلمانوں کے درمیان ہونے لگی۔ بین الاقوامی سطح پر وہابی تحریک کا زیادہ اثر پڑا ہو یا نہ پڑا ہو، اس نے ہندستان کے بہار، بنگال، یوپی، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی علاقوں میں زبردست ہلچل پیدا کر دی تھی۔ پنجاب اور اس کے آس پاس کے سکھ حکمرانوں کی پالیسیوں کو مسلمانوں نے اپنے خلاف مانا اور آگے چل کر سکھوں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہندستان سے افغانستان کی طرف ہجرت اور انگریزوں کے خلاف جہاد (مذہبی جنگ) کی کوششوں سے پیدا حالت کا عوام پر جو اثر پڑا، اس کی تفصیل کئی کتابوں میں آچکی ہے اور یہاں اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہجرت اور جہاد کی تحریک بنیادی طور سے مسلمانوں کے درمیان انگریزوں کے خلاف ماحول بنانے کی کوشش تھی، لیکن بدقسمتی سے اپنے ہی ملک کے باشندے، سکھوں سے تصادم ہو گیا، جس کی وجہ سے کچھ علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف فضا بن گئی۔

لگ بھگ اسی وقت بنگال میں مسلمانوں کے درمیان دو اور تحریکیں چلیں۔ بنیادی طور پر وہ مذہبی اور سماجی اصلاحوں کی غرض سے شروع ہوئی تھی، لیکن ایک وقت ایسا آیا، جب ان تحریکوں کی شکل بھی فرقہ وارانہ ہو گئی۔ پہلی تحریک فرائضی تحریک کے نام مشہور ہے۔ اس تحریک کے رہنما موجودہ بنگلہ دیش کے فرید پور ضلع کے شمالی قصبہ کے حاجی شریعت اللہ (۱۷۸۱۔۱۸۴۰) تھے۔ ۱۸۲۱ کے قریب انہوں نے بنگال کے مسلمانوں کے درمیان شرعی احکام کی پابندی اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لئے یہ تحریک چلائی تھی۔ ان پر شافعی مسلک کے امام حضرت امام شافعی کا گہرا اثر تھا۔ انہوں نے جمعہ اور عید بقرعید کی نمازوں میں لوگوں کو یہ پیغام دینا شروع کیا کہ چونکہ بنگال غیر مسلم انگریزوں کے ماتحت ہے، اس لئے یہ دارالحرب ہے، اس لئے یہاں جمعہ اور عید بقرعید کی نمازیں ضروری نہیں۔ بنگال کے مسلمانوں کے درمیان انگریزوں کے خلاف

انہوں نے تحریک ضرور چلائی، لیکن انہوں نے اعلانیہ طور پر جہاد کی بات نہیں کی۔ ان کے لڑکے دادو میاں (محمد محسن ۱۸۱۹۔۱۸۶۲) نے اس تحریک کو سیاسی شکل دے کر اسے وسعت دی۔ غریب کسان اور کھیت مزدوروں کو انہوں نے زمینداروں کے غیر ضروری ٹیکسوں، استحصال اور ظلموں کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے منظم کیا۔ دادو میاں کا کہنا تھا، زمین خدا کی ہے اور اس کے لئے زمینداروں کو لگان دینا خدا کے قانون کی حکم عدولی ہے، لہذا زمینداروں کو لگان نہیں دینا چاہئے۔[1] بنگال میں بڑے زمینداروں کی زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی اور کسان و کھیت مزدور زیادہ تر مسلمان تھے، اس لئے اپنی اصلاح، جائز حق اور زمینداراوں کے غیر مناسب رویے کے خلاف تصادم نے فرقہ واریت کی حدیں چھولیں۔ بنگال کی دوسری منظم تحریک تیتو میر (میر نثار علی ۱۷۸۲۔۱۸۳۱) کی تھی۔ بنگال میں غریبوں کے استحصال کے متعدد طریقے تو تھے ہی، مسلمانوں کی داڑھی پر بھی زمینداروں نے ٹیکس لگا رکھا تھا۔ تیتو میر نے اس کے خلاف تحریک چلائی، ساتھ ہی زمینداروں کی من مانی اور ظلموں کے خلاف لوگوں کو منظم کیا۔ چونکہ بنگال میں مسلمانوں کی ہی زیادہ آبادی تھی، زمینداروں کے ہاتھوں یہ ہی زیادہ ستائے ہوئے بھی تھے۔ لہذا عام غریب مسلمان کسانوں کی زمینداروں سے اپنی نجات کی کوششوں کو بھی صورت حال نے فرقہ واریت کی حدوں تک پہنچا دیا۔ تیتو میر کی تحریک نے جب تیزی پکڑی، تو اسے دبانے کے لئے ہندو اور مسلمان زمینداراوں کو سرکار سے فوجی مدد لینی پڑی تھی۔ تیتو میر کے ساتھیوں اور زمین داروں کے درمیان کئی خونی جھڑپیں ہوئیں۔ لیکن فوجی مداخلت کے بعد یہ تحریک کمزور ہوگئی اور باراسات ضلع کے نرکل باڑی کی لڑائی میں تیتو میر کی وفات ہوگئی۔ ان کے تین سو سے زیادہ ساتھی گرفتار کر لئے گئے اور وہ تحریک ختم ہوگئی۔ تحریک تو ختم ہوگئی، لیکن اس نے جو اثر چھوڑا تھا، وہ صحت مند نہیں کہے جاسکتے۔ اس تحریک کے اثر سے جو ذہنیت بنی، وہ آج کے طبقاتی تصادم کی نہیں بنی، بلکہ مذہب کی بنیاد پر ہندو اور مسلمانوں کے بیچ کی بات ہوگئی، جس نے آگے چل کر پیچیدہ مسائل کو جنم دیا۔

۱۸ ویں۔۱۹ ویں صدی میں ہندستانی مسلمانوں کے بیچ نشأۃ ثانیہ کی جو تحریکیں چلیں، وہ مغل سلطنت کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دینے کے مقصد سے قطعی نہیں چلائی گئی اور نہ اس کا مقصد دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا تھا۔ مسلمانوں کے دن اب گئے، لوگوں نے تسلیم کر لیا
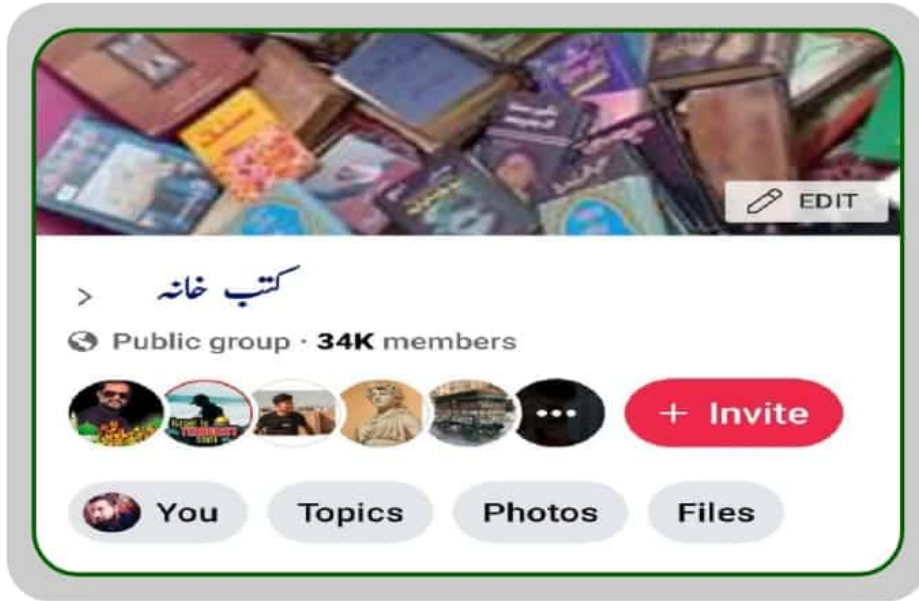
تھا۔ ان تحریکوں کا مقصد مسلمانوں کے باعزت وجود کو برقرار رکھنا تھا۔ ہندوؤں کے اثر سے مذہب کے نام پر جو چیزیں مسلمانوں کے درمیان رائج ہو گئی تھیں، ان کو دور کر پاکیزہ بنانا دوسرا مقصد تھا۔ جب ان تحریکوں کا زور بڑھا، تو اس کا فطری اثر ہندوؤں پر پڑا اور انہوں نے ان تحریکوں کو کچھ حد تک ہندو مخالف تحریک مانا۔ ۱۸۶۳ میں کلکتہ میں مسٹر عبد اللطیف نے Mohammdan Literary and Scientific Sosiety کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۷۷ میں کلکتہ میں ہی جسٹس امیر علی نے Central National Mohammdan Association قائم کیا۔ سر سید احمد خاں کے اثر میں ۱۸۸۶ میں All India Muslim Education Conference قائم کی گئی۔ لیکن ۱۸۹۰ میں اس کا نام بدل کر Muslim Education Conference کر دیا گیا۔ ۱۸۸۳ میں United Indian Patriots Association اور ۱۸۹۳ میں Mohammdan Anglo Oriental Defence Association of Upper India جیسی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ ان کا مقصد بھی مسلمانوں کے درمیان جدید تعلیم کو رائج کرنا اور ان کو جہالت کی گہرائیوں سے باہر نکالنا تھا۔ ذی حیثیت افراد کی نگرانی میں بننے والی ان کُل ہند تنظیموں کے علاوہ مقامی سطح پر بھی بہت سی مسلم تنظیم اس دور میں بنی تاکہ مسلمانوں کے اندر مجموعی طور پر اصلاح کی فضا بن سکے۔ ان میں انجمن اسلام، امرتسر ۱۸۸۳، انجمن اسلام، بریلی، انجمن محمدی، لکھنؤ، محمڈن ایسوسی ایشن، الور، انجمن حمایت الاسلام، لاہور، انجمن اسلام، بمبئی قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے اخبارات ورسائل نے بھی مسلمانوں کے اندر بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ رسائل تھے: تہذیب الاخلاق (۱۸۷۲)، اودھ پنچ (۱۸۸۷)، رفیق الہند، لاہور (۱۸۸۴)، پیسہ اخبار، لاہور (۱۸۸۸)۔ اس وقت مسلمانوں کے درمیان جو ذہنیت پنپی اور مضبوط ہوئی، ۲۰ ویں صدی کے وسط تک اس کے اثرات مسلمانوں پر حاوی رہے۔ ان اخبارات کے مقاصد بھی ہندو دشمنی کے کبھی نہیں رہے، لیکن جو رد عمل سامنے آیا وہ پوری طرح ہندو مخالف نہیں ہوتے ہوئے بھی ہندو مخالفت کا پہلو تو وہاں موجود تھا ہی۔

انگریزوں کے ہندستان میں مستحکم ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر جو آفت کی گھڑی آئی، وہ مسلم ہندستان یا اسلامی دنیا کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔

اس سے پہلے بغداد کے عباسیوں کے دور میں ثقافت کی بلندیوں پر پہنچے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ لیکن بربادی کے اس ملبے کے نیچے زندگی کی کچھ رمق موجود رہی، جس نے کچھ دنوں بعد اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی واپسی کی جدوجہد شروع کر دی۔ اسپین میں قرطبہ اور الحمرا کے در و دیوار مسلمانوں کی شان و شوکت کے ساتھ ان کی بربادیوں کی کہانی آج بھی سناتے ہیں۔

لیکن ابھی ہندستان کی حالت مختلف تھی۔ صدیوں کی حکومت کے بعد مسلمان یہاں ماتحتی کے دور سے گزرنے پر مجبور تھے۔ ان پر ایک ایسا تعلیمی اور سیاسی نظام تھوپا جا رہا تھا، جس کے لئے ذہنی، ثقافتی اور مذہبی طور پر وہ تیار نہیں تھے۔ یعنی مسلمان ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے، جہاں زندگی اور زندہ رہنے کے اہم سوالات کے ساتھ ان کی مذہبی اور ثقافتی شناخت کے وجود کو زبردست چیلنجوں کا سامنا تھا۔ انگریزوں کا لایا ہوا تعلیمی سسٹم، صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہوئی نئی نئی دریافتیں، سائنسی حصولیابیوں کے ساتھ عیسائی مشنریوں کی منظم پیش قدمیوں نے اسلام اور مسلمانوں پر چاروں طرف سے حملوں کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ اسی درمیان کریلے پر چڑھے نیم کو عملی جامہ پہناتے غیر مسلم برادران وطن کے بدلے تیور نے مسلمانوں کے لئے نئی پیچیدہ صورت حال پیدا کر دی۔ اس الجھی صورت حال کا مسلمانوں نے استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ایک طرف علما نے مذہبی میدان سنبھالا، تو دوسری طرف سر سید احمد خاں (۱۸۱۷۔۱۸۹۸)، امیر علی (۱۸۴۹۔۱۹۲۸) اور ان کے رفقاء کار نے نظریاتی حملوں کا جواب ان کے ہی انداز میں دیا اور مسلمانوں کو ذہنی طور سے ایک دم ٹوٹ جانے سے بچا لیا۔ ان کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کیا اور زمانے کے بدلے تیور سے مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کی۔ نئے دور کے مطالبات کو پورا کرنے کے ساتھ اپنی مجموعی پہچان کو بنائے رکھنے کے لئے اب بھی کچھ کیا جا سکتا ہے، اس کے لئے راستے ہموار کرنے کی کوششوں نے ان کو چاروں خانے چت ہونے سے بچا لیا۔

۱۸۷۱ کے بعد مسلمانوں کے اندر اپنی حالت کو سدھارنے اور نئے ماحول کے مطابق حکمت عملی اپنانے کی جو تحریک چلی تھی، وہ بہت جلد کامیاب ہوتی نظر آئی۔ ۱۸۸۵ تک مسلمانوں کا ایک تعلیم یافتہ اور بیدار طبقہ پیدا ہو چکا تھا، جس کے اندر اپنی باعزت بقا اور حقوق کو حاصل کرنے کی ذہنیت مضبوط ہو رہی تھی، اسے ہر حال میں حاصل کرنے کے لئے وہ پر تولنے لگا تھا۔ انگریز حکمراں بھی اب اپنا انداز بدل چکے تھے اور مسلمانوں کو کہیں کہیں سرکاری عہدوں پر تقرر کیا

جانے لگا تھا۔ اب وائسرائے کونسل، عوامی فلاحی اور میونسپل کمیٹیوں وغیرہ میں کہیں کہیں مسلمان نظر آنے لگے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر خوداعتمادی پیدا ہونے لگی، سیاسی شعور جاگنے لگا اور اپنی پہچان منوانے کی جستجو ان کے اندر تیز تر ہوئی۔

بمبئی پریسیڈنسی ایسوی ایشن (Bombay Presidency Association, 1876)، انڈین ایسوی ایشن (Indian Association, 1870)، پونے سارو جنک سبھا (Pune Sarvajanki Sabha, 1885)، مدراس مہاجن سبھا (Madras Mahajan Sabha, 1884) جیسی تنظیموں نے ہندستان میں وسیع بیداری کی سنسناہٹ پیدا کر دی تھی۔ A. O. Hume (1829-1912) نے پڑھے لکھے ہندستانیوں کے اندر سرکار سے نزدیکی پیدا کرنے کی ذہنیت ہموار کرنے کے لئے ایک نئی تنظیم ۱۸۸۵ میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے بنائی تھی۔ اس نئی تنظیم کی پہلی کانفرنس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ کو بمبئی میں منعقد ہوئی۔ ہیوم کی درخواست پر فیروز شاہ مہتا، کے۔ ٹی۔ طلانگ، دادا بھائی نوروجی جیسی معزز ہستیوں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس پہلی کانفرنس میں ستر (۷۰) لوگ شامل ہوئے تھے، جن میں صرف دو مسلمان تھے۔ دوسری کانفرنس کلکتہ میں ۱۸۸۶ میں ہوئی، اس میں ۳۳ مسلمان موجود تھے۔ تیسری کانفرنس، جو مدراس میں ہوئی، اس کی صدارت بدرالدین طیب جی نے کی۔ جب مدراس کانفرنس کی تیاری چل رہی تھی، بدرالدین طیب جی کو نیشنل محمڈن ایسوی ایشن کے صدر سید امیر علی نے ایسوسی ایشن کے کلکتہ اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی، تاکہ سیاسی طور پر غیر منظم مسلمانوں کے اندر اتحاد لایا جا سکے۔ بدرالدین طیب جی نے کانگریس کے اپنے صدارتی خطبہ میں واضح کیا تھا کہ مسلمانوں کو ہندستان کے مسائل کے حل کے لئے سب سے مل کر مجموعی کوشش کرنی چاہئے۔ سرسید احمد خاں کے ۵ جنوری ۱۸۸۸ کے مراسلہ کے جواب میں اپنے ۱۳ جنوری ۱۸۸۸ کے خط میں بدرالدین طیب جی نے وضاحت کی کہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کی نشوونما مؤثر ڈھنگ سے اسی وقت ممکن ہے، جب ملک کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ان کا اتحاد ہوگا۔ انہوں نے کہا ''اس میں شک نہیں کہ ہندو ہم سے زیادہ ترقی حاصل کیئے ہوئے ہیں، اور جو سرکاری سہولتیں ملیں گیں، اس سے فطری طور پر ان کو ہی زیادہ فائدہ ملے گا۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنی حالت کو بہتر بنائیں، لیکن ساتھ ہی دوسرے، جو

لائق ہیں، ان کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں کھڑی کریں۔"[۲۰۰] طیب جی نے ہیوم اور کانگریس کے توسط سے مسلمانوں کے مسائل کو اٹھانا مناسب سمجھا، ساتھ ہی ان کی یہ کوشش بھی رہی کہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے ان مسائل کو ہی اٹھایا جائے جن پر زیادہ تر ہندو اور مسلمان متفق ہیں۔ ۱۲ اپریل ۱۸۸۸ کو "پانیر" میں شائع اپنے خط میں اس مسئلہ پر انہوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔[۳] ۱۸ اپریل ۱۸۸۸ کو سر سید احمد خاں کے نام اپنے خط میں طیب جی نے وضاحت کی تھی کہ ان کا منصوبہ باہر کے بجائے اندر رہ کر اپنے فائدے کے لئے کام کرنا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو صلاح دی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، آپسی اتفاق سے مل کر کام کریں اور ایسے سوال، جو ان کے خلاف ہوں، ان کی پوری طاقت سے مخالفت بھی کریں۔ ہندستانیوں کی ترقی ہو، ساتھ ہی اپنے حقوق بھی محفوظ رہیں، اسی منصوبے کے تحت ہمیں کام کرنا چاہیے۔[۴] لیکن سر سید احمد خاں ان سے متفق نہیں تھے۔ "نیشنل کانگریس" نام پر بھی ان کا اعتراض تھا۔ ۲۴ جنوری ۱۸۸۸ کو انہوں نے طیب جی کو اپنے خط میں لکھا: کیا اسے ماننا ممکن ہے کہ ہندستان میں بسنے والے مختلف فرقوں اور مذہب کو ماننے والے ایک قوم (نیشن) ہیں یا کبھی ہو سکتے ہیں؟ کیا ان کی ضرورتیں، خواہشات اور اغراض ایک ہیں؟ میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں اور جب یہ ناممکن ہے، تو "نیشنل کانگریس" جیسی تنظیم کیا معنی رکھتی ہے۔[۵] سر سید نے اپنے نظریہ کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ہندستان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتے، لیکن مسلمان کس سے مقابلہ کریں، ان سے، جن سے وہ آگے بڑھ جانے کی حیثیت میں کبھی نہیں؟ نمائندگی کی بنیاد پر بنی سرکار کو سر سید نے مسلمانوں کی ہندوؤں کی ماتحتی مانا تھا۔ اس لئے کانگریس اور ہندستان میں آئی۔سی۔ایس۔ کا اہلیتی مقابلہ منعقد ہو، اس کی انہوں نے مخالفت کی تھی۔ اس وقت چونکہ کانگریس کی سیاست پر بنگالیوں کا دبدبہ تھا اور سرکاری نوکریوں میں بھی وہی حاوی تھے، سر سید احمد خاں اپنے تجربوں کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے یہ طریقہ مناسب نہیں مانتے تھے۔ ساتھ ہی برٹش سرکار کو بھی ناخوش نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کی ناراضگی کا خمیازہ مسلمان بری طرح بھگت چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اندر پہلے تعلیمی صلاحیت پیدا کر لیں، تب مقابلہ جاتی امتحانوں یا اقتدار کی سیاست کی الجھنوں میں پڑیں۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ کو لکھنؤ میں انہوں نے مسلمانوں کے مقابلہ جاتی امتحانوں سے متعلق رویے کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمان تو

مسلمان، مقابلہ جاتی امتحانوں سے بنگال کے سوا دوسری جگہوں کے ہندوؤں کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چونکہ انگریزی تعلیم اور انگریزوں سے بنگالیوں کی نزدیکی نے انہیں اچھی حالت میں پہنچادیا تھا، وہ مانتے تھے کہ بنگالیوں کے ہر جگہ قابض ہوجانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ بنگال میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے، لیکن وہ جاہل ہیں، غریب ہیں اور جولوگ سیاسی ہنگامہ کررہے ہیں، ان سے ان کا دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ اگر یہ اکثریتی مسلمان بھی ہنگامہ آرائیوں میں شریک ہونا چاہیں، یا وہ ہیں بھی، اور اپنے حقوق کے لئے کھڑے ہو جائیں تو کیا بنگال میں امن بحال رہ سکتا ہے؟ یہاں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ۱۸۵۷ کی بغاوت کے بعد کی پیچیدہ حالت کے باوجود سرسید اپنی عوامی زندگی میں ہندومخالف قطعی نہیں تھے اور نہ کبھی انہوں نے مسلمانوں کے مسئلہ کو ہندوؤں کے مسئلہ سے الگ کرکے دیکھا تھا۔ بعد کے دنوں میں علی گڑھ کے پرنسپل حضرات اور خاص طور سے مسٹر بیک کے وقت میں ان کی فکر بدلی اور کچھ معاملوں میں وہ ہندو اور مسلمان کی بات کرنے لگے تھے۔ سرسید نے کانگریس کی ایک تنظیم کے روپ میں اس لئے مخالفت کی، کیونکہ اس تنظیم کی آواز سرکار مخالف ہوتی جارہی تھی اور وہ دیانت داری سے چاہتے تھے کہ تاریخی واقعات کی مار جھیلے مسلمان اس میں نہیں شریک ہوں۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ انگریزی تعلیم حاصل کئے ایسے مسلمانوں کی تعداد کافی تھی، جو کانگریس میں شامل تھے اور اپنے حقوق کی حصولیابی میں اسے مددگار مانتے تھے۔ ۱۸۸۸ کی کانگریس الہ آباد میں ہوئی، اس میں ۲۵۴ مسلمان شامل ہوئے تھے، ان میں سے ۹۰ صرف الہ آباد اور لکھنؤ کے تھے۔ ۱۸۸۹ میں کانگریس بمبئی میں ہوئی، ۲۵۴ مسلمان شریک ہوئے جن میں ۱۲۵ دلّی اور یوپی کے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق پرانے عزت دار مسلم گھرانوں نے عام طور پر کانگریس سے الگ رہنے کا فیصلہ لیا تھا۔ کانگریس کی پالیسی سے سرسید تو اتفاق ہی نہیں رکھتے تھے، انہوں نے واضح لفظوں میں انتخاب کی بنیاد پر نمائندگی کی بھی مخالفت کی۔ ۱۸۸۳ کے جنوری میں انہوں نے وائسرائے کونسل میں جو خطبہ دیا تھا، وہ بہت مشہور ہے۔ یوں تو ان کا خطبہ بہت طویل ہے، مگر کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کچھ جملے کافی ہیں:

> ''الیکشن کے ذریعہ نمائندگی کا مطلب اکثریت کے مقاصد کی فوقیت اور ان کے نظریہ کی برتری کا اظہار ہے۔ ایسے ملک میں جہاں ایک نسل، مذہب اور

فرقہ کے لوگ بستے ہیں، وہاں کے لئے اس سے اچھا کوئی دوسرا طریقہ نہیں، لیکن جناب عالی...... ایسے ہندستان میں جہاں ابھی بھی ذات پات کو اولیت حاصل ہے، مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کا جہاں سب سے زیادہ فقدان ہے، جہاں مذہبی کٹر پن لوگوں میں موجود ہے، جہاں جدید تعلیم کے یکساں مواقع لوگوں کو حاصل نہیں، میں یقین کے ساتھ کہوں گا کہ الیکشن کی بنیاد پر لوکل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں مختلف نظریوں کی نمائندگی پر معاشی سے زیادہ دوسری بُرائیوں کا اثر پڑے گا۔"[6]

۱۶ مارچ ۱۸۸۸ کو میرٹھ کے اپنے خطبے میں سرسید نے تفصیل سے کانگریس، اس کی پالیسیوں اور مسلمانوں کے نظریے پر روشنی ڈالی تھی اور کہا تھا کہ صرف مسلمانوں کو ہی اس سے الگ نہیں رہنا چاہئے بلکہ یو پی کے ہندوؤں کو بھی اس میں نہیں شریک ہونا چاہئے۔ جن لوگوں نے کانگریس میں شرکت کی تھی، ان کے سلسلے میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ ان کی بھول ہے، کیونکہ اس تحریک کے مقاصد کو وہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ بنگالی، اس طبقہ کے لوگوں کو بہکا رہے ہیں، جو خود اپنے بارے میں نہیں جانتے۔ ان کے ساتھ کوئی ہندو یا مسلمان رئیس نہیں ہے۔ بدرالدین طیب جی کے سلسلے میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ مہذب اور شریف آدمی ہیں۔ ان کی اور میری سمجھ الگ الگ ہے۔ کانگریس سے ان کی یا کچھ مسلمانوں کی ہمدردی کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ تر مسلمانوں کی ہمدردی کانگریس کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت سدھارنے کے لئے سرسید کی کوششوں اور ہمدردی کا ہیوم پر گہرا اثر پڑا تھا اور کانگریس کی بنیاد انہوں نے سرسید کے اثر میں آکر ہی ڈالی تھی۔ وہ خود لکھتے ہیں سرسید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کو پڑھنے کے بعد ہی میرے ذہن میں لوگوں کے خیالات کے اظہار کے لئے ایک فورم بنانے کی بات آئی اور انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔[7] عجیب اتفاق ہے کہ اسی کانگریس کے خلاف ماحول بنانے میں سرسید لگے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کے درمیان کانگریس کی حمایت اور مخالفت کے دو الگ انداز فکر ایک ہی ساتھ مضبوط ہو رہے تھے اور پڑھے لکھے لوگ اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ سرسید احمد خاں اور جسٹس امیر علی کی جذباتی باتیں حاشیے پر پہنچے مسلمانوں کے دلوں کو چھوتی تھیں اور روز بہ روز ان کا

نظریہ ہی مقبول عام ہوتا جا رہا تھا۔ مقامی ہندوؤں کی اکثریت کے ساتھ ہندو راجا مہاراجاؤں اور زمینداروں کا مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر بھید بھاؤ کا رویہ رہا کرتا تھا، جسے لوگ پسند نہیں کر رہے تھے۔ مقابلہ جاتی امتحانوں کی بنیاد پر ملنے والی نوکریاں، اس کے ساتھ وسط ایشیائی ملکوں میں انگریزوں کی اپنائی گئی مسلم مخالف پالیسیوں کا تیکھا ردعمل پڑھے لکھے مسلمانوں کے درمیان ہو رہا تھا۔ غیر مسلم ہندستانیوں کی طرح مسلمانوں کے اندر بھی سیاسی شعور بیدار ہو رہا تھا اور وہ اپنے وجود کو منوانے کے لئے شدت پسندی کا راستہ اپنانے پر بھی آمادہ نظر آرہے تھے۔ اردو کے خلاف ہندی کی صف آرائی اور فرقہ وارانہ رنگ لئے گئوکشی مخالف تحریکوں کے سبب عام مسلمان بھی چوکنا تھے۔ اسی بیچ بنگال کی تقسیم کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ چست درست اور موثر ایڈمنسٹریشن کے مدنظر لارڈ کرزن کا منشا رہا ہو کہ بنگال کو دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے، لیکن حالات بتاتے ہیں کہ مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک ایسا خطہ بنانے کا انگریزوں کا منصوبہ تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔ اس منصوبہ کا پورے شمالی ہندستان میں شدید ردعمل ہوا۔ لارڈ کرزن کے اس منصوبے کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کی گئی اور اس کے لئے تشدد آمیز انقلابی سرگرمیوں کو بہت بڑھاوا ملا۔ بنگال اور دوسری ریاستوں میں انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا گیا اور ''سودیشی تحریک'' کو تقویت ملی۔ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ اور بہت سے پڑھے لکھے مسلمان، خاص کر وکیلوں نے، نہیں چاہتے ہوئے بھی اس ڈر سے کہ ان کے موکلوں کی تعداد گھٹے گی، اس تحریک کا ساتھ دیا۔ تقسیم کے بعد کے نئے مشرقی بنگال میں، جہاں مسلمانوں کی تعداد ۵۹ فیصد تھی، سرکاری نوکریوں اور سہولتوں کا فائدہ مسلمانوں کو ہوگا، یہ بات صاف تھی۔

تقسیم بنگال کے خلاف تحریک کے دوران عام ہندوؤں کو منظم کرنے کے لئے ہندو احیا پسندی کے نعرے لگائے گئے۔ بنکم چندر کے تحاریر میں ''وندے ماترم'' کو سیاسی پس منظر میں جس مذہبی انداز سے پیش کیا گیا، اس کا مسلمانوں پر منفی اثر پڑا۔ ''ہندستان'' کو ''کالی دیوی'' اور ''درگا ماتا'' کی طرح ''بھارت ماتا'' کے روپ میں پیش کیا جانے لگا، جس کا عام مسلمانوں کے درمیان اچھا ردعمل نہیں ہوا، لوگوں کے ذہن میں ''ہندو'' اور ''مسلمان'' ہونے کی بات جمتی چلی گئی۔ انگریزوں کی پالیسیوں کے خلاف چلی وہ تحریک، جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ساتھ ساتھ تھے، وقت گزرنے کے ساتھ اسی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ''ہندو'' اور

''مسلمان'' ہونے کی ذہنیت پختہ کردی۔ رپن اصلاحات (۱۸۸۲-۱۸۸۳) کے نتیجے میں میونسپل بورڈوں کے الیکشن کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ ماحول سب سے زیادہ خراب ہوا اور الیکشن میں مسلمانوں نے نہیں کے برابر سیٹیں حاصل کیں۔ اس لئے امرتسر، ہوشیار پور، لاہور، ملتان جیسے شہروں میں مذہبی پہچان کی بنیاد پر سیٹیں لوگوں کو دی گئیں۔

ہندستان میں سیاسی شعور بیدار ہونے کے ساتھ الجھنیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آئے دن کسی نہ کسی سوال پر ایک دوسرے سے دوری کا احساس ابھر جاتا تھا۔ انگریزوں کی کوشش رہی کہ مسلمان پوری طرح ان کے بن کے رہیں، لیکن وہ ہندوؤں کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے کہیں ہندوؤں کو تحفظ دیا، تو کہیں مسلمانوں کی پشت پناہی کی۔ اردو ہندی کے سوال پر انگریزوں کے رویئے سے مسلمان محتاط ہوگئے تھے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ انگریز صرف ان کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجتاً مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ان کے خلاف جانے کو بھی تیار نظر آنے لگی۔ اب مسلمانوں کی قیادت سرسید، امیر علی اور طیب جی جیسوں کے ہاتھ میں نہیں رہ گئی تھی۔ پرانے خیالات سے آزاد جدید تعلیم سے لیس نئی نسل میدان سنبھالنے کے لئے پر تول رہی تھی۔ اور علی برادران، سید وزیر حسن، سید حسن بلگرامی، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، حسن امام اور علی امام، مسٹر مظہر الحق جیسے لوگوں کی شخصیت ابھر رہی تھی۔ ان میں مولانا محمد علی کی، عام لوگوں کے بیچ زیادہ گرفت تھی، آگے چل کر وہ کانگریس کے صدر بھی ہوئے۔

۲۰ جنوری ۱۹۰۶ کو ہندستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ جان مورلے نے برٹش پارلیامنٹ میں کانگریس کی تجویز کردہ اصلاحوں پر غور کرنے کا اعلان کیا۔ ان تجاویز میں وائسرائے کونسل، گورنر کونسل وغیرہ میں ہندستانیوں کو شامل کئے جانے کے امکانات پر غور کرنے کے ساتھ مناسب فیصلہ بھی لینا تھا۔ اس اعلانیہ نے کانگریس مخالف مسلمانوں کے اندر حرکت پیدا کردی۔ انہوں نے جان مورلے کے اعلان کو کانگریس کی کامیابی مانا۔ اپنی سہولیتوں اور حقوق کی حصولیابی کے سوال پر وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ محسن الملک نے علی گڑھ کے پرنسپل آرک بالڈ کو ۴ اگست ۱۹۰۶ کے لکھے اپنے خط میں مسلمانوں کے ردعمل کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''اس اعلانیہ پر مسلمانوں کے بیچ کافی بحثیں ہو رہی ہیں۔ اے لوگ

کانگریس کی بڑی کامیابی مان رہے ہیں۔ پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں میں زیادہ مایوسی ہے اور ان کی کانگریس سے نزدیکی بڑھنے لگی ہے۔ پارلیامنٹ کی اس تقریر کے نتیجے میں کانگریس میں شامل ہونے کا لوگوں کو حوصلہ ملے گا۔ مجھے بہت سے خط ملے ہیں، جن میں اسمبلی میں منتخب ممبروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا اندیشہ ہے کہ الیکشن کے ذریعہ تو مسلمان اسمبلی میں آئیں گے ہی نہیں اور سرکار نے مسلمانوں کی سہولتوں کی کوئی بات ہی نہیں کی ہے۔ اگر نئے اعلانات کو نافذ کیا گیا، تو کوئی مسلمان کونسل میں نہیں آسکے گا۔"[۸]

علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر بیک مسلم سیاست میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے وائسرائے کے ساتھ ایک مسلم وفد کی ملاقات کے لئے راستہ ہموار کیا۔ ہندستان کے ۳۵ سرکردہ مسلمان کا ایک وفد پہلی اکتوبر ۱۹۰۶ کو وائسرائے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملا اور انہیں مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں ایک میمورنڈم دیا۔ اس میمورنڈم میں الیکشن کے ذریعہ کونسل اور دوسرے بورڈوں میں ہندستانیوں کے شامل کئے جانے کی منشا پر مسلمانوں کا ردعمل اور ان کے اندیشوں کی لمبی فہرست پیش کی گئی تھی۔ میمورنڈم میں فرقہ وارانہ انداز اپناتے ہوئے واضح کیا گیا تھا کہ ایک ہندو مسلمانوں کا نمائندہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ سے لے کر کونسل تک مسلمانوں کے لئے سیٹ محفوظ کردئے جانے اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ مانے جانے پر زور دیا گیا۔ لارڈ منٹو نے وفد کے ممبروں کو مسلمانوں کے لئے خاص سہولتیں اور حقوق دینے کے متعدد وعدے کئے، یقین دلایا کہ وہ اپنے فیصلے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا خیال رکھیں گے۔ اس وفد نے ہندستان کی تاریخ میں ایک ایسا نیا موڑ لا دیا، جس نے آگے چل کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کی دوری کو لگ بھگ پختہ کردیا۔

مسلمانوں کا شملہ وفد، اس کا پس منظر، اس کی بناوٹ، اس میں انگریزوں کا رول اور اس کا فائدہ اور نقصان، یہاں ایک لمبی بحث کی گنجائش ہے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا واضح کرنا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کانگریس کے خلاف جو ماحول بن رہا تھا، اس کو عام لوگوں تک پہنچانے میں شملہ وفد بہت مددگار رہا۔ مسلمانوں کی بھی ایک الگ منظم سیاسی پہچان ہو، اسے حقیقی شکل

دینے میں بھی وہ وفد مددگار بن گیا۔ وفد کے ممبروں کے سامنے لارڈ منٹو نے واضح کر دیا تھا کہ مسلمان اپنا ایک الگ اہم سیاسی وجود اور پہچان رکھتے ہیں۔ لہٰذا اپنی سیاسی پہچان کو حقیقی روپ دینے کے لئے چنندہ مسلمانوں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ کو ڈھاکہ کی نشست میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام بدل کر آل انڈیا مسلم لیگ کر دیا۔ ۱۹۰۷ میں مسلم لیگ کا آئین بنایا گیا اور فیصلہ ہوا کہ ابھی اسے ایک چھوٹی تنظیم کی شکل میں ہی رکھا جائے اور ممبروں کی تعداد صرف چار سو (۴۰۰) ہی متعین کی گئی۔ مسلم لیگ کے اخراجات کو پورا کرنے کی ذمہ داری آغا خان اور ارکاٹ کے نواب نے منظور کر لی تھی۔ مسلم لیگ پر کون کون سا طبقہ حاوی تھا، وہ کتنے فعال تھے اور اس کا عام مسلمانوں سے کیا سروکار تھا، ان کے سامنے کوئی واضح نقشہ تھا بھی یا نہیں، یہاں کہنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا واضح ہے کہ شروع کے دنوں میں خالص مسلمانوں کی پارٹی کے روپ میں مسلم لیگ کوئی اہم رول ادا نہیں کر سکی۔ مارلے منٹو ریفارم کے تحت ۱۹۱۰ میں مقامی لوکل بوڈیز ہوں یا ۱۹۱۱ میں بنگال کی تقسیم کا رد کیا جانا، مسلم لیگ نے کوئی واضح اور اہم رول ادا کیا ہو، اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن علماء کی اکثریت کی مخالفت، اندرونی اور باہری کھینچ تان کے باوجود یہ نئی پارٹی مسلم کاز کی ترجمان بننے کی کوششوں میں لگاتار لگی رہی۔ جسٹس امیر علی کی قیادت میں مسلم لیگ کے لندن برانچ نے برٹش سرکار پر دباؤ ڈالنے کے ساتھ انگلینڈ کے بااثر لوگوں کے درمیان مسلم لیگ کے نظریہ کو وضاحت سے رکھنے میں اہم رول نبھایا۔ یعنی ہندستان اور ہندستان سے باہر مسلم لیگ نے اپنی پہچان بنانے کی جو پہل کی، اس میں اسے کامیابی ملتی گئی۔

شملہ وفد کے ممبروں کی کوشش سے بنی مسلم لیگ کے سامنے مسلمانوں کے لئے فوری طور پر کچھ سیاسی سہولتوں کی حصولیابی ہی خاص مدعا تھا۔ انگریز پرست ہندوؤں کی طرح، وہ لوگ بھی انگریزی رنگ ڈھنگ پسند کرتے تھے۔ وہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندستان میں انگریزی حکومت بنی ہی رہے گی، اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے، انگریزوں کی مدد سے ہی مراعات، سہولتیں اور حقوق حاصل کئے جائیں۔ لیکن یہ ان کی بھول تھی، کیونکہ ہندستان کی اب پہلے جیسی حالت نہیں رہ گئی تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کا ایک بیدار طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ کانگریس اور دوسری تنظیموں نے بہت حد تک سیاسی بیداری لا دی تھی۔ مسلمانوں کے درمیان علماء کے سوچنے کا انداز عام طور پر الگ تھا۔ انگریز مسلمانوں کی حمایت میں ہیں اور وہ ان کی بھلائی کے بارے میں سوچیں گے، زیادہ تر

علما اسے ماننے کو تیار نہیں تھے۔ چھاپا خانے، اخبارات کی اشاعت اور آمد و رفت کی سہولتوں نے عام مسلمانوں تک علما کی باتیں کو پہنچانے میں بھی بہت مدد کی۔ مسلمانوں کے متوسط اور نچلے طبقوں کے لوگوں میں بھی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ بھی انگریزوں کی دُہری پالیسیوں کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ مغربی ملکوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت پر مذموم حملوں کا سلسلہ رُکا نہیں تھا۔ اس سے ہندستانی مسلمانوں پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا اور ماحول انگریز مخالف بنتا جا رہا تھا۔

۱۸۶۷ میں مولانا قاسم نانوتویؒ نے مذہبی تعلیم کے لئے ایک چھوٹا سا مدرسہ دیوبند میں قائم کیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ ہندستان میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی تعلیم کا مرکز بن گیا اور دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا۔ اس ادارے نے مسلمانوں کی ذہنیت بنانے میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ''دارالعلوم دیوبند'' ذہنی کش مکش میں مبتلا مسلمانوں کے لئے روشنی کا منبع بن کر ابھرا، تو مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ لکھنؤ کے فرنگی محل کے علما نے بھی مسلمانوں پر اپنی چھاپ ڈالی۔ ان مرکزوں کی بنیادی کوشش رہی کہ اسلام کے عالم گیر پیغامات سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے اور جب جب مغربی دانشوروں نے مخاصمانہ رویہ اپنا کر اسلام پر حملے کئے، اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی، تو وہیں کے علما کی مدد سے مسلمانوں نے اس کے خلاف میدان سنبھالا۔ سید امیر علی (۱۸۴۹۔۱۹۲۸)، مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴)، عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰۔۱۹۲۸)، مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴)، سید علی بلگرامی وغیرہ نے نئے سائنٹفک ڈھنگ سے اسلامی ثقافت، روایت اور انسانی خدمات پر مبنی مستند تاریخ کی کتابیں لکھیں۔ اہم مسلم رہنماؤں کی اردو اور انگریزی میں سوانح حیات شائع کر مسلمانوں کو احساسِ کمتری کا شکار ہونے سے بچایا۔ اسلام کی عالم گیر حیثیت کو دنیا کے سامنے لایا گیا اور مسلمان ایک شاندار روایت کے وارث ہیں، یہ جذبہ ان کے اندر پیدا کیا گیا۔ ایک ہندستانی مسلمان اپنے کو دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ جذباتی طور سے جڑا ہوا ماننے لگا اور اس کے اندر پان اسلامزم کا جذبہ مضبوط ہوا۔

جب ۱۸۸۱ میں ٹیونس پر فرانس نے قبضہ کر لیا، مصر کو انگلینڈ نے ۱۸۸۳ میں ہڑپ لیا، ۱۸۸۵ میں اریٹیریا بھی اس کے اختیار میں چلا گیا اور ۱۸۹۸ میں انگلینڈ نے جب سوڈان پر بھی

قبضہ کرلیا، تب ہندستان کے مسلمانوں کے جذبات کو کافی ٹھیس پہنچی۔ گریس اور ترکی کی جنگ میں جب انگلینڈ نے ترکی کے خلاف رویہ اپنایا، تو ہندستانی مسلمانوں کے درمیان بڑا تلخ ردعمل ہوا تھا۔ ترکی کی عثمانیہ حکومت سے دنیا کے مسلمانوں کا مذہبی اور جذباتی رشتہ تھا۔ وہاں کے ''خلیفہ'' کے خلاف انگریزوں نے جو رویہ اپنا رکھا تھا، وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو کافی ٹھیس پہنچا رہے تھے۔ اسی بیچ افغانستان اور انگریزوں کے رشتوں میں بڑی کڑواہٹ آگئی۔ ہندستانی مسلمانوں نے ہندستان، افغانستان سے ترکی تک انگریزوں کی اپنائی پالیسیوں کو مسلم مخالف پالیسی مانا۔ ۲۲ اگست ۱۸۹۷ کو یوپی کے لفٹنٹ گورنر سرانتھونی میکڈونالڈ نے وائسرائے لارڈ الگن کو مطلع کیا کہ عام مسلمانوں کے اندر ترکی کے تئیں ہمدردی پائی جاتی ہے اور ان کے درمیان انگریزوں کے خلاف جہاد کا جذبہ پنپ رہا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان ترکی ٹوپی کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔[9] حیدرآباد، رام پور، روہیل کھنڈ وغیرہ جگہوں میں بہت سے مسلمانوں کی گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ جولائی ۱۸۹۷ میں لکھنؤ میں حیات رسول کو مسلمانوں کے اندر انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزام میں ایک برس کی قید کی سزا دی گئی۔

۱۸۵۷ کی بغاوت اور اس کے افسوسناک نتائج کے سرسید احمد خاں چشم دید گواہ تھے۔ مسلمانوں کی دردناک حالت کو انہوں نے دیکھا تھا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان پھر اسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ ان کا ماننا تھا کہ پہلے وہ اپنی حالت سدھاریں اور سرکاری سہولتوں کی مدد سے اپنی پہچان کو مستحکم بنائے رکھیں اور پھر آگے کی سوچیں۔ بہت حد تک اپنے مشن میں انہیں کامیابی ملی۔ وقت گزرنے کے ساتھ حالت بدلی۔ ہندستان کی اب پہلی سی کیفیت نہیں تھی۔ نئے مسلم رہنماؤں کے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا۔ ان کے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے دینا انہیں پسند نہیں تھا۔ مسلم دنیا میں چل رہی پان اسلامزم کی لہر کا یہاں بھی بہت اثر دیکھا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸) کی شاعری نے مسلمانوں کے اندر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی کسک پیدا کردی، تو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی کی انقلابی تحریر اور تقریروں نے جینے کے حوصلے کا نیا ماحول بنا دیا تھا۔ مولانا آزاد کے ''الہلال'' (جو ۱۹۱۲ میں نکلا)، البلاغ اور مولانا محمد علی کے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' نے مسلم

ذہنیت پر گہرا اثر ڈالا اور ان کے اندر پان اسلامی جذبات کو مضبوط کیا۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک مذہب اور ایک ''ملت'' کے رجحان پر زور دیا جانے لگا۔ اقبال، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حسرت موہانی اور دوسرے علما کے سوچنے کے انداز بھلے ہی جداگانہ رہے ہوں، لیکن مغربی تہذیب، طور طریقوں کے ساتھ ان کے نظریات کی برتری کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا۔ سب نے اسلام کی برتری، ہمہ گیر اسلامی اقدار کی عظمت پر ہی زور دیا، مجموعی طور پر مسلمانوں کی جو ذہنیت بن رہی تھی، وہ انگریزوں کے لئے چونکا دینے والی تھی۔

بنگال کی تقسیم کے خلاف جو ملک گیر تشدد آمیز تحریک چلی، اس کے آگے سرکار جھکی اور اس تقسیم کے رد کئے جانے کی سرکاری کارروائی شروع ہوئی۔ عام طور پر علما اور مسلم رہنما اس فیصلے کے خلاف تھے۔ ان لوگوں نے اس سرکاری قدم کے خلاف آواز بلند کی۔ مشرقی بنگال اور آسام کے مسلمانوں نے اس کے خلاف منظم تحریک چلائی۔ تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال سے یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ علما اور نئے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک سنگم بن رہا ہے اور حالات کے مطابق مسلمانوں کے مسائل کو نئے انداز سے دیکھا جا رہا ہے۔ بنگال کی تقسیم کو جب رد کر دیا گیا، تو مسلمانوں نے اسے تشدد آمیز تحریک پر مبنی ہندو سیاست کی جیت مانا۔ ساتھ ہی ان کے دِلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ انگریزوں کی موجودگی اب مسلم کاز کی حفاظت کی ضمانت نہیں، ان کا یہاں سے چلے جانا ہی مسلمانوں کے حق میں ہوگا۔ نتیجتاً ہندوؤں کے ساتھ مل کر اپنے حقوق کی حصولیابی کے لئے جد وجہد کرنے کی مسلم ذہنیت بنی۔ وہی مولانا شبلی نعمانی، جنہوں نے ۱۹۰۸ء میں انگریزوں کے خلاف کھڑا ہونے سے مسلمانوں کو روکا تھا، ۱۹۱۲ میں لکھ رہے تھے کہ مسلم کاز کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ کو مؤثر ڈھنگ سے صرف کوشش ہی نہیں، کارگر قدم بھی اٹھانا چاہئے۔ مسلم کسانوں، کاریگروں اور مزدوروں کی حالت سدھارنے کی بھی ان کی کوشش ہونی چاہئے اور اس سلسلے میں ہندو ہم وطنوں کی مدد حاصل کرنی چاہئے۔[۳] مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' میں ہندو مسلم اتحاد اور مسلم حقوق کے تحفظ پر مبنی لگاتار مضامین شائع کئے۔ اسی درمیان ۱۹۱۱ میں اٹلی نے لیبیا پر حملہ کر دیا۔ ۱۹۱۱ میں ہی فرانس نے مراقش پر ہاتھ ڈالا، ۱۹۱۲ میں بلقان جنگوں نے ایک طرف عثمانی سلطنت کو یورپ کی زمین سے ختم کر دیا، تو دوسری طرف ترکی اور عربوں کے درمیان منظم طریقے سے قومیت کی مذموم فضا بنا کر نفرت کے بیج بوئے اور ان کے

اتحاد کو تتر بتر کر دیا۔ مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور ان کے معاونوں نے یوروپی سامراجی ملکوں کی ناانصافیوں پر تلخ ردعمل کا اظہار کیا۔ ''الہلال'' اور ''کامریڈ'' کے ساتھ دوسرے اخبارات نے سامراجی پالیسیوں کی کھل کر مخالفت کی۔ ۱۹۱۲ میں ہندستانی مسلمانوں نے ریڈ کریسنٹ سوسائٹی قائم کیا اور ڈاکٹر ایم۔اے۔ انصاری کی قیادت میں ایک میڈیکل مشن بلقان کے جنگی مورچہ پر عثمانیوں کی خدمت کے لئے بھیجا۔ اسی درمیان کانپور مسجد کی شہادت مسلمانوں کے مشتعل جذبات پر آگ پر گھی ثابت ہوا۔

جنگ بلقان اور اس کے نتیجے میں وسط مشرقی ایشیا میں ہونے والی سیاسی تبدیلی اور پیچیدگیوں سے ہندستانی مسلمان بڑے مشتعل تھے۔ ترکی کی عثمانی حکومت سامراجی یوروپی ملکوں کے چوطرفہ حملوں کے سبب پریشانیوں میں گھری اپنا وجود بچائے رکھنے کی جدوجہد میں مبتلا تھی۔ ہندستان کے مسلمانوں پر سامراجی ناانصافیوں کا سخت ردعمل ہو رہا تھا۔ انگریزی سرکار علما کی سرگرمیوں کو ناپسند کر رہی تھی اور ان کی تحریک کو بغاوت سے منسوب کیا جا رہا تھا۔ دیوبند کے سب سے مقتدر سربراہ مولانا محمود الحسن (۱۸۵۱۔۱۹۲۰) نے ۱۹۱۵ میں ترکوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے حجاز کا سفر کیا تھا اور وہاں کے رہنما انور پاشا اور جمال پاشا سے ملے تھے، جسے انگریزوں نے پسند نہیں کیا۔ انگریزوں کے دباؤ میں آکر مکہ کے شریف حسین نے انہیں گرفتار کر انگریزوں کے سپرد کر دیا اور انگریزی سرکار نے انہیں مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ ان کے قریبی ساتھی مولانا عبید اللہ سندھی نے افغانستان کا سفر کیا، تا کہ جرمنی اور ترکی سے رابطہ قائم کریں اور انگریزوں کے خلاف ایک متحد مورچہ بنانا ممکن ہو سکے۔ مولانا محمود الحسن نے افغانستان میں پہلی آزاد اور سیکولر ہندستانی حکومت (Government in Exile) قائم کی تھی۔ اس حکومت کے صدر راجا مہندر پرتاپ تھے، مولوی برکت اللہ وزیر اعظم اور عبد اللہ وزیر داخلہ بنائے گئے تھے۔ یہ تاریخی سچائی ہے کہ علما نے ہندو مسلم اتحاد اور حب الوطنی کی ذمہ داریوں کو ہمیشہ پوری طرح نبھایا ہے۔ آزادی کی لڑائی کے دوران بین الاقوامی مسلم یکجہتی کے ساتھ ہندوؤں سے بہتر تعلقات کا پہلو ہمیشہ ان کے سامنے رہا اور بہتر تال میل بنائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش ہوئی۔ ترکی سے جنگ شروع ہونے کے ساتھ ہی مولانا محمد علی اور شوکت علی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن ہندستان میں، جو انگریز مخالف تحریک انہوں نے چلائی تھی، وہ چلتی ہی رہی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ۱۹۱۶ میں تاریخی لکھنؤ

سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ دونوں پارٹیاں نمائندگی اور ریزرویشنوں کے سوال پر متفق ہو چکی تھیں۔ اس لئے انگریزوں کے سامنے سوال بہت الجھا ہوا تھا۔ ان کی جوڑ توڑ کی پالیسی ناکام ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اسی درمیان 1919 کے شروع میں رولٹ ایکٹ سامنے آیا۔ اس کی مخالفت میں پورا ملک یکجہتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، مسلمانوں نے اس میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کی قوت تحریر جتنی مؤثر تھی، اس سے کم ان کا انداز بیان بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اپنی تقریروں اور قلم کے زور سے مسلمانوں کے اندر زبردست جوش پیدا کر دیا تھا۔ مولانا محمد علی بہت ہی جذباتی تھے اور مولانا آزاد کی طرح ہی اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ہندستانی مسلمانوں کے اندر اسلامی یکجہتی کے جذبے کو مضبوط کرنا چاہا۔ ان کی کوشش رہی کہ اس بھائی چارہ کو قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کو ہر قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ خلافت اور بلقان جنگ کے سلسلے میں تو وہ اتنے جذباتی اور سرگرم تھے کہ نہ اپنی صحت کی فکر کی اور نہ خیر خواہوں اور وسائل کی۔ اپنے اخباروں کے ذریعہ انگریز مخالف ماحول بنایا اور مسلم اتحاد کے سوال پر وہ اتنے دور نکل گئے کہ ان کے انداز سے فرقہ واریت کی بو آنے لگی اور بات یہاں تک بڑھی کہ انہیں ہندو اور کانگریس کا مخالف مانا جانے لگا۔ پان اسلامزم کے فروغ کی آندھی میں ان کے ہندو مسلم اتحاد کی جڑیں ہلتی نظر آئیں۔ نہرو رپورٹ (۱۹۲۸-۱۹۲۹) تک پہنچتے پہنچتے علی برادران کی خاص کر مولانا محمد علی کی آواز بہت بدل چکی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تفریق کرتے لہجوں میں بولنے لگے تھے، ہر بڑے ہندو لیڈر کے اوپر ہندو مہا سبھائی رنگ انہیں نظر آنے لگا تھا اور یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ کیا یہ وہی علی برادران ہیں، جو تحریک خلافت اور عدم تعاون کے دوران تھے؟ وہ کیا وجہیں تھیں، جس نے نیشنلسٹ علی برادران اور دوسرے مسلم رہنماؤں کے رویے میں تبدیلی لا دی، اس کا غیر جانبدارانہ مطالعہ اور تجزیہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ ہماری سوچ اور کسی نتیجہ پر پہنچنے پر اس کا اثر پڑے گا۔

پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸) یوروپی ملکوں کی آپسی مخاصمت، رقابت اور سامراجی پالیسیوں کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ اس جنگ میں ترکی کی عثمانی حکومت نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ جنگ میں جرمنی اور اس کے معاون ملکوں کی شکست ہوئی، لیکن اس کی سزا عثمانی سلطنت کو زیادہ بھگتنی پڑی۔ جنگ کے نتیجے میں عثمانی سلطنت بندر بانٹ کا شکار ہوئی۔ سامراجیوں کے شرمناک

کھیل نے ترکی حکومت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا۔ اگست ۱۹۲۰ کے سیورس (Severs) کے معاہدے کے مطابق سائپرس، مصر، سوڈان اور دوسرے عرب علاقوں کو انگلینڈ اور فرانس کا تحفظ یافتہ (Protectorate) بنا کر اس کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ ترکی کے کچھ جزیروں پر اٹلی نے قبضہ کر لیا اور سمرنا گریس کے حوالے کر دیا گیا۔ اناطولیہ، ادالیہ اٹلی کے حصہ میں آیا اور سیلیشیا اور کنٹستان فرانس کی جھولی میں۔ ترکی کے سلطان انگریزوں کے ہاتھوں کے کھلونے بن کر رہ گئے۔ مکہ و مدینہ شریف حسین کے زیر اختیار رکھا گیا۔ ترکی کے سلسلے میں ناانصافیوں کا جو ننگا کھیل کھیلا گیا اور وہاں انگریزوں کی جو پالیسی رہی، ہندستان میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ ان سامراجیوں کے خلاف مسلمان متحد ہوئے۔ علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس معاملے میں ایک رائے ہو گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۸ میں فرنگی محل، لکھنؤ کے علما نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں حصہ لیا تھا اور ترکی کی حالت پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے مناسب قدم اٹھانے پر زور دیا۔ یورپ کے واقعات اور ترکی کی عثمانی حکومت کے بندر بانٹ کے پس منظر میں ۱۹۱۹ میں خلافت کانفرنس منعقد کی گئی، جہاں ہر مکتب فکر کے مسلمانوں نے شرکت کی، اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی سال دیوبند اور فرنگی محل کے علما کی کوششوں سے نومبر ۱۹۱۹ میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔ انہیں دنوں (۱۹۱۹) خلافت کے سوال پر دلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ نشست ہوئی، جس میں گاندھی جی بھی شریک ہوئے تھے۔ دلی کی اس نشست کی، ہندستان کی سیاسی تاریخ اور سماجی ہم آہنگی کے تانے بانے کو مضبوط بنانے میں، بڑی اہمیت رہی۔ مذہبی رنگ لئے مسلمانوں کے سوال کو گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے ہندستان کا سیاسی اور قومی منشور بنا کر اپنایا تھا۔ اس اہم قدم نے ہندو مسلم یکجہتی اور اتحاد کے ایک نئے مبارک دور کا آغاز کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے عہد کی کامیابی کے لئے گاندھی جی نے تحریک خلافت کو ایک اچھا موقع مانا تھا۔ خود سپردگی کے جذبے سے سرشار اس تحریک کو کامیاب بنانے میں وہ تندہی سے لگ گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہی تحریک خلافت کے سب سے بڑے رہنما مانے جانے لگے۔ رولٹ ایکٹ (Rowlatt Act) کی آڑ میں مجموعی طور پر ہندستانیوں کے سب حقوق چھین لئے گئے تھے۔ پورے ملک میں اس کی شدید مخالفت ہو رہی تھی۔ ہندستان لاقانونیت کے دور سے گزر رہا تھا۔ پنجاب میں سیف الدین کچلو اور ستیہ پال کی کوششوں سے حالت بڑی نازک بن گئی تھی۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کے

جلیاں والا باغ کے تکلیف دہ واقعہ نے پورے ہندستان میں بے چینی پیدا کردی اور گاندھی جی کے پنجاب جانے پر روک لگا دی گئی۔ پنجاب جاتے وقت دلّی کے نزدیک پلول اسٹیشن پر انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ یہ وہ خوشگوار دور ہے جب ہندو مسلم اتحاد اپنی انتہائی بلندی پر تھی۔

کلکتہ کے خصوصی اجلاس (۱۹۲۰) میں گاندھی جی کی پہل پر جب کانگریس نے تحریک خلافت کو اپنا پروگرام مان لیا تو پہلے تحریک عدم تعاون اور خلافت کمیٹی کے مقاصد مشترک طور سے ایک بنے، اس وقت سے ہندستان کی سیاسی تصویر بالکل دوسری نظر آتی ہے۔ ان دنوں ہندو مسلم اتحاد کا جو ماحول دیکھنے میں آیا، اس کی مثال ہندستان کی تاریخ میں پھر نہیں ملتی۔ تحریک خلافت مذہبی پہل تھی یا ایک سیاسی مسئلہ، گاندھی جی یا کانگریس نے خلافت کے سوال کو اپنا کر اچھا کیا یا بُرا اور غلط، یہ سوال آج بھی کئے جاتے ہیں اور اس وقت بھی کچھ لوگوں کو اس قدم پر شدید اعتراض تھا۔ اس اہم سوال پر دو نکتہ نظر اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے جذبات کا پُر خلوص احترام کیا اور اس تحریک کو ستیہ گرہی رنگ دے کر اسے تعمیری موڑ دیا۔ ایسے کئی موقع آئے، جب جذباتی علی برادران اور دوسرے مسلم رہنماؤں کے طریقہ کار کے سبب گاندھی جی کے جذبات کو کافی چوٹ پہنچی ہے، لیکن ہندو مسلم اتحاد کے لئے اس سے بہتر کوئی بدل اس وقت نہیں ہوسکتا تھا، یہ بات گاندھی جی سمجھتے تھے، اس لئے بہت کڑوا گھونٹ پینا بھی انہیں گوارہ تھا۔ گاندھی جی اور وہ ہندو، جنہوں نے خلافت جیسے مذہبی سوال پر اپنے مسلمان بھائیوں کی جدوجہد میں ساتھ دیا، انہوں نے بلاشبہ اپنی رواداری کا ثبوت دیا، جب کہ کانگریس کے ایک بڑے مسلم رہنما کی حیثیت سے مسٹر جناح نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ سیاسی معاملوں میں مذہبی مسئلوں کو نہیں لانا چاہئے۔ تحریک خلافت کے دوران گاندھی جی، مولانا محمد علی اور دوسرے بڑے رہنماؤں کے تعلقات بے حد خوش گوار اور قابل تعریف رہے۔ نتیجتاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑے گہرے رشتوں کا دور شروع ہوا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی نے گاندھی جی کے بارے میں سوامی شاردانند کو لکھا تھا: ''مہاتما گاندھی جیسے کردار کا آدمی، یہودیوں، عیسائیوں یا دوسرے کسی قوم میں نہیں ملتا۔ مہاتما گاندھی سے بہتر کسی کو میں نہیں پاتا۔''[11]

مسٹر محمد علی جناح نے مذہب کو سیاست سے جوڑنے کے گاندھی جی کے قدم کو پسند نہیں کیا تھا، تو دوسری طرف کچھ ایسے علما اور مسلم رہنما بھی تھے، جنہوں نے گاندھی جی کی رہنمائی

کو اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد پر ٹھیک نہیں مانا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ایک غیر مسلم مسلمانوں کے مذہبی معاملہ کے حل کی جد و جہد کی قیادت کیسے کر سکتا ہے؟ تحریک خلافت اور کانگریس کے بڑے رہنما مولانا محمد علی نے ڈاکٹر عبد الاحد سعید کو اپنے ۲۳ جولائی ۱۹۲۱ کے مراسلہ میں اپنے موقف کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے:

> ''جب کانگریس خلافت اور عدم تعاون کے پروگراموں کو اپنا مدعا مان کر اپنا رہی تھی، تو اس کا خاص مقصد ہندو مسلم اتحاد تھا۔ اگر مسلمان تشدد پر آمادہ بھی ہوتے، حالانکہ وہ ایسا نہیں کریں گے، تو بھی ہندوؤں کے تعاون کے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کی ہے۔ یہ ان کی سب سے بڑی طاقت رہی اور ہماری کمزوری۔ ہندوؤں کے ساتھ ہم نے اچھے تعلقات بنانے کی کوشش کی اور اس کے لئے کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑا، لیکن جب ہندوؤں سے رابطہ ہوا، ہم نے ان میں سب میں اچھا اور بہتر شخص مہاتما گاندھی کو پایا، جو امن اور عدم تشدد کے پرستار ہیں۔ وہ مذہبی انسان ہیں، مگر ان کے اندر کٹر پن نہیں ہے اور وہ مانتے ہیں کہ ہم بھی تشدد کا راستہ نہیں اپنائیں گے۔''[۱۲۰]

تشدد اور عدم تشدد کے سوال پر مولانا اور گاندھی جی کے درمیان اختلاف رائے کی پوری گنجائش تھی، کیونکہ مولانا نے عدم تشدد کو حکمت عملی کے طور پر اپنایا تھا، جب کہ گاندھی جی کی اس میں پوری عقیدت تھی۔ حالات کے مدنظر دونوں نے سمجھوتے کا راستہ اپنایا، کیونکہ گاندھی جی نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان تشدد اپنائیں یا ان کے دل میں یہ بات آئے کہ ہندو ان کے ساتھ نہیں ہیں' اور مولانا محمد علی مان رہے تھے کہ گاندھی جی کی وجہ سے ہی ہندو نیتاؤں اور عام ہندوؤں کا تعاون ان کو ملے گا۔

۸-۱۰ جولائی ۱۹۲۱ کو کراچی میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ وہاں عام اتفاق سے رائے بنی کہ فوج اور پولس کی نوکریاں مسلمانوں کے لئے اب مناسب نہیں۔ اس فیصلہ کا مطلب تھا سرکار سے ٹکراؤ۔ اس اعلان نے معاملے کو سنگین بنا دیا۔ اسی درمیان ۱۸۵۷ کی یادوں کو تازہ کرتا جمیعۃ العلما کا مشہور فتوی سامنے آیا۔ اس فتوی پر ۴۲۵ مسلمانوں کے دستخط تھے، بعد میں

۴۷۰ دستخط اور ہوئے تھے۔ سیکڑوں مسلمان گرفتار کیے گئے اور بہتوں نے افغانستان ہجرت کی، تاکہ وہاں وہ اپنی سرگرمی جاری رکھ سکیں۔ علی برادران کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ گاندھی جی ان کی گرفتاری پر ۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ کو ایک بیان دیا کہ اگر وہ کراچی خلافت کانفرنس میں موجود ہوتے، تو وہ بھی علی برادران کی حمایت کرتے۔ ۱۴ اکتوبر کو خلافت کمیٹی کی بمبئی میں ایک نشست ہوئی اور اسی تجویز کی تائید کی گئی، لیکن سرکاری نوکریوں میں رہنے، نہ رہنے کا سوال ذاتی فیصلہ پر چھوڑ اگیا۔ کانگریس کی اے۔آئی۔سی۔سی۔ نے بھی اس کی تائید کی اور ستمبر ۱۹۲۱ میں سرکاری نوکریوں کو چھوڑنے، اسکول، کالج اور وکالت کے بائیکاٹ کی اپیل کی گئی، جس کی وجہ سے نئی ملک گیر صورتحال پیدا ہوئی۔

۱۹۲۱ کے ابتدائی دنوں سے ہی علی برادران اور گاندھی جی کے تعلقات کی گرم جوشی میں کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہندستانی جہادی، جو افغانستان ہجرت کر گئے تھے، ان کے تعاون سے افغانستان ہندستان پر حملہ کرے گا اور اگر افغانی ہندستان پر حملہ کرینگے، تو یہاں کے مسلمان ان کا ساتھ دینگے، ایسی باتیں ہوا میں گردش کر رہی تھیں۔ گاندھی جی کے لئے یہ حالت بہت ہی پریشانی کی تھی، کیونکہ ہندوؤں کی اکثریت ایسی باتوں سے متفکر تھی اور ان کے ذہن میں وہی ''غزنوی'' اور ''غوری'' کے حملوں کی تکلیف دہ یادیں ابھر آتی تھیں۔ اس لئے شبہات اور غلط فہمیوں کے ماحول میں رشتوں میں گرم جوشی کی کمی کا ماحول ہندوؤں کے بیچ بنا۔ وہ گھڑی گاندھی جی کے لئے سخت امتحان کی گھڑی تھی۔[۳] پہلے لکھا جاچکا ہے کہ تحریکِ خلافت کی قیادت ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہو، اس نکتہ پر کچھ مسلمان کے درمیان چہ میگوئیاں چل رہی تھیں اور اب ہندو بھی اس ذہنی میلان کے شکار نظر آتے ہیں، خلافت مسلمانوں کا مسئلہ ہے، ہندوؤں کا اس سے کیا لینا دینا؟

بہار، یوپی، اڑیسہ اور بنگال کے پچاس جید علما نے خلافت اور مسلم مقاصد کے سوال کو پوری مستعدی سے اٹھانے کا عہد کیا۔ مولانا آزاد اور مولانا آزاد سبحانی کی تائید بھی انہیں حاصل تھی۔ اسی درمیان اپریل ۱۹۲۱ کی میرٹھ خلافت کانفرنس کے اجلاس میں ہندو قیادت کے سوال پر لوگ کھل کر مخالفت میں سامنے آگئے۔ مولانا محمد علی ہندوؤں اور مسلمانوں اور خاص کر گاندھی جی اور مسلمانوں کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جب

تک گاندھی جی کی قیادت حاصل ہے، مسلمانوں کو کوئی پُر تشدد قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔ وہ جیل میں بند تھے اور میرٹھ خلافت کانفرنس میں جو باتیں اٹھائی گئیں، ان کو پسند نہیں تھیں۔ ۲۱-۲۴ ستمبر ۱۹۲۱ کو دلّی میں حکیم اجمل خاں کی رہائش پر جمعیۃ العلما اور خلافت کمیٹی کی مشترکہ نشست ہوئی، جہاں علی برادران کی گرفتاری کے ساتھ پوری حالت کا تجزیہ کیا گیا۔ ۵ اکتوبر کی کانگریس کی مجلس عاملہ کی بیٹھک میں مولانا آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، آزاد سبحانی، مولانا حسرت موہانی وغیرہ نے دوبارہ فوجیوں سے سرکاری نوکری چھوڑنے کی باتیں کیں۔ اس نشست کے سلسلے میں سی۔آئی۔ڈی۔ نے حکومت کو رپورٹ دی تھی کہ خطرناک ابوالکلام آزاد کی قیادت میں علمانے پر زور سول نافرمانی چلانا طے کیا ہے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ سرکار کو کچھ موقع دینا چاہئے، تاکہ غیر ملک میں تعینات ہندستانی فوجیوں کے بارے میں وہ کوئی مناسب متبادل ڈھونڈ سکے، ہندستانی فوجی اپنا استعفیٰ دے سکیں، لیکن آزاد سبحانی اور مولانا عبدالباری نے ان کی باتوں کو نہیں مانا۔ بمبئی کے گورنر نے ۵ نومبر ۱۹۲۱ کے اپنے خط کے ذریعہ ای۔ ایس۔ مانٹگو کو مطلع کیا کہ آئندہ احمد آباد کانگریس میں گاندھی جی پر ستیہ گرہ شروع کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جائے گا، حالانکہ وہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کچھ مسلمان گاندھی جی سے کافی ناراض ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ مسلم رہنما تو جیلوں میں بند ہیں اور وہ آزاد ہیں۔ گاندھی جی نے صفائی دی تھی کہ وہ آزاد ہیں، اس میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ دوسروں کی طرح وہ بھی سرگرم ہیں اور جیل جانے میں بھی انہیں اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ گرفتار نہیں کئے جاتے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ کے ماحول میں شدید بکھراؤ کی حالت بن رہی ہے۔"[۱۴] بدلتی ہوئی حالت سے واضح ہو رہا تھا کہ تحریک عدم تعاون اور خلافتی مسلمانوں کا ساتھ زیادہ دنوں تک نہیں چل پائے گا۔

خلافت کے مذہبی مسئلہ ہونے پر جمعیۃ العلما، خلافت کمیٹی اور دوسری مسلم تنظیموں کی اصولی بنیادوں کو مولانا آزاد کی کتاب ''مسئلہ خلافت'' نے ٹھوس نظریاتی بنیاد مہیا کی تھی۔ یہ حقیقت سامنے آ گئی تھی کہ مسلمان ہندستان کی آزادی کے ساتھ اپنی مسلم قومی شناخت کو اسلامی دنیا کے ساتھ جوڑنے کی اہمیت پر بھی زور دے رہے تھے۔ مسلمانوں کی جو ذہنیت بن رہی تھی، اسے اصولی طور پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اسلام ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ لیکن ہندستان کے حالات کے مدنظر، خاص کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو دوری کی ذہنیت

ابھر رہی تھی، اس نے آگے چل کر بہت سی پیچیدگیاں پیدا کیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ۱۹۱۶ میں ہوئے معاہدوں کے تحت الگ مسلم نمائندگی کی بات کو مان لیا گیا تھا اور متعدد مسائل پر متفق ہونے کے باوجود ''ہندو'' اور ''مسلمان'' الگ ہیں، والی ذہنیت کو ہی تقویت مل رہی تھی۔

دسمبر ۱۹۲۱ میں احمد آباد میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس ہوئے تھے۔ کافی مخالفت کے باوجود مولانا حسرت موہانی نے ''عدم تشدد'' کی مخالفت کی تجویز ۲۷ تاریخ کو مرکزی کانگریس کمیٹی میں پیش کر دی، جو ۵۲ کے مقابلے ۲۰۰ ووٹ سے رد کر دی گئی۔ اسی دن خلافت کمیٹی کی نشست میں بھی مولانا موہانی نے دوبارہ اپنی بات منوانے کی کوشش کی، لیکن صدر حکیم اجمل خاں نے اسے نامنظور کر دیا۔ کانگریس کے کھلے اجلاس میں مولانا نے یوپی کے احباب کی مدد سے پھر کوشش کی، مگر گاندھی جی کے مدلل جواب سے وہ رد ہوا۔ لیکن مولانا نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ ۳۰ دسمبر کی مسلم لیگ کی سبجیکٹ کمیٹی کے سامنے دوبارہ اس سوال کو اٹھایا گیا، جو ۲۳ کے مقابلے ۳۶ ووٹوں سے رد ہو گیا۔ مولانا چپ نہیں بیٹھے۔ انہوں نے کچھ علما کو اپنا حمایتی بنا لیا تھا۔ یہ بحث ابھی چل ہی رہی تھی کہ چوری چورا کے واقعہ (۵ فروری ۱۹۲۲) کے ردعمل میں گاندھی جی نے تحریک سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان نے بم کا کام کیا، خلافتیوں کی ایک بڑی تعداد نے اس اعلان کو مسلم مقاصد کے خلاف مانا۔ خود گاندھی جی کے متعدد رفقائے کار نے بھی اس التوا کو پسند نہیں کیا، اس کی مخالفت کی۔ لیکن گاندھی جی اپنے فیصلہ پر اٹل رہے اور واضح کرتے رہے کہ ہندستانیوں کا ذہن عدم تشدد اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ابھی تیار نہیں ہے۔ ۲۵۔۲۶ فروری کو دلی میں خلافت کمیٹی کی نشست ہوئی۔ وہاں سول نافرمانی کو ملتوی کئے جانے پر کافی بحثیں ہوئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ خلافت کے سوال پر اسے جاری رکھا جائے۔ اسی سلسلے میں اجمیر میں جمعیۃ العلما کی ایک میٹنگ مارچ میں مولانا حسرت موہانی اور عبدالباری فرنگی محلی کی کوششوں سے ہوئی۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ خلافت کمیٹی بغیر ہندوؤں کے تعاون کے سول نافرمانی جاری رکھے، مگر گاندھی جی احمد آباد سے اجمیر پہنچے اور ہندوؤں سے الگ ہو کر کارروائی جاری رکھنے سے لوگوں کو روکا اور حسرت موہانی کے ساتھ احمد آباد لوٹ گئے تاکہ کوئی تفصیلی خاکہ تیار کیا جا سکے۔ اسی رات ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ کو گاندھی جی کو

گرفتار کر لیا گیا۔

جب کسی وجہ سے رشتوں میں تلخی آجاتی ہے، تو غلط فہمیاں اور کمیونیکیشن گیپ تل کا تاڑ بنا دیتا ہے۔ یہی کچھ ہوا کیرل کے موپلا کسانوں کی تحریک کا حشر۔ ہندو زمینداروں کے خلاف موپلا مسلمان کسانوں کی جدوجہد کو فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے مصنفوں اور مورخوں نے فرقہ وارانہ رنگ میں پیش کیا۔ اگست ۱۹۲۱ میں کیرل کے موپلوں کی بغاوت کی بات سامنے آئی تھی اور مالابار کے علاقے میں فرقہ وارانہ فسادات نے بڑا تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ ہندوؤں کی بزور طاقت مذہب تبدیلی اور ہندو عورتوں پر کیئے گئے مظالم کی کہانیوں نے عام ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندر تو کڑواہٹ پیدا کی ہی، بڑے نیتاؤں کے درمیان بھی کافی تشویش پیدا کیا۔ احمد آباد کانگریس میں اس افسوس ناک واقعہ پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کانگریس صدر حکیم اجمل خاں نے اس کی مذمت کی، جب کہ وہیں مولانا حسرت موہانی نے موپلا واقعہ سے متعلق مذمت کی تجویز کی سخت الفاظ میں مخالفت کی۔ جذباتی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو دوری پیدا ہو رہی تھی، احمد آباد میں یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی۔

احمد آباد کانگریس اجلاس میں خلافت اور مکمل سوراجیہ کے سوالوں پر جذباتی مولانا حسرت موہانی، ان کے حمایتی علما اور گاندھی جی کے نظریات میں اختلاف ابھر کر سامنے آگیا تھا، لیکن گاندھی جی کی صلح صفائی کی پالیسی کے سبب مسئلہ زیادہ الجھا نہیں۔ لیکن دو مخالف نظریوں کا ساتھ ساتھ چلنا ایک صحت مند رجحان سا نہیں تھا، آج نہ تو کل دو راستے متعین ہونگے، یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ احمد آباد کانگریس اجلاس کے بعد تحریک میں کافی تیزی آگئی تھی۔ ہزاروں لوگ گرفتار کیئے گئے اور ایسا لگا کہ ہندستانی غلامانہ ذہنیت سے آزاد ہو چکے ہیں، لوگوں کے اندر سرفروشی کی تمنا پوری طرح جاگ گئی ہے اور انگریز حکمرانوں کا دم خم نکل گیا ہے۔ بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس ہوئی، جہاں مسٹر جناح اور مدن موہن مالویہ بھی شریک ہوئے تھے۔ یہاں علی برادران اور دوسرے رہنماؤں کی رہائی کی شرط کے ساتھ سرکار سے بات کرنے کا فیصلہ لیا گیا اور عارضی طور سے تحریک ملتوی کی گئی، لیکن سرکار نے ان مطالبات کو نہیں مانا۔ نتیجتاً تحریک پھر شروع ہوئی اور باردولی ستیہ گرہ کی دوبارہ زوردار تیاری شروع کی گئی۔ لیکن ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ کو گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ سرکار کی ہدایت پر ان کی بیرسٹری کی ڈگری رد کر دی گئی۔

گاندھی جی کی گرفتاری سے مایوسی کا ماحول کچھ دنوں کے لئے رہا، لیکن عام لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کی جو چاہت پیدا ہو چکی تھی، وہ مایوسیوں کے گھنے کُہرے کے باوجود زندہ رہی۔ نئے جوش کے ساتھ نئی چنوتیوں کا مقابلہ کرنے کی تیاری میں لوگ لگ گئے۔

سرکاری پالیسیوں کے خلاف مضمون لکھنے کے جرم کی سزا گاندھی جی جیل میں بھگت رہے تھے اور پورے ملک میں سول نافرمانی کو ملتوی کئے جانے پر بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا۔ اسی دوران ہندو مسلم اتحاد کی دنیا میں زبردست بھونچال آیا، ہندستان کے بڑے حصے میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ میں ملتان، جولائی ۱۹۲۳ میں پانی پت اور ریواڑی اسی سال امرتسر، مرادآباد، میرٹھ اور الہ آباد میں فرقہ وارانہ فسادات نے سماجی خیر سگالی کے تانے بانے کو برباد کر دیا۔ گونڈا، جبل پور، آگرہ، سہارنپور اور رائے بریلی میں بھی اسی سال اگست ستمبر میں ہندو اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیلی۔ ۱۹۲۴ کے اپریل اور اکتوبر کے بیچ ہاپڑ، دلّی، لاہور، لکھنؤ، مرادآباد، بھاگل پور، شاہ جہاں پور، الہ آباد اور کوہاٹ میں زبردست فساد ہوئے۔ ۱۹۲۶ کی فروری اور ۱۹۲۷ کے جون میں لاہور میں دوبارہ ہندو مسلم اتحاد کا دامن تار تار کر دیا گیا۔ ان واقعات نے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد کو پوری طرح ہلا کر رکھ دیا اور یہ صاف ہو گیا کہ خلافت اور تحریک عدم تعاون کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو اتحاد قائم ہوا تھا، وہ جذباتی لمحے تھے، وہ کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں تھا۔ شدھی، سنگھٹن اور تبلیغ جیسی تحریکوں کی آڑ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے کھل کر ایک دوسرے پر حملے اور جوابی حملے کئے۔ قابل مذمت کتاب ''رنگیلا رسول'' کے مصنف راج پال کو ۱۹۲۴ میں لاہور میں اور ۱۹۲۶ میں دلّی میں دلّی کی جامع مسجد سے مسلمانوں کو خطاب کرنے والے سوامی شاردانند کو قتل کر دیا گیا۔ اور ڈاکٹر کچلو جیسے ترقی پسند آدمی تبلیغ پر اتر آئے۔ یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کے کسی گوشے میں پوشیدہ شکایت، آپسی رنجش اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ چکی تھی اور مستقبل پر نظر رکھنے والا آدمی اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی یہی کھینچا تانی ملک کو کہاں لے جانے والی ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد ہل جانے سے دونوں فریقوں کے فرقہ وارانہ عناصر کو بڑی تقویت ملی۔ علما نے دیش بھکتی کا جو خاکہ تیار کیا تھا یا کانگریس کے قدآور نیتاؤں کے پاس جو نقشہ تھا، وہ شبہات کے گھنے کُہرے میں دھندلا گیا۔ انگریزی سرکار نے صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

حالت کو مزید الجھا کر ایسی جگہ لا کھڑا کیا، جہاں آگے ناامیدی ہی ناامیدی موجود تھی۔

جیل میں گاندھی جی بیمار پڑ گئے اور پونے کے ساسون اسپتال میں ان کے اپنڈکس کا آپریشن ہوا۔ اس بیماری کے سبب انہیں ۵ فروری ۱۹۲۴ کو رہا کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں کی صلاح پر وہ آرام کرنے کے لئے بمبئی چلے گئے۔ جیل سے باہر آکر انہوں نے ہندستان کی حالت بالکل بدلی ہوئی پائی تھی۔ ان کے اصولوں کو لوگوں نے بھُلا دیا تھا اور ہندو مسلم اتحاد کی حالت سب سے زیادہ نازک اور پریشان کن تھی۔ لوگوں کے اندر صحیح شعور پیدا کرنے کی غرض سے انہوں نے "Young India" میں لگاتار مضامین لکھے۔ وہ اسی پر رُکے نہیں، ۱۷ ستمبر سے ۸ اکتوبر ۱۹۲۴ تک ۲۱ دنوں کا اُپواس (برت) رکھا، تاکہ صدیوں سے ساتھ رہنے والے ہندو اور مسلمان کم سے کم مہذب سماج کے ایک فرد کی طرح رہ تو سکیں۔ پورے ملک میں اس کا اچھا اور مثبت اثر پڑا اور آپس میں مل بیٹھ کر مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوشش کا ماحول بنا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ کو موتی لال نہرو کی صدارت میں ملاپ کانفرنس دلّی میں منعقد ہوئی۔ امن و سکون کا ماحول بنانے کے لئے مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور سوامی شاردا نند نے لوگوں سے امن بحال رکھنے کی اپیل کی، اس کا بھی اچھا اثر دیکھنے میں آیا اور فسادات کے اسباب، گئوکشی اور مسجد کے سامنے اکثریتوں کے ذریعہ جلوس اور ہنگاموں کے سلسلے میں احتیاط برتنے پر اتفاق ہوا۔

ہندستانی سماج کی پلورل بناوٹ اور صدیوں پرانے نظریوں پر مبنی روایتی پیچیدگیوں سے نجات پانے کی کوششوں کے نتیجے میں ٹوٹ رہے روایتی نظام، کمزور ہوتا صحت مند مشترکہ خاندان کا تصور اور سکڑتی ہوئی دنیا کے پس منظر میں، جب یہاں کی آزادی سے پہلے کی حالت کو دیکھتے ہیں، تو تعجب ہوتا ہے، ساتھ ہی کئی اہم سوال بھی سامنے آتے ہیں۔ ہندستانیوں کی بے پناہ صلاحیتوں کا کیوں صحیح نہج پر استعمال نہیں ہوا؟ کیوں یہاں کے وسائل کا استعمال تعمیری کاموں کے بجائے ملک کو کمزور کرنے والے کاموں میں ہوا؟ مسلمان خود مسجدوں کے سامنے باجا بجاتے رہے ہیں، طرح طرح کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں، اکھاڑے اور جلوس نکلتے ہیں، نہ آذان کا خیال ہوتا ہے اور نہ مسجدوں کے احترام اور نماز کے وقت کا۔ ہندو گائے کے نام پر مذہبی نظریہ سے نظریں ضرور جھکا لیتے ہیں، لیکن زندگی کی بھاگ دوڑ اور مسائل سے جوجھتے لوگوں کا گایوں سے جذباتی لگاؤ نہیں کے برابر دکھائی دیتا رہا ہے، اپنے فائدے کے مدنظر نیتا لوگ ہندوؤں کے

مذہبی جذبات کو ابھارتے رہے ہیں، انہیں گمراہ کیا ہے۔ ہندستان کی دو خاص اکائیوں کے اختلافات کی انہیں ہی فوری وجہ مانی گئی ہے۔ ملک کے سب بڑے نیتا انہیں ہی مرکزی نکتہ بنا کر بحثیں اور نشستیں کر رہے تھے، فرقہ وارانہ مسئلوں کا حل ڈھونڈنے کے لئے وہ کوشاں رہے۔ قاضی عدیل عباسی نے اُن دنوں منعقد ایک کانفرنس کی کارروائی کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بڑا ہنگامہ اس دن ہوا، جب گائے کی قربانی کا مسئلہ پیش ہوا۔ سب مسلمان خاموش تھے۔ پٹیل لنگوٹی (تہبند) پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا میں بھی ہندو ہوں، گائے میرے لئے متبرک اور قابل پرستش ہے، لیکن مسلمانوں کو اس میں یقین نہیں ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ گائے کے بارے میں ہم اپنا عقیدہ مسلمان بھائیوں پر زبردستی تھوپیں، البتہ اگر وہ خود برضا و رغبت اسے چھوڑ دیں، تو بہتر ہے۔ اس کے بعد لالہ لاجپت رائے کھڑے ہوئے۔ لالہ جی نے گئوکشی پر مکمل طور سے روک لگانے کی تجویز پیش کی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے ایسی سلیس اردو میں تقریر کی کہ ہم سب حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ بیچ کا راستہ اچھا ہے، جہاں جہاں قربانی ہوتی ہے، وہاں ہندو رکاوٹ نہ ڈالیں اور نہ قانونی پابندی لگائی جائے۔ لیکن جہاں قربانی نہیں ہوتی ہے، وہاں مسلمان نئے سرے سے گائے کی قربانی نہ کریں...... مفتی کفایت اللہ نے بڑی مدلل تقریر کی اور گائے ذبح کرنے کی پوری آزادی کی مانگ کی۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ مسلمان گائے ذبح کرنا بالکل بند کردیں...... دوسرے دن میں نے دیکھا کہ پنڈت مالویہ جی مولوی کفایت اللہ صاحب سے کہہ رہے تھے کہ مولانا، ذرا غور کیجئے، اس پر نظر ڈالئے کہ ہم ہندوؤں کے جذبات گائے کے بارے میں کیا ہیں، پھر بھی ہم اس پر تیار ہیں کہ جہاں گائے کی قربانی ہوتی ہے، وہاں ہو اور اس پر بھی تیار ہیں کہ قانون کے ذریعہ اسے روکا نہیں جائے۔ جب ہم اس حد تک جھک رہے ہیں، تو آپ بھی اپنی جگہ سے ہلئے۔ بھلا آپ کو اس میں کیا دشواری ہے کہ

آپ یہ مان لیں کہ جہاں نہ ہوتی ہے، نہ ہو۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں آج تک گائے کی قربانی ہوئی ہی نہیں ہے، صرف انہیں جگہوں پر آپ اپنی مرضی اور خوشی سے آئندہ بھی نہ کریں۔ قاضی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب پہلے تو اڑے، مگر اڑنے کی گنجائش کہاں تھی! آخر میں مان گئے اور پنڈت مالویہ کی تجویز پاس ہوگئی۔ افسوس ہے کہ بعد میں کوئی اس پر قائم نہیں رہا اور شاید اس عہد کو توڑنے کی پہل مسلمانوں ہی نے کی۔''[۱۵]

واقعات کے سلسلے پر اگر غیر جانب داری سے غور کیا جائے، ان کا تجزیہ کیا جائے، تو وہ مسائل جو اس وقت آزادی سے پہلے اختلاف کی جڑیں مانے جاتے رہے، یعنی گائے کی قربانی، مسجدوں کے سامنے باجے بجانا وغیرہ، تو وہ سب سطحی باتیں معلوم ہوں گی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کی جڑیں کچھ اور ہی رہی ہیں، جو کافی گہری ہیں۔ اتحاد کی منزل پر پہنچنے کی کوششوں میں وہی مشکلات پیدا کرتی رہی ہیں، گائے اور باجے تو محض بہانے رہے ہیں۔ انگریزی سرکار نے ہر ممکن طریقہ سے ان اختلافات کو بڑھایا، انہیں اچھالا اور جہاں کوئی تنازع کی چیز نہ بھی رہی ہو، تو وہاں تنازعوں کو پیدا کیا۔ کبھی ہندوؤں کی حساس رگوں کو اس نے چھیڑا، تو کبھی مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر دیا، تاکہ دونوں کی اپنی اپنی پہچان کا ٹکراؤ انہیں مشترکہ منزل پر پہنچنے ہی نہ دے۔ اپنی کوششوں میں انگریزی سرکار کامیاب رہی۔ اس نے ایسے ایسے فرضی افسانے گڑھے، جسے صحیح مان لینے میں کسی کو اعتراض ہی نہیں ہوا۔ نتیجتاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ اختلاف کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور صدیوں سے ایک ساتھ رہنے کے باوجود بہتوں کے اندر یہ ذہنیت پیدا ہوگئی کہ وہ اب ایک ساتھ رہ ہی نہیں سکتے۔ انگریزی نظام اور اس کے پروردوں نے اپنی کوششوں سے یہ بات ان کے ذہن میں بھر دی کہ آپس میں مل بیٹھ کر اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی صلاحیت ہی ان کے اندر نہیں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ انگریزوں کی جوڑ توڑ کی پالیسیوں نے ہندستانیوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کیے۔

عوامی بے چینی اور انگریز مخالف تحریک جس تیزی سے سرگرم ہوئی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کی دوری بھی اسی رفتار سے بڑھتی گئی۔ انگریزوں نے حالات کے مدنظر ایسے قدم اٹھائے، جو ظاہری طور پر فلاحی نظر آتے رہے، لیکن آخر کار اس کے نتیجے کے طور پر

ہندستانیوں کو نقصان ہی ہاتھ لگے۔ دنیا کی بدلتی سیاسی حالت کے پس منظر میں انگریز اپنے سامراجی شکنجوں کو ڈھیلا کرنے پر مجبور تھے، لیکن جو قدم اٹھائے، وہ ایسے تخریبی مسئلے ثابت ہوئے، جس نے آگے چل کر ہندستان کو ہی توڑ کر رکھ دیا۔ مارلے منٹو سُدھار ہو یا چیمس فورڈ، اس نے ہندستانیوں کے بیچ اختلاف کی جڑوں کو ہی سینچا، صحت مند اور تعمیری بنیاد پر ہندو مسلم رشتوں کو پنپنے ہی نہیں دیا۔ ہندستان اور برما کی کمیٹی کے نائب صدر اور اعزازی سکریٹری میجر گراہم پول نے ہندستان کی حالت میں بہت دلچسپی لی تھی، اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''پارلیامنٹ کے دونوں ایوانوں میں مانٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ پر بحث کے دوران ہم میں سے کئی لوگوں نے فرقہ وارانہ بنیاد پر حق رائے دہندگی کے سلسلے میں اپنا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور واضح کیا تھا کہ اس سے ہندستان کے سیاسی ماحول میں کڑواہٹ پیدا ہوگی۔ ہماری پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی، کیونکہ ۱۹۲۶۔۱۹۲۷ کی سرکاری رپورٹ میں سرکار نے یہ تسلیم کیا کہ ایک خالص جمہوری سرکار جہاں اکثریت کے نظریہ کو برتری حاصل ہوا کرتی ہے، وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہندو اور مسلمان کے روپ میں الگ الگ نظریہ اپنانے پر مجبور کرنا، ان کی ہمت افزائی کرنی، روایتی دشمنی کو بڑھاوا دینا ثابت ہوا۔''

اسی سرکاری رپورٹ کی بنیاد پر وہ آگے کہتے ہیں:

''جمہوری اقدار پر مبنی ترمیم شدہ ہندستانی آئین کے مطابق دو مقابلے پر آمادہ اکائیوں کو آمنے سامنے لا کھڑا کر دینے سے ان کی آپسی دوری بڑھی، فرقہ وارانہ تناؤ بڑھا اور وہ کافی مضبوط ہوتا گیا۔ اگر آئرلینڈ یا کارڈف میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نظریوں کی بنیاد پر چناؤ کرایا جائے، تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے، ہم سوچ سکتے ہیں۔ اب ذرا اسی نظر سے ہندستان کا اندازہ لگائیں کہ فرقوں کی بنیاد پر الیکشن یہاں کیا معنی رکھتا ہے۔''[۱۶]

گراہم پول کے شبہات کو سر راماسوامی ایّر نے زیادہ واضح کرتے ہوئے کہا تھا:

"فرقہ وارانہ بنیاد پر اختیارات کا منظور کیا جانا کتنی بُرائیوں اور الجھے سوالوں کو جنم دے گا، اس کا ایک غیر جانب دار شخص آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے۔ اگر فرقوں کی بنیاد پر کچھ اختیار ایک فرقہ کو دیا جائے گا، تو بہت سے فرقوں کے درمیان اپنے حقوق کے مطالبات کو تقویت ملے گی۔"[۱۷]

دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستان جیسے مختلف مذاہب اور فرقوں والے ملک کے لئے غیر مناسب بنیاد پر ایسے متبادل کو قانونی شکل دینے کی وہ کوشش تھی، جو آگے چل کر بھانومتی کا پٹارا ثابت ہوگا، یہ واضح تھا۔ گراہم پول آگے لکھتے ہیں:

"ایک ایسی غیر ملکی سرکار، جس کے ہاتھوں میں دولت، مرتبت اور آسائشیں فراہم کرنے کے اختیار ہوں، اس کی موجودگی میں فرقہ وارانہ بنیاد پر حق رائے دہندگی کے نظام نے فرقہ واریت اور گروہ بندی کو بڑی تقویت پہنچائی۔"[۱۸]

انگریز حکمرانوں نے ہندستان میں شروع سے جو رویہ اپنا رکھا تھا، اسے کسی طرح ہمدردانہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس کا خاص مقصد ہندستانی وسائل کا سب سے زیادہ استحصال کرنا رہا اور اس کوشش میں انہوں نے ہندستانیوں کی جہالت، پچھڑاپن، ناخواندگی، آپسی مخاصمت اور سماجی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور جاتے جاتے زہر کے کچھ ایسے پودے لگا دیے، جن کے خطرناک نتائج پتا نہیں کتنی صدیوں تک ہندستانیوں کو الجھائے رکھیں گے۔ گاندھی جی نے آزادی کی لڑائی کے دوران جو نظریہ اپنایا تھا، وہ انگریزی نظام کے خلاف تھا، وہ انگلینڈ کی عوام کے خلاف قطعی نہیں تھا، کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ حکمرانوں نے جو رویہ یہاں اپنایا تھا، اس میں وہاں کی عام جنتا کی مرضی بھی رہی ہو، اس میں ہمیں شبہ ہے۔ جمہوریت میں الیکشن کے بعد پالیسی بنانے میں ووٹروں کا کوئی رول نہیں رہ پاتا۔ انگلینڈ میں ہندستانی نظریہ اور یہاں کی آزادی کی لڑائی کی تائید کرنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی، وہ سرکاری پالیسیوں کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں گراہم پول سرِ فہرست تھے۔ اپنے خیالات کو وضاحت سے رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"ہم لوگوں نے بار ہا سنا ہے کہ ہم انگلینڈ والے کروڑوں بے زبان ہندستانیوں کے ضامن ہیں۔ ایک ضمانت دار کی ذمہ داری ہے کہ اپنے

ماتحت لوگوں کی بھلائی کو ترجیح دے اور جو ضمانت دار ایسا نہیں کرتا، اسے دھوکہ دہی کا مجرم مانا جاتا ہے۔ ہندستان کا وائسرائے یا ہندستانی سرکار ہندستانیوں کے ضمانت دار نہیں، انگلینڈ کے شہری اور ووٹر ان کے حقیقی ضامن ہیں۔ یہ افسران انگلینڈ کے ووٹروں کے فقط خادم ہیں اور ان کے اٹھائے قدموں کے ہم ذمہ دار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے ایک ضمانت دار کا فرض نبھایا ہے؟ ہم میں سے کتنوں نے ہندستانی نظریہ سے ہندستانیوں کے مسائل کو دیکھنے کی کوشش کی ہے؟ ہم میں سے کتنوں نے سوچا ہے کہ انگلینڈ کی سرکار کا ہر ایک قدم ہندستانی عوام کی بھلائی کے خیال سے اٹھے، نہ کہ انگلینڈ کے تجارتی مفاد اور حکام کا تحفظ ان کا مقصد ہو۔"[۱۹]

دسمبر ۱۹۲۴ میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں بلگاؤں میں کانگریس اور سیف الدین کچلو کی صدارت میں خلافت کانفرنس کے اجلاس ہوئے۔ بلگاؤں کانگریس پنڈال میں ہی ہندو مہاسبھا کی کانفرنس پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ہوئی تھی اور بہت سے کانگریسی نیتاؤں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ بلگاؤں میں ہی کونسلوں میں داخلہ کی پالیسی متعین ہوئی اور عدم تعاون کو ملتوی کر دیا گیا۔ اسی مہینے بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، جہاں الگ رائے دہندگی کی بنیاد پر نمائندگی کا منصوبہ مسٹر محمد علی جناح نے پیش کیا۔ فرقہ وارانہ بنیاد پر ان کی یہ پہلی کوشش تھی۔ ۱۹۱۶ کے لکھنؤ کانگریس میں مسلم لیگ اور کانگریس کے بیچ مل کر آزادی کی لڑائی لڑنے کے معاہدے سے لے کر بلگاؤں کانگریس تک پہنچتے پہنچتے Separate Electorate کے سوال نے ایک ٹھوس شکل لے لی اور ۱۹۳۷ تک تو وہ پختہ ہو گئی۔ جب Separate Electorate کی بنیاد پر ہندو ہندوؤں کے اور مسلمان مسلمانوں کے نمائندہ بن کر اسمبلیوں میں گئے، تو ہندو ممبروں کے دماغ میں ہندوؤں کے حقوق کی اولیت کی باتیں چھائی رہیں اور مسلمان ممبروں کے دماغ میں مسلمانوں کے۔ اور ۱۹۳۷ میں جب گیارہ ریاستوں میں کانگریس کی سرکار بنی، کیبنٹ بنی، تو مسلمانوں نے اپنے کو کہیں کا نہیں پایا۔ ان کے نمائندہ سرکار میں نہیں تھے، فیصلوں میں وہ حصہ دار نہیں تھے، اس لئے ان کے اندر مایوسی اور بے بس ہونے کی ذہنیت پیدا ہوئی۔ نتیجتاً اسی مایوسی نے ۱۹۴۰ میں پاکستان کی شکل میں مسلمانوں کے لئے الگ ریاست کا

مطالبہ سامنے لا دیا، یعنی یہ ذہنیت بن گئی کہ اب ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

۱۹۴۶۔۱۹۴۷ میں اس برصغیر میں جو کچھ دیکھنے میں آیا، آزادی کا خواب جس شکل میں شرمندہ تعبیر ہوا، وہ ہمارے سامنے کے تکلیف دہ حقائق ہیں۔ ملک کا بٹنا، لوگوں کا ادھر سے اُدھر جانا اور اُدھر سے ادھر آنا، آبادیوں کا اجڑنا، فرقہ وارانہ فسادات اور شیطان کا ننگا ناچ، یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ ''ہندو'' اور ''مسلمان'' اب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟ لیکن کیا ایسا ہو گیا؟ پہلے دو ملک بنے اور پھر ۱۹۷۱ میں وہ تین ہو گئے۔ شروع میں ہندو اور مسلمان لڑے اور پھر مسلمان اور مسلمان۔ پاکستان کا نظریہ جن علاقوں میں فروغ پایا اور جہاں کی مسلم آبادی کے سر پر چڑھ کر یہ جادو زیادہ بولا، وہ حصے زیادہ تر ہندستان میں ہی رہ گئے اور کچھ بنگلہ دیش میں۔ اور ایسے لوگ جو اس نظریہ کے حامی تھے، جب پاکستان گئے، تو ان کی اکثریت بنگلہ دیش میں بنگالی تنگ نظری کا نشانہ بنی اور موجودہ پاکستان جو گئے، وہاں علاقائی تنگ نظری نے ان کا عزت سے جینا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور بنا دیا ہے۔ آج بھی وہ بیچارے مہاجر ہی ہیں، وہ پاکستانی نہیں بن سکے۔ ہر قدم پر ان کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کیونکہ علاقائیت وہاں انہیں پناہ نہیں دیتی اور جڑیں ان کے پاس نہیں۔ اسے تو خود وہ ۱۹۴۷ میں کاٹ گئے تھے۔ سب ہنگاموں کے باوجود ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش، تینوں ملکوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہیں اور ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ آپس میں لڑ بھی رہے ہیں اور ان کے دماغوں میں ہندو اور مسلمان کا سوال پہلے کی طرح موجود بھی ہے۔ یہ سب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ آپسی تعلقات کی بہتری کا دارومدار تنگ نظریوں سے اوپر اٹھنے میں ہی پوشیدہ ہے۔ مسائل کا حل زمین کے بٹوارے سے ممکن نہیں، نہ وہ پہلے ہوا ہے اور نہ مستقبل میں ہونے والا ہے۔

حواشی

۱۔ اے۔ سی۔ بنرجی، ٹونیشن، کنسپٹ پبلیکیشن، دلی، ۱۹۸۱، ص ۶۷
۲۔ طیب جی پیپرس مائیکروفلم، پی ہارڈی، دی مسلم آف برٹش انڈیا، کیمبرج یونیورسٹی، ۱۹۷۲، ص ۱۲۸
۳۔ پی ہارڈی، ص ۱۲۸
۴۔ ایضاً، ص ۱۲۸
۵۔ ایضاً، ص ۱۲۸
۶۔ ایضاً، ص ۱۳۷
۷۔ ہیکٹر بولیتھو، جناح کریئٹر آف پاکستان، جان میر، لندن، ۱۹۵۴، ص ۴۰
۸۔ مورلے پیپرس، انڈرسن لائبریری، بحوالہ پی۔ ہارڈی، ص ۱۵۴
۹۔ مورلے پیپرس، انڈرسن لائبریری، بحوالہ پی۔ ہارڈی، ص ۱۷۷
۱۰۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد سوم، ص ۱۷۱
۱۱۔ مشیر الحسن، محمد علی آئیڈیالوجی اینڈ پالیٹکس، پرنٹ ایڈ، دلی، ۱۹۸۱، ص ۶۸
۱۲۔ جے۔ ایم۔ براؤن، گاندھیز رائز ٹو پاور، انڈین پالیٹکس، ۱۹۱۵۔۱۹۲۲، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۲، ص ۳۳۰۔۳۳۱
۱۳۔ جے۔ ایم۔ براؤن، بحوالہ ویکلی رپورٹ، ڈی۔ سی۔ آئی۔ مئی ۹۔۱۶، ہوم پالیٹکس، ص ۱۳۳۱
۱۴۔ ایضاً، ص ۳۳۵
۱۵۔ قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت، ترقی اردو بورڈ، نئی دلی ۱۹۸۰، ص ۲۵۱۔۲۵۲
۱۶۔ ڈی۔ گراہم پول، انڈین اِن ٹرانزیشن، لیونارڈ اینڈ ورجینیا وُولف، لندن، ۱۹۳۲، ص ۲۲۲۔۲۲۳
۱۷۔ سر شیوسوامی ایر، انڈین کنسٹی ٹیوشنل پرابلم، بی۔ ڈی۔ تاراپوروالا، بمبئی، ۱۹۲۸، ص ۸۶۔۸۷
۱۸۔ ڈی۔ گراہم پول، ص ۲۲۴
۱۹۔ ایضاً، ص ۱

ہندوؤں کے درمیان سماجی مُصلحوں کی پہل

جب تک ہندستان کی اکثریتی آبادی ہندوؤں، کے سوچنے کے انداز اور ان کے بیچ چلی مختلف اصلاحی تحریکوں کا ایک مختصر جائزہ نہیں لیا جاتا، نہ ہندو سماج اور نہ ہندو مسلم رشتوں کی پیچیدگیوں کا ہم اندازہ لگا سکتے، ان کی گہرائیوں کو تو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مذہب کے اعتبار سے ہندستان میں ہندوؤں (ویدک دھرم) کی اکثریت ہے اور تعداد کی بنیاد پر اسے ہندوؤں کا ملک کوئی مان سکتا ہے۔ لیکن جب اس برصغیر کے جغرافیہ، تاریخ اور یہاں کی پیچیدہ سماجی بناوٹ پر غیر جانب داری سے نظر ڈالی جائے گی، تو اس نظریہ کی کمزوریاں سامنے آ جائینگی۔ قدیم زمانے سے افغان، ترک، پٹھان اور مغلوں کے آنے تک ہون، شک، سیتھین، آریہ جیسے قبیلے حملہ آوروں کی شکل میں یہاں آئے، مقامی آبادی سے ان کی لمبی معرکہ آرائی ہوئی اور آخر کار یہاں کی آب و ہوا انہیں راس آئی اور وہ یہاں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ آریوں کو شروع میں ہی تسلط حاصل ہو گیا۔ اپنی ترقی یافتہ صلاحیتوں کی بنیاد پر یہاں کے ماحول کو وہ متاثر کرتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا دھرم بھی ہندستان کا دھرم ہو گیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ آج وہی ''دھرم'' مختلف شکلوں میں ہندوؤں کا دھرم ہے۔ یہاں ہی بودھ اور جین دھرم پیدا ہوئے۔ جین دھرم ہندوازم سے نزدیک رہا، جب کہ بودھ دھرم کے ماننے والوں اور ہندوؤں کے بیچ برسوں تشدد آمیز تصادم ہوئے، جس کے نتیجے میں بودھ دھرم کو ہندستان سے جلا وطن ہونا پڑا اور سیکڑوں برسوں تک یہاں اس کا کوئی نام لیوا نہیں رہا۔ چھٹی صدی کے آخری برسوں میں عرب میں طلوع اسلام ہوا اور بہت جلد یہ مذہب بھی ہندستان پہنچا۔ آنے کی شروعات تاجروں کے ساتھ ہوئی۔ سازگار ماحول پا کر وہ تاجر یہاں ہی بس گئے۔ بعد میں فاتح حملہ آوروں کی شکل میں زیادہ تعداد میں

مسلمان آئے اور وہ بھی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں دنوں صوفی بزرگوں کا بھی یہاں آنا ہوا اور انہوں نے اسلام کے بھائی چارہ، برابری، امن اور سماجی یکجہتی کے پیغامات کی تبلیغ و اشاعت شروع کی اور بہت جلد مقامی لوگوں نے انہیں قبول کر لیا اور وہ یہاں کے ماحول میں گھل مل گئے۔ جب باہر سے آئے عرب، ترک، مغل اور افغان یہاں بس گئے، یہیں کے ہو گئے، تو ان کا مذہب اسلام بھی یہاں کا ہی مذہب ہو گیا۔ ہندو اور مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے ایک نئی مشترکہ گنگا۔ جمنی تہذیب نے بھی جنم لیا۔ وہ یہیں بڑھی اور پروان چڑھی۔ اس مشترکہ ثقافت نے اردو جیسی خوبصورت زبان کو جنم دیا، اسے پروان چڑھایا۔ اردو کو مکمل طور پر ہندستانی تہذیب کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ آپسی میل جول سے اس ثقافت کے ہمہ جہتی پرکشش پہلو سامنے آتے رہے۔ اس کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کی اپنی۔ اپنی الگ پہچان بھی بنی رہی۔ آپسی شادی بیاہ کے رشتے بھی قائم ہوئے لیکن نہ ہندو مسلمانوں کو اپنے اندر ضم کر سکے اور نہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنے اندر سمویا۔ اقتدار اور تسلط حاصل کرنے کے لئے یہ آپس میں لڑے بھی ہیں، لیکن مذہب کے نام پر کبھی دشمنی کی حدوں تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن آہستہ آہستہ جب اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے کھسکنے لگا اور ہندستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی، تو حالات میں بڑے پیمانہ پر تبدیلی آئی۔ جو مسلمان کل تک حکمراں تھے، وہ اب ماتحت ہو گئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نام نہاد حکمراں اور رعایا کی جو حدیں تھیں، وہ ختم ہو گئیں، اب دونوں ایک ہی سطح پر آگئے۔ اس اہم تبدیلی کے نتیجے میں دونوں کے سوچنے کے انداز میں کافی بدلاؤ آیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو جب اقتدار کی کرسیوں سے برطرف حکمراں کے لبادے سے باہر انگریزوں کی مار جھیلتے قابل رحم حالت میں دیکھا، تو فطری طور پر ان کی نظریں بھی ٹیڑھی ہوئیں، تیور بدلے اور سیکڑوں برس پرانے ظلم، ان کی مذہبی تنگ نظری، ناروا داری، ہندوؤں کے ساتھ کئے گئے مظالم اور سخت برتاؤ ایک ایک کر کے انہیں یاد آئے اور ان کے طور طریقے اور انداز بدلے۔ اسی طرح مسلمانوں نے اپنے ماتحت رہے لوگوں کے جب انداز بدلے ہوئے دیکھے، تو ان کی فیوڈل ذہنیت و انا کو کافی ٹھیس پہنچی۔ کل کے ماتحت آج برابری کی باتیں کریں، برابری تو الگ، اب انہیں بُری نظروں سے دیکھیں بھی، مسلمان ذہنی انتشار میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس ہیجان انگیز حالت کا انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ تاریخی

حقائق کو توڑ مروڑ کر دلوں کو چھوتی ایسی جذباتی کہانیاں گڑھیں، جس کے بُرے نتیجے میں دونوں طرف رنجشیں، شک وشبہات پیدا ہونے سے بات آگے بڑھ کر دشمنی کی حدوں تک جا پہنچی۔ ہندستان کی دونوں اہم اکائیوں کے مخالفانہ رویے تلخی بھرے انداز میں ابھر کر سامنے آگئے اور جب دونوں طرف نشأۃ ثانیہ کی لہریں اٹھیں اور سدھار کی باتیں چلیں، تو دونوں کی ذہنیت میں اہم بدلاؤ آیا اور صدیوں کے آپسی میل جول سے ایک دوسرے کے رسم ورواج، کھان پان اور سماجی یکسانیت کو اپنانے کا جو رجحان پیدا ہو کر مستحکم ہوا تھا، وہ سلسلہ ختم گیا، باتیں یہیں پر رکی نہیں، یکجہتی کی ان نشانیوں کو مٹانے کی تحریک چلائی گئی۔[۱]

مسلمان ہندستان کیوں آئے، وہ کون سے اسباب تھے، جو مسلسل حملوں کے محرک بنے، ان کی تفصیل میں جانے کی نہ یہاں گنجائش ہے اور نہ ضرورت ہی۔ جب قطب الدین ایبک نے غلام خاندان کی حکومت کی یہاں بنیاد رکھی اور یہاں بس جانا طے کر لیا، تو حالت بالکل مختلف انداز سے سامنے آئی۔ ٹکڑوں میں منقسم ہندستان دھیرے دھیرے مختلف مسلمان حکمران خاندانوں کے زیر اقتدار آتا گیا اور پورے ہندستان پر ان کی حکومت قائم ہونے سے سیکڑوں برس لگے۔ شروع کے دنوں میں یہ حملہ آور جہاد اور اسلام کی تبلیغ واشاعت کے مقاصد سے متاثر تھے، یا ان کی حکومت اسلامی شریعت پر مبنی حکومت تھی، یہ ایک متنازع سوال ہے۔ یہ مانا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگ جہاد کا فرض ادا کرنے فوجیوں کی شکل میں آئے ہوں اور کچھ بادشاہوں کے دلوں میں اسلام کے لئے محبت بھی رہی ہو، لیکن مسلمانوں کے پورے دور کو، یا کسی خاص دور کو اسلامی حکومت ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔ فیروز شاہ تغلق اور علاء الدین خلجی کے وقت کے بادشاہ اور علما کے درمیان مذہبی اختلاف اور بادشاہ کا حکومت کے معاملوں میں شریعت کے مطابق نظم ونسق قائم کرنے سے انکار، کسی دوسری سچائی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ مغل عہد میں تو نقشہ ہی دوسرا دیکھنے کو ملتا ہے۔ مغلوں نے ''مذہب'' پر ''حکومت'' کو ترجیح دی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہندستان پر مسلمانوں کی حکومت مضبوطی سے قائم ہو چکی ہے اور حکومت کا یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔ ہندستان کے بڑے حصے کے حکمراں اب وہ لوگ تھے، جو یہاں کے نہیں تھے۔ مقامی لوگوں کے وہ ہم مذہب بھی نہیں تھے، ساتھ ہی دوسرے سماجی اور ثقافتی ماحول سے یہاں آئے تھے۔ جاگیردارانہ نظام اور اس کے تقاضے، عزت واحترام اور اعلیٰ منصب

دینے والے اب وہ تھے، جو نہ مقامی تھے اور نہ ہندو ہی اور یہ حالت اورنگ زیب کے عہد حکومت تک رہی۔ مغل حکومت کو چیلنج کیا مرہٹہ سردار شیوا جی نے، جو اہل حکمراں کے ہم مذہب نہیں تھے، ہندو تھے، یعنی ایک ہندو نے مسلم اقتدار کو چنوتی دی اور وہ کامیاب ہوا۔ نتیجتاً جنوبی ہند میں شیوا جی کی شخصیت ایک ''ہیرو'' کے طور پر ابھری اور جب ہندوؤں کے درمیان نشاۃ ثانیہ کی لہر اٹھی، تو شیوا جی ہندو وقار اور قدروں کی علامت کے روپ میں پیش کئے گئے۔ ان کی شہرت ہندستان گیر شخصیت کی شکل میں ہوئی۔ ایک ہندستان گیر شخصیت اور ہندوؤں کے مسیحا کے روپ میں ابھرنے کے پیچھے ہندوؤں کے شعور کے کسی گوشے میں بیٹھا مسلم مخالف وہ جذبہ رہا ہوگا، جو صدیوں سے ہندو اپنے دلوں میں دبائے چلے آرہے تھے اور حکمرانوں کے خوف و دبدبہ کے سبب، جسے وہ کھل کر ظاہر نہیں کر سکتے تھے، لیکن جب مسلمانوں کی حالت ڈگمگانے لگی اور حکومت پر ان کی گرفت کمزور ہوئی، تو وہ دبا۔ دبایا جذبہ دھیرے دھیرے ابھرنے لگا اور موقع ملتے ہی ایک چیلنج بن کر وہ مسلمانوں کے سامنے آیا۔

یہاں ایک بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ مذہب کا جو تصور مسلمان اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے تھے، ہندوؤں میں مذہب کا وہ تصور نہیں تھا۔ یہاں فلسفیانہ بنیاد پر قائم ہندو مذہب کا دامن کافی کشادہ نظر آتا ہے۔ ہندستان کی ثقافتی تاریخ کو سلسلہ وار بنائے رکھنے میں اس ذہنی میلان کا اہم رول رہا ہے۔ عیسائی یا اسلام کی طرح کوئی پابند منظم شکل نہیں ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کے درمیان آئے نئے مذہب کے ماننے والے مسلمانوں کے خلاف کوئی سخت ردعمل ۱۹ویں صدی کے آخری دور سے پہلے تک دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ شروع میں مسلمانوں نے مذہبی اثر میں ہندوؤں پر کچھ زیادتیاں کی ہوں، لیکن کسی منصوبہ بند طریقے سے تبدیلی مذہب کا پروگرام چلایا ہو، اس کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ جہاں جہاں مسلم حکمرانوں کے مرکز رہے، سیٹ آف پاور رہے، وہاں مسلمانوں کا کم تعداد میں ہونا اس کی واضح دلیل ہے۔ صوفیوں کی خانقاہوں سے انسانی اقدار پر مبنی جو روشنی پھیلی، اس نے لوگوں کو انسانیت کے مضبوط رشتوں میں باندھنے کا کام کیا۔ وہاں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی گئی، جو گیا وہ مستفیض ہوا۔ اس وقت کی تاریخ میں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں، جہاں صوفیوں کی خانقاہوں کو کچھ مسلم حکمرانوں نے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ان کی مقبولیت کو اپنے لئے خطرہ سمجھا اور اکثر ان کے لئے پریشانیاں ہی پیدا

کیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ انگریزی پڑھے لکھے ہندو دانشوروں نے انگریزوں کی حکومت کو اپنے لئے بابرکت مانا، اسے مسلمانوں کی حکومت سے ہندوؤں کی نجات سمجھی تھی۔ سب سے پہلے بنگالیوں نے انگریزی تعلیم کو اپنایا، اس لئے ان پر ہی سب سے پہلے یوروپی اثر پڑا۔ اس اثر کے نتیجے میں اپنی سماجی کمزوریوں، دقیانوسی خیالات اور توہم پرستی سے نجات پانے اور اپنی حالت میں سدھار لانے کی ذہنیت ان میں مضبوط ہوئی۔ راجا رام موہن رائے (۱۷۷۲۔۱۸۳۳)، ایشور چندر ودیا ساگر (۱۸۲۰۔۱۸۹۱) اور کیشو چندر سین (۱۸۳۸۔۱۸۸۴) جیسی اہم ہستیوں نے اپنی کوششوں سے اس ذہنیت کو کافی مستحکم اور مضبوط کیا۔

راجا رام موہن رائے کو جدید ہندستان کا Father of Indian Renaissence مانا جاتا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ہوئی تھی، جہاں فارسی اور عربی میں انہوں نے مہارت حاصل کی۔ بنارس سے سنسکرت کی پڑھائی پوری کرنے کے بعد انہوں نے رنگ پور کے دیوان کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری شروع کی۔ نوکری کے دوران عیسائی مشنری سے ان کا تعلق استوار ہوا۔ ایک مذہبی برہمن خاندان کے فرد ہونے کے ناطے ہندو دھرم کی گہری جانکاری ان کو تھی۔ عربی اور فارسی کے سبب اسلام سے متعارف ہوئے اور عیسائی مشنری سے عیسائیت کو جانا۔ ان تعلقات کے نتیجے میں ان کے خیالات متاثر ہو کر جامع اور وسیع ہوئے۔ ہندوؤں میں دھرم کے نام پر جو سماجی بُرائیاں پیدا ہوگئی تھیں، علم کی نئی روشنی میں ان کے سدھار کی باتیں انہوں نے شروع کیں۔ رائج توہم پرستی اور تنگ نظری پر مبنی رسم و رواج کی انہوں نے مخالفت کی، ان کے بارے میں کتابیں لکھیں اور مروج کمزوریوں کو نہ صرف نشان زد کیا، بلکہ ان کو دور کرنے کے لئے سرگرم تحریک چلائی۔ ۱۸۲۸ میں انہوں نے برہمو سماج کی بنیاد رکھی اور انگریزی تعلیم کو اپنانے، رسم ستی کی مخالفت اور صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا تبدیلیوں کا خیر مقدم کرنے کی ذہنیت ہندوؤں میں ابھاری۔ بہت جلد ان کی تحریک مقبول ہوئی اور پورے بنگال میں اصلاح کی زوردار لہر چلی۔ نئی روشنی کو اپنا کر ہندو سماج میں اصلاح کا جو مقصد راجا رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں کے سامنے تھا، وہ تھا اپنی سناتن روایت کو زندہ کرنا اور اس پر توہم اور بُری رسموں کی پڑی دھول کی صفائی کے ساتھ صحیح ویدانت کے اصولوں کا از سرِ نو احیاء۔

پروفیسر بی۔آر۔پُروہت کے مطابق: ’اگر چہ رام موہن رائے ایک فراخ دل مصلح تھے، لیکن ہندو احیا پرستی کی حدوں سے وہ بھی باہر نہیں نکلے تھے۔ وہ سناتن ہندو دھرم کو مقبول بنانا چاہتے تھے، لیکن ان کے اندر روایت پرستی، کٹر پن یا تنگ نظری نہیں تھی۔‘[۲] راجا رام موہن رائے نے جس اصلاحی تحریک کا بیج بویا، اس نے بہت جلد ہی ایک تناور درخت کی شکل تو ضرور لے لیا، لیکن ہندستان کے مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے پلورل سماج میں جوڑنے والی کڑی وہ نہیں بن سکے۔ نئے حالات کے مطابق اصلاحی تحریک کی ہندستان میں پہلی سرگرم کوشش کا فخر انہیں ضرور حاصل ہوا، لیکن مجموعی طور سے برہمو سماج ایک فعال تحریک کے روپ میں ہندو سماج پر بھی زیادہ دنوں تک اثر بنائے نہیں رہ سکا۔ ایک وقت ایسا آیا، جب تنظیمی الجھنوں میں الجھ کر یہ تحریک اپنے بنیادی مقاصد سے الگ ہوتی نظر آتی ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ اپنا انقلابی وجود ہی کھودیتی ہے۔

دوسری شخصیت، جس نے ہندو سماج پر سب سے زیادہ اثر ڈالا، وہ ہیں سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴۔۱۸۸۳)۔ انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۸۷۵ کو بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد رکھی اور بعد میں لاہور کو اس کا مرکز بنایا۔ سوامی دیانند کو صحیح معنوں میں ہندو احیا پرست تحریک کا بانی مانا جاتا ہے۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ قدیم ویدوں کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ اس کے لئے انہوں نے کئی تنظیمیں بنائیں اور اس کے توسط سے اپنے مقاصد کو حقیقی شکل دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے ویدک آریہ تہذیب کی عظمت کی بات کی اور ہندو سماج کو غیر ویدک اثرات سے آزاد کر سناتن دھرم کو زندہ کرنے کے ساتھ اسے اپنانے کی تحریک چلائی۔ ہندو دھرم کو اسلام اور عیسائی مذہب کی طرح الہامی مذہب مانا اور اسے بھی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ سے پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے ہندوؤں کو ’سنگھٹن‘ کے ماتحت منظم کرنے کی بات شروع کی اور ’’شُدھی‘‘ آندولن کے ذریعہ ایسے غیر ہندوؤں کو دوبارہ ہندو بنانا شروع کیا، جن کے باپ۔دادا کبھی ہندو تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے اندر جرأت اور جنگجوئی کا جذبہ ابھارا، جو آگے چل کر ہندو مہا سبھا اور آر۔ایس۔ایس۔ جیسی فرقہ پرست تنظیموں کے قیام کی رہنما بنیاد بنی۔[۳] آریہ سماج نے ہندوؤں کے ہندوازم کے حساس جذبات کو ابھارا۔ نتیجتاً ہندوؤں کے ایک طبقہ کے درمیان وہ تحریک بہت مقبول ہوئی۔ ’’شُدھی‘‘ اور ’’گئو کشی مخالف‘‘ تحریکوں نے ذہنی طور پر

ہندوؤں کو منظم ہونے پر آمادہ اور حوصلہ افزائی کی۔ جہاں تک ہندوؤں کا سوال ہے، اس تحریک سے ان کے اندر مجموعی طور پر ''اپنی عظمت'' کا جذبہ پیدا ہوا، لیکن ان کی سرگرمیوں نے غیر ہندوؤں اور خاص کر مسلمانوں کے بیچ ان کے لئے منفی ردعمل پیدا کیا، انہوں نے یہ سمجھا کہ آریہ سماج ان کے خلاف ہی میدان میں آیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے اندر اپنی شناخت کی محافظت کا سوال ابھرا اور وہ سرگرم ہوکر آریہ سماج کے مقابلے میں میدان میں آ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کے درمیان تبلیغ اور تنظیم جیسی تحریکیں چلیں۔ نتیجتاً ملک کی دو اہم اکائیوں کے بیچ کی دوری کافی بڑھ گئی۔ لالہ لاجپت رائے نے حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا، فرقہ وارانہ فسادات اور تشدد کا جو ماحول بنا، شدھی آندولن، اس کی ایک اہم وجہ تھی۔[۴]

آریہ سماج نے یہ مانا کہ وید اور ویدک نظام کے اندر کوئی کمی نہیں اور وہی واحد راہِ نجات ہے۔ نجی زندگی میں قدروں کو اولیت دئے جانے پر انہوں نے زور دیا تھا۔ ہندوؤں کے اندر پیدا ہوئی احساس کمتری کو دور کرنے کی مہم چلایا ہی، ہندوؤں پر جو غیر ہندوؤں کے نظریاتی حملے ہو رہے تھے، ان سے بھی سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کی۔ نتیجتاً ایک ایسی ذہنیت ابھری، جس نے بہت جلد جارحانہ رخ اپنا لیا اور فرقہ واریت کی بُو اس سے آنے لگی۔ اس نے دیش بھکتی اور قومیت کو مذہب کا رنگ دے دیا اور ویدوں کے بنیادی اصولوں کو دیش بھکتی کا پیمانہ مانا۔[۵] اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ آریہ سماج نے ہندوؤں کے بیچ خود اعتمادی کے ساتھ دیش بھکتی کے جذبہ کو ابھارا اور مضبوط کیا، لیکن جب دیش بھکتی کو خالص ویدک مذہب اور ہندو قومیت کا لبادہ اوڑھانے کی کوشش کی، تو مسلمانوں نے اسے مسلم دشمنی کا قدم مانا۔ نتیجتاً آریہ سماج کے پھیلاؤ اور ترقی کے زمانے میں دونوں خاص فریقوں کے درمیان بہت گہری خلیج پیدا ہوئی۔ آریہ سماج نے گئوکشی کے سوال کو جس جارحانہ انداز میں اٹھایا، اس نے بھی پورے ملک میں فرقہ وارانہ تناؤ کا روپ لے لیا۔ ۱۸۸۲ میں دیانند سرسوتی نے ''گورکھشنی سبھا'' (تحفظ گائے تنظیم) بنائی اور دوسرے برس ہی ۱۸۸۳ میں لاہور، انبالہ، فیروزپور اور دلی میں گئوکشی کے سوال پر بھیانک ہندو مسلم فساد ہوئے۔ ۱۸۸۶ میں لدھیانہ اور دلی میں، ۱۸۸۹ میں روہتک میں فسادات کا سلسلہ چلا۔ اس مسموم ہوا کا بہار اور یوپی پر بھی اثر پڑا تھا۔ ۱۸۹۳ میں بمبئی میں اسی سوال پر خطرناک فساد ہوئے جن میں سیکڑوں لوگ مارے گئے۔ ۱۹۲۲ کے دوران شاردانند اور

ڈاکٹر منجے نے ''شُدھی'' اور ''سنگٹھن'' کے مہم کو بڑے جارحانہ انداز میں چلایا، جس کے ردعمل میں مسلمانوں کے درمیان بھی اسی تیور میں تبلیغ کا رجحان بھی بڑھا اور پھر یہ دونوں آپس میں خوب لڑے۔ فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ چلا، اس کے سبب ہندو اور مسلمان ندی کے دو کناروں پر کھڑے نظر آنے لگے۔ مختلف خیالات اور مذاہب کے ماننے والوں کے ملک کے تقاضے کچھ اور ہوا کرتے ہیں، یہاں تو ایسے نظریہ کی ضرورت تھی اور آج بھی ہے، جو ہندستان جیسے پلورل بناوٹ والے ملک کے مختلف فرقوں اور مذہبوں کو آپس میں ملائے، ایک سنگم بنائے۔ بدقسمتی سے آریہ سماج نے اس ضرورت کو پورا نہیں کیا۔

ہندستانی رشی منیوں کی روایت میں خاص مقام رکھنے والے سوامی رام کرشن پرم ہنس (۱۸۳۶ـ۱۸۸۶) نے بھی ہندوؤں کے درمیان روحانیت کی بنیاد پر ایک تخلیقی انداز فکر اپناتے ہوئے ہر مذہب کی سچائی پر زور دیا۔ ان کے خیالات کو ان کے گرانقدر شاگرد سوامی وویکانند (۱۸۶۳ـ۱۹۰۲) نے مضبوط بنیادوں پر ایک وسیع تحریک کی شکل دی، جو بہت جلد مقبول ہوگئی۔ انہوں نے بھی ''ویدانت'' کی جانب واپسی پر زور دیتے ہوئے سناتن دھرم کو ہر دلعزیز بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے قائم کردہ ''رام کرشن مشن'' کی غیر متوقع مقبولیت کو دیکھ کر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ''ہندو احیا پرستی'' ان کے زمانے میں اپنے شباب پر پہنچی۔ انہوں نے مغربی مادی نظام کے سامنے ویدانت کے روحانی فلسفہ کو بڑی خود اعتمادی کے ساتھ رکھا اور ہر سطح پر انہیں کامیابی ملی۔ راجا رام موہن رائے سے سوامی وویکانند تک کے حالات کا تجزیہ ڈاکٹر پُروہت نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''وویکانند کے ساتھ ہندو احیا پرستی پختہ ہوئی اور اس کے اندر خود اعتمادی آئی۔ برہمو سماج ہندو سماج میں اپنی جڑیں جمانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ آریہ سماج پہلی تحریک تھی، جس نے ہندو احیا پرستی کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی، لیکن اس نے ہندو دھرم کو نظریاتی اتحاد، روحانی عظمت اور قابل قدر مقام حاصل کرانے میں کامیابی نہیں پائی۔ ہندوازم کو جارحانہ پہچان ضرور ملی، لیکن اسے ضرورت کسی اور چیز کی تھی، یہ فخر سوامی وویکانند کو حاصل ہے کہ انہوں نے سنجیدگی، وسعت، وقار اور خود اعتمادی کے ساتھ مضبوط نظریاتی بنیاد ہندوازم کو عطا کیا۔ ان کے ہاتھوں روحانی عظمت اور خود اعتمادی بھی اسے ملی۔''[6]

سوامی وویکانند نے ایک طرف پورب۔ پچھم کے بیچ نظریاتی قربت کا ایک باا ثر مہم

چلایا، تو دوسری طرف ہندستان میں مذہب کی بنیاد پر دیش بھکتی کا جوش بھی پیدا کیا۔ ہندوؤں کے درمیان اپنے مذہب کی عظمت اور ان کے اپنے ہندو ہونے پر فخر کا جذبہ پیدا کیا، جس کا پورے ہندستان پر اثر پڑا۔ نتیجتاً ہندوؤں نے فلسفیانہ نظریات اور روحانی بنیاد پر مغربی مذاہب اور تہذیب کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھنا شروع کیا۔ اس وقت جب ہندستان پر لگاتار نظریاتی حملے ہو رہے تھے، وویکانند نے ہندوؤں کے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔ نتیجتاً ہندو احیا پرستی کا ایک ہندستان گیر ماحول بنا۔ بعد کے دنوں میں جو بھی سیاسی تحریک چلی، ان پر سوامی وویکانند کا گہرا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنا مذہب اور اپنا ملک، ترغیب دینے والے ایسے پیغام تھے، جن کا پڑھے لکھے ہندوؤں پر کافی اثر پڑا اور ملک گیر بیداری پیدا ہوئی۔ لوگوں نے اپنے ماضی کی تلاش شروع کی، تاکہ مستقبل کے ہندستان کا لائحہ عمل اسی بنیاد پر تیار کیا جا سکے۔ بنگال میں مذہب اور ثقافت پر مبنی دیش بھکتی کو جو طاقت ملی تھی، اس پر سوامی وویکانند کے خیالات کا گہرا اثر تھا اور جب ''شکتی پوجا'' کی انہوں نے بات کی، تو ہندو جذبات کو اور بھی تقویت ملی اور آگے چل کر ۱۹۰۵ میں وہ سودیشی آندولن کی جنم داتا بنی۔ بنگال نے ان کو اپنا روسو (Rousseau) مانا۔[۲]

بنگال میں مذہب پر مبنی سماج سدھار تحریکوں کا جیوں جیوں زور بڑھتا گیا، ان کے ساتھ دیش بھکتی کے عنصر ملتے چلے گئے، یا یوں کہا جائے کہ دیش بھکتی کو مذہب کے ساتھ جوڑ دیا جانا فی زمانہ ایک مثبت پالیسی تھی، جس کا آگے چل کر اچھا نتیجہ سامنے آیا۔ اس کام کو بنکم چندر چٹرجی (۱۸۳۸-۱۸۹۴) نے بہت اچھے ڈھنگ سے آگے بڑھایا۔ ۱۸۹۱ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے اپنی باقی زندگی خدمتِ ادب، مذہب اور سماج سدھار کے لئے وقف کر دی۔ اس لئے ان کے دور کو بنگال میں ادبی نشأۃ ثانیہ کا دور مانا جاتا ہے۔ ان کے ناول اور کہانیاں جہاں دیش بھکتی کے جذبات سے لبریز ہیں، وہی ہندوازم کی عظمت اور ہندو احیا پرستی کے رنگ کو بھی خوب ظاہر کرتے ہیں۔ بنگال میں تیزی کے ساتھ مقبول ہوتی مغربی تہذیب کو انہوں نے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ مسلم معاشرے اور اس کے سماجی اثرات کے بھی وہ سخت معترض تھے۔ ہندو احیا پرستی کی لہر بنگال میں اٹھ ہی چکی تھی۔ اس لئے اپنی تہذیب کی برتری ثابت کرنے کے ساتھ اپنے مذہب کی کمزوریوں میں مناسب اصلاح لا کر انہیں مغربی

تہذیب کے سامنے لانا ان کی زندگی کا مقصد بنا۔ لیکن انہوں نے روایتی ہندو مذہب کا آنکھ بند کر کے اتباع نہیں کیا اور نہ ایسا کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔

بنکم چندر کے لئے دیش بھگتی مذہبی رنگ لئے رہی۔ انہوں نے دیش بھگتی کو ''مذہب'' جیسا مقام دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک ''مذہب'' کے ساتھ ''دیش بھگتی'' نہیں جوڑی جاتی، لوگ بیدار نہیں ہو سکتے اور انہیں مغربی شکنجے سے نجات نہیں مل سکتی۔ ہندو سماج پر جو مذہب کی مضبوط گرفت تھی، انہوں نے اسے اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لئے استعمال کرنا چاہا۔ دیوی ''کالی'' اور ''درگا'' عوام کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ ان کی پوجا پر انہوں نے کافی زور دیا اور مادر وطن کو ''کالی'' کے روپ میں پیش کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ایک دن میری دھرتی ماں دیوی درگا کی طرح طاقتور ہوگی اور دشمنوں پر ہمیں فتح حاصل ہوگی۔ ان کا ''وندے ماترم'' کا نعرہ کافی مقبول ہوا۔ بنکم چندر نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سے جس دیش بھگتی کے جذبہ کو ابھارنا چاہا، جس ہندو مذہب کی عظمت ثابت کرنی چاہی، وہ ہندوؤں کے لئے بہت ہی ترغیب دینے والی ثابت ہوئی۔ لیکن جب ہم اس کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہندو احیا پرستی اور ان کی دیش بھگتی کا تصور غیر ہندوؤں اور خاص کر مسلمانوں کے جذبات کو کافی چوٹ پہنچاتا ہے اور ایک ایسا ماحول بنتا ہے، جہاں ہندو اور مسلمان ندی کے دو کناروں پر کھڑے نظر آتے ہیں اور جو ذہنیت دونوں طرف بنتی ہے، وہ آخر کار ملک کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جی۔ سی۔ گھوش ان کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''وہ کٹر ہندو ہیں اور اپنی قوم پر کئے گئے ظلموں کے بارے میں ان کی تحریر و تقریر کے انداز میں بڑی تلخی ہے۔ ''آنند مٹھ''، ''مرنالنی''، ''سیتارام'' اور دوسرے ناولوں میں ان کی دیش بھگتی، ہندو ازم کی عظمت کو ابھارنا، اس کی بڑائی کو ثابت کرنا اور مسلم اقتدار کی اندیکھی کرنا ہے۔''[۸]

دیش بھگتی اور ہندو احیا پرستی کے تال میل پر مبنی اصلاحی تحریک نشیب و فراز کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی، جہاں یہ دونوں ایک سکے کے دو پہلو ہی ہو گئے تھے، کم سے کم ہندوؤں کے لئے ان میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ بنکم چندر (۱۸۳۸ـ۱۸۹۴) نے تحریکوں کو جہاں لاکر چھوڑا تھا، وہاں سے تلک (۱۸۴۴ـ۱۹۲۰)، بپن چندر پال

(۱۸۵۸-۱۹۵۲)، اینی بسنٹ (۱۸۴۷-۱۹۵۰) اور لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵-۱۹۲۸) جیسے معزز دانشوروں نے آگے بڑھایا۔ مذکورہ بالا ہستیاں ہمارے ملک کے قابل احترام افراد ہیں، ان کی لگاتار کوششوں اور ایثار ہی وہ مضبوط بنیاد تھے، جن سے ترغیب پا کر ملک آزادی کی منزل تک بڑی دشوار گھاٹیوں سے گذر کر پہنچا۔ یہ لوگ دیش بھکتی کے جذبہ میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے اور ہندستانیوں کے گم شدہ شاندار ماضی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ اس لئے بڑی حد تک انہوں نے ہندوازم کو اپنی فہم کے مطابق مناسب مقام پر پہنچانا ضروری سمجھا اور اپنی کوششوں میں کچھ بھی کمی نہیں کی۔ وہ ایمانداری سے اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ ہندوازم کی احیا ہی ہندستان کی عظمت کو دوبارہ بحال کر سکتی ہے۔ اروندو گھوش (۱۸۷۲-۱۹۵۰) نے "Society for the Protection of Religion" کے اجلاس میں کہا تھا:

> ''یہ ہندوازم ہے، جس کو میں دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندستان بیدار ہوگا، ہندستان ترقی کرے گا، آگے بڑھے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سناتن دھرم آگے بڑھے گا، ترقی کرے گا اور پوری دنیا پر چھا جائے گا۔ یہی مذہب ہے، جس نے ہندستان کو بچائے رکھا ہے۔ مذہب کو ابھارنے کا مطلب ہوگا ہندستان کو ابھارنا۔ وہ مذہب، جسے ہم ہندو دھرم کہتے ہیں، یہ حقیقی معنی میں سناتن دھرم ہے اور سب مذہب اس کے اندر سمائے ہوئے ہیں۔''[۹]

اروِندو گھوش (۱۸۷۲-۱۹۵۰) کے سامنے دیش بھکتی سیاسی یا معاشی مسئلہ نہیں تھا، وہ سو فیصد مذہبی سوال تھا، "The Voice of God in Man" وہ کہا کرتے تھے۔ اپنے اخبار ''وندے ماترم'' اور ''اندو پرکاش'' کے توسط سے انہوں نے اپنے جو خیالات ظاہر کئے، اس نے ہندو ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کا اتباع کرتے ہوئے لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵-۱۹۲۸) اور بپن چندر پال (۱۸۵۸-۱۹۵۲) نے درگا پوجا، راکھی اور جشنِ شیوا جی کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے انعقاد کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ مقصد تھا کہ مذہب کے نام پر اکثریتی ہندو کو بیدار کیا جائے، انہیں نئی روشنی سے متعارف کرایا جائے، تاکہ جدید حالات کا وہ مقابلہ کر سکیں۔ ان

کی ایمانداری اور خلوص میں شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، لیکن کبھی کبھی ایسی حالت بنتی ہے، جہاں غیر ہندوؤں کو اور خاص کر مسلمانوں کے دلوں میں ان کے تئیں شک پیدا ہونے لگتا ہے، ان کی غیر جانبداری دھندلانے لگتی ہے۔

ہندوؤں کے درمیان اصلاحی تحریک بنگال اور پنجاب تک ہی محدود نہیں تھی۔ جنوبی ہندستان میں بھی اصلاح کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کی زوردار تحریک چل رہی تھی اور مہاراشٹر میں لوگ اس کی بنیاد شیواجی (۱۶۲۷ یا ۱۶۳۰۔۱۶۸۰) کی جنگی مہارت، فتح اور کرشمائی شخصیت کی کہانیوں میں دیکھ رہے تھے۔ اتفاق سے یہ کہانیاں بیجاپور کے سلطان اور دلّی کے مسلم مغل حکمرانوں کے خلاف ہی مرکوز تھیں۔ یعنی اصلاح اور احیا پرستی جنوبی ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائیوں کی کہانیوں سے شروع ہوتی ہے۔ ایک بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اورنگ زیب (۱۶۱۸۔۱۷۰۷) کی فوج میں نہ ہندو فوجیوں کی کمی تھی اور نہ شیواجی کی فوج میں مسلمانوں کی۔ جنوبی ہندستان پر فتح پانے کے لئے جو مغل فوج گئی تھی، اس کا سپہ سالار ایک ہندو تھا۔ اسی طرح شیواجی کی فوج میں مسلمانوں کی تعداد تو کافی تھی ہی، ان کے بارود خانے اور توپ خانے کا ذمہ دار مہتمم بھی ایک مسلمان ہی تھا۔ شیواجی چونکہ ایک ہندو تھے اور مقابلے میں مسلمان، بدقسمتی سے حالات نے اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ بنا دیا۔ انگریز اور انگریز پرست مؤرخوں نے حالات کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ مرہٹوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لئے متعدد اخبارات نکلے۔ ان کے کارنمایاں، مہارتِ جنگ، جدوجہد اور فتح کی جو کہانیاں سامنے آئیں، ان میں جو شکست خوردہ فریق ہے، وہ مسلمان ہے۔ مسلمانوں کے خلاف ہی ساری لڑائیاں ہیں۔ اس لئے مرہٹہ اور مسلمان، ہندو اور مسلمان ہمیشہ دشمنوں کے روپ میں آمنے سامنے نظر آتے رہے۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہو کر لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ گیا۔ اس وقت کے مرہٹہ مؤرخوں رجواڑے، راناڈے، کھرے وغیرہ نے مرہٹوں کے ماضی کی تاریخ کو بڑے فخر کے ساتھ پیش کرنا شروع کیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا مقصد فرقہ وارانہ نہ ہو، لیکن آخر کار جو نتائج سامنے آئے، جو ذہنیت بنی، وہ فرقہ واریت کی بُو لئے ہوئے رہی، جس کا بُرا نتیجہ برسوں بعد ہندستانیوں کو بھگتنا پڑا۔

بال گنگادھر تلک (۱۸۴۴۔۱۹۲۰) نے ہندستان میں بڑے پیمانے پر شیواجی اور گنیش

مہوتسو منانے کی تحریک چلائی تھی، مقصد غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف ماحول بنانا تھا، لوگوں کو متحد کرنا تھا، لیکن ان تحریکوں نے نتیجتاً تنگ نظر فرقہ واریت کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ اگرچہ مقصد وہ نہیں تھا۔ تلک نے خود کہا تھا کہ اگر وہ جنوبی ہندستان کے نہ ہو کر شمالی ہندستان کے ہوتے، تو اکبر (۱۵۴۲۔۱۶۰۵) ان کے ہیرو ہوتے۔ چونکہ شیواجی (۱۶۲۷ یا ۱۶۳۰۔۱۶۸۰) جنوبی ہندستان کے ہیرو تھے، اس لئے ان کی پرکشش شخصیت کے دائرے میں ہندوؤں کو منظم کرنا اور بیدار بنانا آسان ہوا۔[۳] بپن چندر پال (۱۸۵۸۔۱۹۳۲)، سوامی وویکا نند (۱۸۶۳۔۱۹۰۲) اور اروندو گھوش (۱۸۷۲۔۱۹۵۰) وغیرہ نے جشنِ شیواجی کو لوگوں کی بیداری کے لئے ایک طاقتور تحریک مانی تھی۔ جب اس کے ساتھ درگا، کالی اور گئو بھکتی کی باتیں جوڑی گئیں، تو تحریک کی شبیہ لگ بھگ ہندو احیا پرستی کی ہو گئی، جو ہندستان کی پلورل بناوٹ کے فریم میں بڑی دقت سے سماتی نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اس کا تلخ ردعمل ہوا۔ انہوں نے اسے فرقہ وارانہ ذہنیت کی تبلیغ و تشہیر مانا۔

ویدک ہندو دھرم ہندستان کے تسلیم شدہ چھ فلسفیانہ اسکولوں کے اثر کے دائرے میں گھومتا ہے۔ جب اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے، تو ہندو دھرم ایک سب سے وسیع الخیال مذہب کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ ایشور کو مانو، تو بھی ہندو، نہ مانو تو بھی ہندو، ایک مانو، تو بھی ہندو، سیکڑوں مانو، تو بھی ہندو، مورتی پوجا کرو، تو بھی ہندو، نہ پوجو تو بھی ہندو، یعنی دھرم کا اتنا وسیع (Liberal) تصور دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اس لئے مذہب کے نام پر کسی طرح کے ہنگامے اور کشمکش کی گنجائش یہاں نظر نہیں آتی۔ یہ وسیع الخیالی ہندو دھرم کی سب سے بڑی خصوصیت مانی جاتی ہے۔ لیکن آج مذہب کی آڑ میں سیاسی فائدہ اٹھانے والے لوگوں نے ہندوازم کی اسے ہی سب سے بڑی کمزوری مان رکھا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ سیکڑوں برس کی غلامی اور مذہب کی وسیع الخیالی نے ہندوؤں کے اندر کمتری کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے اتنی بڑی اکثریت کے باوجود یہ اپنے میں خود اعتمادی اور قوت نہیں پیدا کر پا رہے ہیں۔ جو بھی آیا اور جب بھی آیا، اس نے اسے لوٹا اور برباد کیا، ذلیل کیا، ماتحت بنایا۔ اسی جذبے سے متاثر ہو کر ہی سوامی دیانند سرسوتی نے ہندو مذہب کو الہامی رنگ میں تبلیغی شکل دینے کی کوشش کی۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح ہندوؤں کے اندر بھی مذہبی شدت پسندی پیدا کرنے پر زور دیا۔ آج کچھ ہندو فرقہ پرست تنظیمیں

ان نعروں کے سہارے ہی پھل پھول رہی ہیں۔ آج کسی سے یہ بات چھپی ہوئی نہیں کہ مذہب کو سیاست (Power-Politics) کا طاقتور ہتھیار بنایا جا چکا ہے اور فرقہ واریت کامیابی کا راز بن چکی ہے، جو پلورل ہندستان کے سیکولر ڈھانچے میں نہیں سماتا۔

مختلف مذاہب کے ماننے والے ملک ہندستان میں فرقہ واریت سب سے حساس اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو ٹھیک سے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے، تو ملک کی سالمیت اور پُرامن ماحول میں ترقی کی کوششوں کو ہمیشہ خطرہ لگا رہے گا۔ یہی وجہ رہی کہ شروع سے ہی یہاں کے سرکردہ رہنماؤں نے بڑی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور و فکر کیا ہے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشہور سماجوادی رہنما جے پرکاش نارائن (۱۹۰۲۔۱۹۷۹) اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> ''چونکہ یہاں مذہب اور فرقے متعدد ہیں، یہاں فرقہ واریت بھی کئی طرح کی ہیں۔ ان میں مذہبی فرقہ واریت سب سے خطرناک اور نقصان دہ ہے کیونکہ اس کے نام پر مذہبی جذبات کو ابھار کر لوگوں کا استحصال ممکن ہے۔ فرقہ واریت مذہب کو استعمال کرتی ہے، مذہب کو کسی حال میں اس کے لئے موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مجرم ہے سیاست اور معاشی تگ و دو۔ مذہبیت کبھی خاص طور پر فرقہ واریت کی وجہ نہیں رہی۔ فرقہ واریت کی تہہ میں ہمیشہ سیاسی، معاشی اور سماجی اسباب رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں لُوٹ مار، عصمت دری، قتل اور آگ زنی کے واقعات رونما ہوتے ہیں، لیکن کوئی مذہب اس کی تعلیم نہیں دیتا۔ لیکن اپنی جگہ پر یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ ہر ایک فساد کے بعد کسی نہ کسی فرقہ پرست پارٹی یا جماعت کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور کسی نہ کسی فرد یا مذہبی اکائی کی معاشی حالت، تجارت، صنعت اور سودے بازی کو قوت اور اہمیت ملتی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مذہب کی جڑوں میں فرقہ واریت نہیں ہوتی۔ لیکن جو مذہب فرقہ واریت کو بڑھاوا دیتا ہے وہ مذہب جھوٹا مذہب ہے۔ مذہب کی تاریخ کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں، تو یہ صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیغمبروں اور

بزرگوں کے سنہرے اصولوں کو باہری اثر کے میل نے آلودہ کر دیا ہے۔ اس مذموم حرکت کے محرک مذہب کے نام پر سیاسی، معاشی اور سماجی استحصال کا جذبہ رہا ہے۔ جو لوگ حقیقت میں مذہبی ہیں، انہیں محتاط ہونا چاہئے۔''[۱۱]

اسی ضمن میں جے پرکاش نارائن آگے کہتے ہیں:

''ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ بستے ہیں۔ اس لئے ہر ایک کی اپنے اپنے ڈھنگ کی فرقہ واریت ہے۔ فرقہ واریت چاہے کسی کی ہو، وہ بُری چیز ہے، لیکن ہندوؤں کی فرقہ واریت سب سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے، کیونکہ ہندوؤں کی یہاں اکثریت ہے اور ہندوؤں کی فرقہ واریت کو بڑی آسانی سے قوم پرست، دیش بھگتی کا جامہ پہنا دیا جا سکتا ہے۔ ہر ایک مخالف کو وطن دشمن غدار کہہ کر اس کی مذمت کی جا سکتی ہے۔''

جے پرکاش نارائن نے فرقہ واریت کی جڑوں پر ضرب لگانے کی بات کی۔ فرقہ واریت کسی مذہب کے ماننے والوں کی ہو، انہوں نے اس کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مذہب کو ذاتی حد تک ہی رکھا جانا چاہئے، یہاں نہ تبلیغ کی گنجائش ہے اور نہ شدھی کی۔[۱۲]

ہندستانی مصلحین، فلسفیوں اور سیاست دانوں کی طویل اور معتبر فہرست میں ایک بیمثال شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے، جس نے بلاشبہ خود کو سناتن دھرمی ہندو کہنے کے باوجود اپنے مذہب کو سب سے اعلیٰ نہیں کہا، نہ ویدانت کی طرف لوٹ چلو کا پیغام دیا اور نہ کسی دوسرے مذہب کی مذمت ہی کی۔ اس کا مذہبی تصور اور اس کی دیش بھگتی کے تقاضوں کی شکل بالکل مختلف اور وسیع ہے۔ اس کے سامنے ایک ایسے ہندستان کا بلو پرنٹ ہے، جہاں بغیر بھید بھاؤ کے ہر مذہب، طبقہ، ذات، جنس، زبان اور ادب کا، یکسانیت کی بنیاد پر خاص مقام ہے اور وہ شخصیت ہے موہن داس کرم چند گاندھی کی، بابائے قوم مہاتما گاندھی (۱۸۶۹۔۱۹۴۸) کی۔

گاندھی جی خود مذہبی آدمی تھے اور لوگوں کی شخصیت کی ہمہ گیری پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے لئے اخلاقیات اور مذہب سے الگ ہو کر سیاست بے معنی، بے بنیاد اور خطرناک چیز ہے۔ اپنے ہندو ہونے کا انہیں فخر تھا اور اسی بنا پر انہوں نے دوسرے مذاہب کا احترام کیا اور ''سب مذاہب کے احترام'' کی بات ہی نہیں کی، بلکہ پوری زندگی اس پر عمل کیا، اسے جیا ہے۔

ملک کی سب سے بڑی پارٹی کانگریس کے مقبول عام قائد ہونے کے ناطے ان کی نظر ہندستانی سماج کے ہر پہلو پر تھی۔ یہاں کی سماجی، مذہبی اور سیاسی پیچیدگیوں کا انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندستان نہ آزاد ہو سکتا ہے اور نہ مضبوط بنیاد پر کبھی ترقی کر سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مناسب رہنمائی کی۔ خود ہندو تھے، اس لئے مسلمانوں کے مسائل کو اپنا، ہندوؤں کا ہی نہیں، پورے ملک کا مسئلہ مانا۔ ان کے روادار اور ہمہ گیر انداز کو کٹر احیا پرست ہندوؤں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ ان لوگوں نے گاندھی جی کو ہندوؤں کی ترقی اور تسلط حاصل کرنے کی راہ میں بڑی رکاوٹ مانا، انہیں ہندوؤں کا دشمن سمجھا اور ایک وقت ایسا آیا جب ویسے ہی ہندوؤں نے انہیں راستے سے ہٹا دینے کا طے کیا۔ ناتھورام گوڈسے (۱۹۱۰۔۱۹۴۹) اس بیمار ذہنیت والوں کا نمائندہ بن کر سامنے آیا اور اپنی سوچ کے مطابق ہندو قومیت کے راستے میں کھڑی سب سے بڑی رکاوٹ کو ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو دور کر دیا، انہیں شہید کر دیا۔

بھگتی آندولن سے عہد گاندھی تک ''ہندو دھرم'' کے وجود کی جدوجہد ہو یا اس کی فلسفیانہ وسیع الخیالی کے فروغ کی تاریخ، یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم رہی ہے کہ بڑی خوبصورت، عظیم فلسفیانہ اور پر کشش روایتوں کے دعوؤں کے باوجود اس وسعت خیالی کے فائدوں سے خود ہندوؤں کا ایک بڑا حصہ ''ہریجن'' ''اچھوت'' بنا محروم رہا۔ اس طبقہ نے خود کو ہندو دھرم کے دائرے میں لانے اور باعزت ''ہندو'' کہلانے کی کوششوں میں لگایا، لیکن نام نہاد ہندو دھرم کے ٹھیکیداروں نے انہیں نہ عزت دی اور نہ ہندو دھرم کی وسعت خیالی سے مستفیض ہونے کا کوئی موقع۔ یہ ''اچھوت'' ہی رہے اور ان کا وجود، یہاں تک کہ ان کے سایے سے بھی نفرت کرنے کا ماحول بنا رہا۔ متعدد سماجی اصلاح کی تحریکیں چلیں، لیکن عملی زندگی میں ہندو دھرم کی وسعت خیالی سماجی ڈھانچے میں وقت کے مطابق ہم آہنگی اور غیر معمولی تبدیلی لانے کی محرک نہیں بن سکی۔ ہندو سماج ذات پات والے نظام کی حدوں میں افسوسناک تعطل کا شکار رہا۔ گاندھی جی نے اس تعطل کو توڑا اور انسانیت کی فلاح و بہبود کو اپنا مقصد مانتے ہوئے ہندو وسیع القلبی کے صحیح فلسفیانہ تصور کو عوام کی روزمرہ زندگی سے جوڑنے کی مرتے دم تک کوشش کی۔ ''اچھوتوں'' کو ''انسان'' کے زمرہ میں لانے کے لئے انہوں مضبوط تحریک چلائی۔ حیرت کی بات

یہ رہی کہ ہندو مذہبی ٹھیکیداروں نے ہی نہیں سرکردہ ہندو نیتاؤں نے بھی شروع میں ان کی بڑی مخالفت کی۔ انہیں متعدد مقامات پر بے عزت کیا گیا، بُری طرح مارا پیٹا گیا۔ اسی انسانیت اور حق نوازی کو سامنے رکھ کر گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھی زوردار تحریک چلائی اور ''مذہب'' کے تصور کو ایک انقلابی سمت دی۔ انہوں نے ایک ایسا ماحول بنانا چاہا، جہاں ''مذہب'' کے نام پر انسان انسان سے تفریق نہ رکھے، نفرت نہ کرے۔ ان کی کوشش رہی کہ ہندو اور مسلمان اپنے فرقہ وارانہ دائروں کو توڑیں، ایک دوسرے کے ہمدرد بنیں، ایک دوسرے کے دُکھوں کو بانٹیں اور ہندستانی ہونے کا ثبوت دیں۔ ہندو مذہب کے نام نہاد و یسے ٹھیکیدار، جنہوں نے ہندوؤں کے ہی ایک طبقہ کو جائز مقام اور عزت نہیں دی اور نہ دینے کو تیار رہے، انہوں نے گاندھی جی کے اس نظریہ کا کیا اثر لیا ہوگا، ان کا کیا ردعمل رہا ہوگا، ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کو یکساں سمجھیں، ساتھ ہی اسلام کے تئیں برابری کا نظریہ اپنائیں، یہ بات آسانی سے ان کے گلے سے اُترنے والی نہیں تھی۔ گاندھی جی کا ''سب مذہب کے لئے یکساں احترام'' میں یقین تھا، دوسرے ہندو بھی یہی نظریہ اپنائیں، ان کی خواہش رہی، اس کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ انہوں نے واضح لفظوں میں کہا: ''میں سب بڑے مذاہب کی بنیادی سچائیوں کا ماننے والا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب ایشور کی جانب سے ہیں اور جن لوگوں پر اُتارے گئے، ان کے لئے وہ ضروری تھے۔ میرا یہ بھی ماننا ہے کہ اگر مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ ان کے ماننے والوں کے نظریہ سے ہی کریں، تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ سب بنیادی طور سے ایک ہیں اور ایک دوسرے کو مکمل کرنے والے ہیں۔''[۱۳] اپنے نظریہ کو واضح کرتے ہوئے گاندھی جی نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں ان کے اعادہ کی گنجائش نہیں ہے، لیکن ان کے نظریہ کو سمجھنے کے لئے کچھ باتیں ضروری نظر آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> ''میں سمجھتا ہوں، دنیا کے سب بڑے مذہب کم و بیش سچے ہیں۔ کم و بیش میں نے اس لئے کہا کہ چونکہ انسان خود غلطیوں کا پُتلا ہے، اس لئے جس چیز میں انسان کا ہاتھ لگ جائے، اس میں بھی غلطی پیدا ہو جانے کی گنجائش ہے۔ کمال ایشور کا وصف ہے، جس میں کوئی اس کی حصہ داری نہیں۔ میری حقیر رائے میں وید، قرآن، بائبل کی جو سمجھ ہم رکھتے ہیں، وہ مخاصمانہ ہیں۔

ہم جیسے خطاؤں سے مرکب انسان، جو جذبات کے تھپیڑوں میں ڈولتے رہتے ہیں، اپنے آپ کو ایشور کے کلام کا مطلب سمجھنے سے معذور پاتے ہیں۔''[۱۴]

''میں صرف ویدوں کو دیووانی نہیں مانتا۔ میرا یقین ہے کہ بائبل، قرآن، ژنداوستا بھی اسی طرح خدائی کتاب ہے، جیسے وید۔ ہندو دھرم کے گرنتھوں پر میرا یقین مجھ سے یہ تقاضا نہیں کرتا ہے کہ میں اس کے ہر ایک لفظ اور اشلوک کو مانوں...... میں اپنے آپ کو کسی ایسی تشریح کو ماننے کا پابند نہیں سمجھتا، جو عقل یا اخلاقی قدروں کے خلاف ہو۔''[۱۵]

''مندر ہوں، مسجد ہوں یا گرجے، میں ایشور کے گھر کی ان مختلف شکلوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ یہ شکلیں وہی ہیں، جو ہمارے اعتقاد نے بنائی ہیں۔ انسان کے دلوں میں اندیکھے ایشور تک پہنچنے کی خواہش ہے، یہ اسی کا اظہار ہے۔''[۱۶]

اسی ضمن میں مذہب کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''مذہب ایک درخت ہے، جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ شاخوں کے اعتبار سے تو مذہب بہت سے ہیں، مگر درخت کے اعتبار سے مذہب صرف ایک ہے۔''[۱۷]

مہاتما گاندھی کے خوابوں کا ہندستان مذہب، رنگ، نسل، جنس، زبان یا علاقائیت کی بنیاد پر ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا ہندستان بنانا چاہتے تھے، جہاں ہر ایک ہندستانی خود کو اپنی قسمت کا مالک مانے۔ اپنے اور اپنے ملک کے بنانے سنوارنے میں خود کو حصہ دار سمجھے اور ایک مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے سب وارث ہوں۔ یہی وجہ رہی کہ انہوں نے مسلمانوں کے مسئلہ کو ہندستان اور ہندوؤں کا مسئلہ مانا۔ اس بے مثال انسان کی بدقسمتی دیکھئے کہ مسلمانوں کی اکثریت نے اسے مسلم مخالف مانا، اسے جھوٹا، ڈھونگی اور میٹھی چھری اور دوہری پالیسیوں والا کہا۔ اس کی نیت کو سدا شک کی نظروں سے دیکھا۔ جذبات میں بہکے مسلمانوں کے دانشور طبقہ نے کبھی سنجیدگی سے ان کی شخصیت کو پرکھا نہیں، ان کے خیالات کا مطالعہ اور تجزیہ نہیں کیا۔ اس لئے ان کے بارے میں رائے بنانے میں وہ انصاف نہیں کرسکا۔ اپنی مذہبی تنگ نظریوں کی وجہ

سے منکسر المزاج لنگوٹی باندھے ہندو گاندھی کو مسلمانوں کا دوست ماننے کے لئے ان کا ذہن تیار نہیں ہو سکا اور آج بھی لگ بھگ وہی حالت ہے اور ہندوؤں نے ان کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا، وہ ہم دیکھ چکے ہیں، انہیں تو ایک ہندو نے قتل ہی کر دیا۔

''ہندو'' اور ''مسلمان'' ہونے کے دائرے سے نکل کر ہم ذرا ہندو سوچ کا تصور کریں۔ ہندستان میں ان کی بھاری اکثریت ہے اور ہزاروں برسوں کی ان کی اپنی تاریخ ہے۔ اپنی روایتوں پر جو انہیں فخر ہے، اسے کسی نظریہ سے غیر مناسب نہیں کہہ سکتے۔ ان کے ذہن میں اگر کہیں یہ بات ہو کہ وہ ہندستان کی قسمت کے بنانے اور سنوارنے والے ہیں، تو بھی اسے ایک دم غلط نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اگر ہندستان کا مسلمان محب وطن رہ کر عرب اور دوسرے ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں سے جذباتی اتحاد کا دم بھر سکتا ہے، ان کے لئے یہاں تحریک چلا سکتا ہے، تو کیا ہندوؤں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہندستان کے ہندوؤں کے اتحاد کی باتیں کریں؟ کسی نظریہ سے ہم انہیں غلط نہیں کہہ سکتے۔ بات تو وہاں الجھ جاتی ہے، جب ہندوؤں کی تنگ نظری دیش بھکتی کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتی ہے اور وہ غیر ہندوؤں کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ اپنے کردار، قول و عمل سے ان کے جذبہ کو گھائل کرنے لگتے ہیں۔ آج دنیا کے ہر حصے میں بسنے والے مختلف قوموں کو اپنی جڑوں کی تلاش ہے۔ ایک قوم کے روپ میں اپنی الگ پہچان اور وجود (Identity) کی انہیں فکر ہے اور اسے برقرار رکھنے کی ان کی جد وجہد چلتی رہتی ہے۔ ہندستان کے مسلمان یا دوسری اقلیت بھی اس فکر سے آزاد نہیں، انہیں اپنے تحفظ کی فکر لگی رہتی ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے بعد سب سے زیادہ ہے اور ہندستان سے جڑے رہنے کی ان کی تاریخ بھی سیکڑوں برس پُرانی ہے، اس لئے ہر ایک موڑ پر ''ہندوؤں'' سے ''مسلمانوں'' کی کش مکش اور ٹکراؤ کی حالت بنتی رہی۔ آزادی سے قبل سامراجی انگریزوں نے اس ذہنیت کے منفی پہلوؤں کو اتنا ابھار کر پیش کیا کہ مسلمانوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہندوؤں سے ان کا نباہ ممکن نہیں۔ جمہوری نظام کے تقاضوں سے وہ خوف زدہ ہو گئے، کیونکہ جمہوریت میں اکثریت کی حکومت مانی جاتی رہی ہے اور مسلمان ہندوؤں کی ماتحتی ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اس لئے ایک الگ ملک کی مانگ ہوئی اور حالات نے اسے حقیقی روپ دے دیا، وہ بن بھی گیا۔ لیکن سارے مسلمان تو وہاں گئے نہیں اور نہ ہی سارے مسلمانوں نے پاکستان کی مانگ ہی

کی تھی۔ کروڑوں کی تعداد میں ہندستان کے مختلف حصوں میں وہ آج بھی آباد ہیں اور آج بھی ان کے دل میں اپنے الگ وجود کا سوال کئی قسم کی بے چینیاں پیدا کر رہا ہے۔ موجودہ پارلمانی جمہوری نظام اور بغیر بھید بھاؤ کے بالغوں کی حق رائے دہندگی، اپنی ساری اچھائیوں کے باوجود ہندستانی سماج کے لئے کئی طرح کی مشکلیں پیدا کر رہی ہیں۔ لیکن فی الوقت اس سے اچھا کوئی نظام یا متبادل سامنے نہیں، اس لئے خانوں میں بٹے ہندستان کے مسائل الجھ رہے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کا مسئلہ بھی الجھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب تک ہمارے اندر ذہنی طور سے پختگی نہیں آتی، معاشی اور سماجی نا برابری ختم نہیں ہوتی، پارلمانی جمہوریت کے مثبت پہلوؤں کو اچھی طرح ابھارا اور مستحکم نہیں کیا جاتا، سیکولرزم اور سوشلزم کی بنیاد کو مضبوط بنا کر اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کے لئے عوام کا ذہن تیار نہیں ہوتا، یہ مسئلہ سلجھنے والا نہیں ہے۔ موجودہ حالت میں گاندھی جی کا بتایا ہوا راستہ فقط ایک متبادل راستہ نظر آتا ہے، جہاں محبت، وسعت خیالی اور انصاف کی بنیاد پر اس مسئلہ کا حل ممکن ہے، جہاں مذہب کی نئی تشریح ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے، جہاں تمام حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور انسان انسان کی حیثیت میں سمندری گرداب (Oceanic Circle) کا مرکزی نکتہ بنا فخر محسوس کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ بنی پرساد، انڈیاز ہندو مسلم کوشچن، جارج ایلین، ایل۔ کے۔ لندن، ۱۹۴۶، ص ۳۱
۲۔ بی۔ آر۔ پُروہت، ہندو ریوالزم اینڈ انڈین نیشلزم، شکتی پرکاشن، ساگر، ۱۹۶۵، ص ۱۱
۳۔ ایضاً، ص ۳
۴۔ لالہ لاجپت رائے، آریہ سماج، اُتر چند کپور اینڈ سنس، لاہور، ۱۹۳۲، ص ۲۵۴
۵۔ بی۔ آر۔ پُروہت، ص ۴۵
۶۔ ایضاً، ص ۷۰
۷۔ ایضاً، ص ۷۲

۸۔ جے۔ سی۔ گھوش، بنگالی لٹریچر، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۸، ص ۱۶۱
۹۔ بی۔ آر۔ پُروہت، ص ۴۹
۱۰۔ پی۔ ہارڈی، دی مسلم آف انڈیا، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۱۳، ص ۱۴۲
۱۱۔ جے پرکاش نارائن، سانپر دایکتا وِرودھی سمّیلن، ۲۸۔۲۹ دسمبر ۱۹۶۸، نیشن بلڈنگ ان انڈیا، نو چیتنا پرکاشن، بنارس، ص ۱۳۱۔۱۳۲
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔۱۳۲
۱۳۔ این۔ کے۔ بوس، سلیکشن فروم گاندھی، نوجیون، احمد آباد، ۱۹۴۸، ص ۲۲۸
۱۴۔ آر۔ کے۔ پربھو، دی مائنڈ آف مہاتما، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۵، ص ۸۲
۱۵۔ ایضاً، ص ۸۶
۱۶۔ ایضاً، ص ۸۶
۱۷۔ جی۔ ڈی۔ تینڈولکر، مہاتما، بمبئی، 1951، جلد سوم، ص ۳۰۰

سامراجیت کا چکرویوہ: الجھنوں کا دور

۹ اگست ۱۹۴۲ کو بمبئی میں گرفتار کر لئے جانے کے بعد گاندھی جی پُونے کے آغا خان پیلس میں نظر بند تھے اور دوسرے بڑے کانگریسی نیتا بھی مختلف جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ باہر ہندو مہا سبھا، اس سے منسلک سنگٹھن اور مسلم لیگی رہنما اپنی اپنی پالیسیوں کی گوٹیاں بٹھا رہے تھے۔ فرقہ واریت نے ماحول کو آلودہ کر رکھا تھا اور ہندو اور مسلمان لڑ مرنے کی گویا قسمیں کھائے ہوئے تھے۔ رواداری قیادت کی کمی نے ملک کی حالت کو انتہائی حساس بنا دیا تھا۔ گاندھی جی کی قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کے سپنے چکنا چور ہوتے نظر آ رہے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کا ایک سرگرم طبقہ کانگریس اور مسلم لیگ کے بینر تلے انگریزوں کے رخصت ہونے سے پہلے اقتدار میں اپنی حصہ داری کو یقینی بنا لینے کی کش مکش میں قدروں کی سرحدوں کو پامال کرنے میں بھی نہیں ہچکچا رہا تھا۔ اپنے مقصد کی منزل کے طور پر مسلم لیگ نے پاکستان کو سودا بازی (Bargain) کا مدعا بنا کر اچھال رکھا تھا اور کانگریس اس کے خلاف اپنی دلیلیں دے رہی تھی۔ ڈاکٹر امبیدکر اور ماسٹر تارا سنگھ بھی اپنے ترکش کے تیروں کا استعمال کرنے سے نہیں ہچکچا رہے تھے۔ حصہ داری کے اس پیچیدہ سوال کے مناسب حل کی کوشش میں راجاجی، چکرورتی راج گوپال آچاریہ (۱۹۷۲-۱۸۷۹) فارمولا سامنے آیا۔ اس کے مطابق رائے شماری (Plebiscite) کی بنیاد پر مسلم اکثریتی حلقوں کو ملا کر ایک آزاد مسلم حلقے کا نقشہ ابھر کر سامنے آیا تھا۔ کانگریس نے اس فارمولے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ راجاجی کانگریس سے مایوس ہو گئے، لیکن وہ خاموش نہیں بیٹھے۔ الجھی ہوئی صورت حال سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے کی اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ وہ گاندھی جی سے ملے، غیر کانگریسی جماعتوں سے باتیں کیں، اور مسٹر جناح سے بھی ملاقات کی۔

اب تک مسلم لیگ کو اپنی مضبوط پوزیشن کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ بغیر اس کی رضامندی کے ہندستان کی تقدیر کا فیصلہ اب ممکن نہیں، اس لئے اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ ''دوقومیت'' کی بنیاد پر اقتدار میں حصہ داری کے علاوہ کسی اور متبادل حل کے لئے وہ تیار نہیں تھی جو بھی فارمولا پیش کیا جاتا، اسے وہ سودا بازی (Bargain) کرنے کے انداز میں رد کرتی جا رہی تھی۔

گاندھی جی کے لئے وہ دن بڑی مشکل آزمائش کے تھے۔ ایک طرف ان کا ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ قومیت کا مشن تھا، تو دوسری طرف اس کے بالکل برخلاف فضا۔ کانگریس خود کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ سب ہندستانیوں کی تنہا نمائندہ ہونے کے دعوی پر اٹل تھی۔ جب کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہونے کے دعوی پر اڑگ، وہ اپنے مطالبات پر اڑی ہوئی تھی کے انگریزوں کے جانے سے پہلے ہر حال میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطہ ''پاکستان'' کا قیام ہو جائے۔ فرقہ واریت نے قانونی معاملوں کو بہت الجھا دیا تھا اور چاروں طرف ناامیدی کی حالت بنی ہوئی تھی، اتحاد کی جڑوں پر چوٹیں پہنچائی جا رہی تھیں۔ بگڑتے ہوتے حالات کے دباؤ کے آگے گاندھی جی راجاجی کے فامولے سے کسی حد تک متفق نظر آتے ہیں، لیکن اب بھی ان کی کوشش جاری تھی کہ ہندو اور مسلمان مذہب کی بنیاد پر الگ الگ نہ ہوں، وہ ایک ساتھ رہیں اور مل جُل کر آزاد ہندستان کو بنانے اور سنوارنے کا خاکہ تیار کریں۔ مگر اقتدار کی حصہ داری کے سوال پر کانگریس کے بڑے نیتاؤں اور مسلم لیگ کے انداز میں ذرا بھی لچک نہیں پائی جا رہی تھی۔ یہ صورت حال سامراجی برٹش حکومت کو اپنا سازشی کارڈ کھیلنے کا سنہرا موقع مہیا کرا رہی تھی۔

۱۹۴۴ میں گاندھی جی جیل سے رہا کیے گئے تھے۔ آئینی بحران (Crisis) اور کانگریس اور مسلم لیگ کی اقتدار میں مناسب حصہ داری کے الجھے سوال کا حل ڈھونڈنے کے لئے ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان بات چیت اور خط و کتابت کا لمبا سلسلہ ۱۹ دنوں تک چلا، لیکن کوئی مناسب حل نہیں نکل سکا۔ بات چیت ناکام ہو گئی، کیونکہ دوقومیت کی بنیاد پر ''پاکستان'' کے وجود کو ماننا نہ صرف مشترکہ قومیت کی نفی کرنی تھی، بلکہ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے وجود اور ان کی ممکنہ بدحالی کی امکانی حالت بہت گمبھیر مسئلے تھے۔ گاندھی جی اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نفرت کی مستقل بنیاد پڑ جائے۔ روز بہ روز حالت تشویشناک ہوتی

جا رہی تھی اور گاندھی جی خود کو بے بس پا رہے تھے۔ صلح اور دوستی کا جو بھی فارمولا سامنے آتا، اسے وہ اپنانے کو تیار تھے۔ راجا جی، چکرورتی راج گوپال آچاریہ (۱۹۷۲-۱۸۷۹) کی ناکامی کے بعد بھولا بھائی دیسائی، سرسپرو وغیرہ نے بھی مشترک طور پر آئینی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی۔ وائسرائے لارڈ ویویل نے بھی ایک پہل کی، لیکن بات کچھ آگے نہیں بڑھی اور ملی جلی عبوری سرکار کی کوششیں ناکام رہیں۔ اقتدار میں مناسب حصہ داری کی کش مکش کی اندھی گلیوں سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے کے لئے شملہ کانفرنس کا انعقاد ہوا، لیکن وہاں بھی کوئی حل سامنے نہیں آسکا۔ ایک طرف یہ دباؤ کہ مسلمانوں کو اپنا الگ Home Land ملے اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی تنہا نمائندہ پارٹی تسلیم کیا جائے، دوسری طرف ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دوسرے ہندستانیوں کا خود کو نمائندہ ماننے والی کانگریس کا اس سے اختلاف، حالت نے صلح اور سلجھانے کی باتوں کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔

جولائی ۱۹۴۵ میں انگلینڈ میں لیبر پارٹی کی سرکار اقتدار میں آئی اور نئے سرے سے ہندستان کی آزادی اور ہندستانیوں کے ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کے عمل پر بحثیں شروع ہوئی۔ یہاں کی سیاسی حالت کا تجزیہ کرنے کے لئے ایک پارلمانی وفد ہندستان آیا اور مختلف جماعتوں کے صدر اور ان کے اہم نیتاؤں سے ملا۔ یہاں کے حالات کا تجزیہ کے بعد وفد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندستان کی آزادی کو زیادہ دنوں تک ٹالا نہیں جاسکتا۔ غلامی کا چولا اتار پھینکنے کو ہندستانی بے چین تھے۔ بین الاقوامی سیاست بھی کچھ اس مقام پر پہنچی ہوئی تھی کہ سامراجی شکنجے کو ڈھیلا کرنے میں ہی انگریزوں کی عافیت تھی۔ دوسری عالمی جنگ اپنے فیصلہ کن دور سے گذر رہی تھی اور پوری دنیا میں برٹش سرکار کے پھیلے ہوئے ہاتھ پاؤں کے پھیلے رہنے کی اب گنجائش کم ہی رہ گئی تھی۔ وفد کی واپسی کے بعد لیبر سرکار نے اقتدار ہندستانیوں کو منتقل کر دینے کا تاریخی اعلان کیا۔ اس کے بعد ہی وزیر اعظم اور وائسرائے ہاؤس سے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ کو مرکزی اور علاقائی اسمبلیوں کے جلد الیکشن کا اعلان ہوا۔ علاقائی اسمبلیوں اور مرکزی اسمبلی کے مشورے سے ہندستان کے لئے ایک مناسب آئین بنانے کے لئے ایک مجلس دستور ساز کا انعقاد اور ہر ایک مکتب فکر کے نمائندوں پر مبنی ایک ایکزیکیوٹو کونسل (Executive Council) بنانا اور اسے عبوری کابینہ کا درجہ دئے جانے کے امکانات کا بھی اعلان کیا گیا۔ ان اعلانات سے واضح ہو گیا کہ ہندستان کی آزادی کی لڑائی اب اپنی منزل

پر پہنچنے ہی والی ہے اور جدوجہد کے طویل سفر کا خاتمہ ہونے والا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اہم سوال بھی ابھر کر سامنے آرہا تھا کہ صدیوں سے ساتھ رہنے والے ہندستانیوں کی دو اہم اکائیاں ''ہندو'' اور ''مسلمان'' اس آزادی کا خیر مقدم کس انداز میں کرتی ہیں؟

۱۹۴۶ کی ابتدا میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت Separate Electorate کی بنیاد پر الیکشن ہوئے۔ اس الیکشن کے نتائج نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کے درمیان مسلم لیگ نے اپنی حیثیت کافی مضبوط کر لی تھی اور کچھ کو چھوڑ کر پورے ہندستان میں مسلمانوں کے درمیان اسی ذہنیت کا واضح اثر تھا۔ مغربی سرحدی خطہ کو چھوڑ کر ہر صوبے اور مرکزی اسمبلی کی مسلم سیٹ پر مسلم لیگ کے نمائندے کامیاب ہو کر آئے تھے۔ وہ علاقہ، جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، وہاں مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ وہی تنہا جماعت ہے، جو ان کی جان اور مال، سیاسی اختیار، ثقافتی اور مذہبی مفادات کا تحفظ کر سکتی ہے۔ ایک بات ہمیں ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اس وقت الیکشن بالغ رائے دہندوں (Adult Franchise) کی بنیاد پر نہیں ہوئے تھے۔ رائے دہندوں کے لئے تعلیمی اور معاشی حیثیت کی شرطیں متعین تھیں، حدیں طے تھیں، اس لئے چناؤ کے نتیجہ کو سب مسلمانوں کے جذبات کا اظہار نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے ۱۹۳۷ سے ۱۹۴۷ تک کانگریس اور مسلم لیگ کی کش مکش نے مسلمانوں کا جو ذہن بنایا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ عام مسلمان ہندوؤں سے اور مستقبل کی ہندو اکثریت پر بنے جمہوری ہندستان کے تصور سے گھبرا سے گئے تھے اور انہیں اپنی خیریت پاکستان کی سرحدوں میں ہی محفوظ نظر آنے لگی تھی۔ لیکن قوم پرست مسلمان اور انسانی اقدار میں یقین رکھنے والے لوگوں کے سامنے پریشان کن مسئلہ تو ایسے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا تھا، جو ممکنہ تقسیم کے بعد تجویز شدہ ''پاکستان'' اور ''ہندستان'' میں رہ جانے والے تھے۔ مسئلہ الجھا ہوا بھی تھا اور خطرناک بھی، لیکن دونوں طرف نیتاؤں کا پڑھایا ہوا سبق اتنا سر چڑھا ہوا تھا کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، تقسیم کا کیا نتیجہ نکلے گا، ان سب الجھنوں پر کوئی دھیان دینے کو تیار ہی نہیں تھا۔ حالات کے تجزیہ کے بعد کچھ دانشوروں کا ماننا ہے کہ اکثریتی ہندو چونکہ مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے اور وہ اقتدار میں مسلمانوں کی حصہ داری کے لئے بخوشی تیار نہیں تھے، اس لئے مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق اور سہولتوں کی آئینی اور قانونی ضمانت چاہتی تھی اور پاکستان کی مانگ تو وہ محض سودا بازی

(Bargain) کے لئے کر رہی تھی، حالات نے اسے ہی حقیقی روپ دے دیا۔ لیکن حقائق واضح کرتے ہیں کہ مسلم لیگ میں ایسے لوگوں کی تعداد کچھ ہی رہی ہو، ویسے لوگ زیادہ تھے جو پاکستان میں ایک اسلامی حکومت کا خواب دِلوں میں سنجوئے ہوئے تھے۔ اس لئے عام مسلمانوں کے ذہن میں پاکستان کا تصور ایک ایسی حکومت کی تھی، جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت ہوگی اور انہیں اکثریتی ہندوؤں سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اس ذہنیت کی گہرائی کا انداز ہم صرف بہار کے سیاسی منظرنامہ کا تجزیہ کرکے لگا سکتے ہیں۔ ۱۹۳۷ کے الیکشن میں مسلم لیگ ایک بھی امیدوار کھڑا کرنے کی حالت میں یہاں نہیں تھی، کیونکہ اس کا وجود ہی یہاں نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۴۶ میں ہوئے الیکشن میں چالیس محفوظ مسلم سیٹوں میں ۳۶ پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے۔ مرکزی اسمبلی کے عام طور پر سبھی مسلم امیدوار لیگ کے چُنے ہوئے تھے۔ یعنی ہر طبقہ اور ہر خطّہ کے مسلمانوں پر اپنا گہرا اثر ڈالنے میں مسلم لیگ کامیاب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی باوقار بقا، جان و مال کی محافظت، حقوق اور سہولتوں کی حصولیابی کی ضمانت کے آئینی پہلو مسلم لیگ کی کوششوں میں ہی نظر آنے لگے تھے۔ آزادی کی پہلی قسط کی شکل میں ۱۹۳۷ میں بنی سرکار، ان کی حصولیابیاں اور ووٹ کے دباؤ کے نتائج سامنے آچکے تھے۔ ہر میدان میں مسلمانوں نے خود کو بُری طرح پٹا پٹایا اور نظرانداز کیا ہوا محسوس کیا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جب ہندو مسلمانوں کے جائز حقوق مہیا کرانے کی بھی ضمانت نہیں دے سکتے، تو خاص سہولتیں دینی تو الگ بات ہی ہے۔ ایسے لوگ جو مشترکہ قومیت کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ہندستان کے روشن مستقبل کا فقط ایک متبادل مانتے تھے، تعداد میں کم نہیں تھے، لیکن حالات کے مدِّنظر ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی تھی۔ مشتعل جذبات کے طوفان میں اُدھر کوئی کان دینے والا نہیں تھا۔

لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹرافورڈ کرپس اور البرٹ وائی الیکزینڈر پر مبنی کابینہ مشن ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ کو ہندستان آیا۔ اس مشن کا مقصد یہاں کے حالات کا تجزیہ کر ہندستانیوں کے ہاتھوں میں جلد اقتدار کی منتقلی کا آئینی خاکہ تیار کرنا تھا۔[۱] اس سلسلہ میں شملہ میں دوسری کانفرنس ۵ اور ۱۲ مئی ۱۹۴۶ کے درمیان ہوئی۔ اس مشن نے ۱ اپریل سے ۱۷ اپریل تک کئی نشستیں کیں اور ۴۷۲ آدمیوں سے انٹرویو لیا۔ لیکن بدقسمتی سے کانگریس اور مسلم لیگ کا کسی فارمولے پر اتفاق نہیں ہو سکا، کوئی مناسب نقشہ نہیں ابھر سکا۔ نتیجتاً اس مشن کو اپنا ہی فارمولا ہندستانی لیڈروں کے

سامنے پیش کرنا پڑا، جس کے تحت کچھ فوری اور کچھ دوررس اسکیم سامنے آئی اور انہیں بنیاد پر ہندستان کے الجھے ہوئے آئینی مسائل کے حل کی تلاش کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اس اسکیم کے مطابق دیسی ریاستوں سمیت ایک ایسے فیڈرل ہندستان کا خاکہ ابھرتا تھا، جہاں اسمبلی میں اہم مذہبی اور فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے ہندو اور مسلمان ممبروں کی اکثریت کی منظوری ضروری ہوتی۔ مرکزی سرکار دفاع، غیر ملکی معاملوں اور نقل وحمل وزارتوں کی ذمہ دار ہوتی اور ایک مجلس دستور ساز کا انعقاد ہونا تھا، جو ہندستان کا آئین تیار کرنے کے لئے مجاز ہوتی۔ اقلیتی مسلمانوں کے مفادات کے مدنظر ریاستوں کو تین گروپوں میں بانٹنے کی بات بھی ہوئی تھی اور انہیں آئین بنانے کا اختیار بھی دیا گیا تھا، لیکن عبوری مرکزی سرکار کے انعقاد کے سوال پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ ''کیبنٹ مشن'' متحد آزاد ہندستان کی منزل تک پہنچنے کی آخری کوشش تھی، لیکن بدقسمتی سے بات چیت کے طویل دور میں الجھنیں ہی پیدا ہوتی گئیں اور دونوں اہم پارٹیوں کے لئے قابل قبول ایک متحد ہندستان کا نقشہ واضح شکل میں سامنے نہیں آسکا۔ کانگریس اور لیگ اپنے اپنے موقف میں لچک نہیں پیدا کر سکیں اور قومی مسائل کے الجھے تاروں کو سلجھانے کے لئے ملک کی تقسیم کے علاوہ کوئی راستہ متبادل کے طور پر سامنے نہیں آسکا۔ مجبور ہو کر لارڈ ویویل کی مرضی سے جواہر لال نہرو کی قیادت میں عبوری سرکار کا انعقاد ہوا اور آئینی الجھنوں کے حل کی تلاش میں کچھ پیش رفت ہوئی، لیکن مسلم لیگ نے اس سرکار میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً بعد میں ایک خالص کانگریسی عبوری سرکار ۲ ستمبر ۱۹۴۶ کو بنی۔ کچھ دنوں کے بعد مسلم لیگ بھی اس میں شامل ہوئی، لیکن تعاون میں گرم جوشی کا فقدان تھا، کیونکہ مسلم لیگ کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو رہا تھا، اس کے خوابوں کا ملک وجود میں نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے درمیان بات چیت اور تبادلہ خیال کا سلسلہ چل رہا تھا، تو دوسری طرف ''فرقہ واریت'' کو بھی ہوا دیا جا رہا تھا۔ ایک طرف ''لڑ کے لینگے پاکستان، مر کے لینگے پاکستان'' کے نعرے لگتے تھے، تو دوسری طرف 'متحد بھارت' اور 'بھارت ماتا کی جے' کے نعروں سے ماحول گونجتا تھا۔ ٦ جولائی ۱۹۴۶ کو جواہر لال نہرو نے کانگریس صدر کی حیثیت سے ایک بیان دے دیا تھا کہ جو معاہدے ہوئے ہیں، وہ مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ کی شرکت اور مجلس دستور ساز کے انعقاد تک ہی ہے۔ اس کے بعد کی پالیسی بعد میں حالات کے مطابق طے ہوگی۔ اس بیان پر

مسٹر جناح کا بڑا سخت ردعمل ہوا، اسے کانگریس کی وعدہ خلافی مانا اور ان کا رخ اور سخت ہوگیا۔[۲]
۱۶ اگست ۱۹۴۶ کو مسلم لیگ نے کلکتہ میں Direct Action Day منانا طے کیا تھا۔ طرح طرح کی افواہوں کے نتیجے میں کلکتہ میں زبردست ہندو مسلم فساد ہوئے، جس میں پانچ ہزار (۵۰۰۰) لوگ مارے گئے اور پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) زخمی ہوئے تھے۔ اس ''ڈائرکٹ ایکشن'' کے بارے میں بھی کافی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔ مسلم لیگ کا مقصد کلکتہ کے اسپلینڈ گراؤنڈ میں ایک بڑی ریلی منعقد کرا اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا، تاکہ برٹش سرکار اور کانگریس پر دباؤ بنا کر مسلم مفادات کے تحفظ کی آئینی ضمانت حاصل ہو سکے۔ شرپسند عناصر نے اس ریلی کو مشتعل بھیڑ میں بدل دیا۔[۳] شہید سہروردی کی مسلم لیگ کی ریاستی سرکاری مشنری تماش بین بنی رہی۔ ان دنوں مشرقی بنگال کے نواکھالی اور ٹیپرا میں بھی ہندو مسلم فسادات کا ننگا ناچ ہوا۔ اس کا ردعمل بہار میں بڑے زبردست انداز میں ہوا۔ سارن، پٹنہ، گیا اور مونگیر کے بڑے علاقوں میں ہندوؤں نے اپنی بربریت کے ننگے ناچ سے نواکھالی میں مسلمانوں کے ذریعہ ہندوؤں پر کئے گئے ظلموں کا بدلا سیکڑوں برسوں سے ساتھ رہ رہے اپنے بے گناہ پڑوسی مسلمانوں سے لیا۔[۴]

گاندھی جی ملک کی حالت سے بہت فکرمند اور پریشان تھے۔ ان کے اصول اور اعتقادات کا ان کی زندگی میں ہی مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ مشترکہ قومیت، عدم تشدد، صداقت اور بھائی چارگی سب کو ہندستان کے اقتدار کی سیاست نے داؤ پر لگا دیا تھا۔ نواکھالی کے افسوس ناک واقعات نے انہیں بے چین اور چوکنا کر دیا تھا۔ فرقہ واریت کا زہر ابھی تک شہروں تک ہی محدود مانا جاتا تھا، عام ہندو مسلم غریب گاؤں والوں کے درمیان آپسی تعلق تلخ نہیں ہوئے تھے۔ سیاسی کھیل کے زہر اب تک گاؤں نہیں پہنچے تھے، لیکن نواکھالی اور اس کے آس پاس ہندو اور مسلمانوں کا ٹکراؤ، ان کے تعلقات کا کڑواپن ان کے آپسی رشتوں کو انتہائی نازک اور خطرناک انجام کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ جب بہار میں اس کا سخت ردعمل ہوا، تو یہاں بھی شہروں سے زیادہ گاؤں ہی متاثر ہوئے۔ فسادات کے اس بدلے روپ نے واضح کر دیا تھا کہ فرقہ واریت کی زہریلی ہوا اب شہروں تک ہی محدود نہیں، گاؤں کے سیدھے سادے لوگ بھی فریب میں مبتلا ہو چکے ہیں اور ''آزادی'' بہت ہی مہنگی قیمت چاہتی ہے۔

گاؤں میں اس بیماری کو مزید نہیں پھیلنے دیا جائے، اس مقصد سے اکتوبر میں گاندھی

جی اپنے چند معاونوں کے ساتھ مشرقی بنگال کے لئے چل پڑے۔ وہ پہلے کلکتہ پہنچے، جہاں فرقہ واریت اپنا ننگا ناچ ناچ رہی تھی۔ اسی درمیان بہار کے ایک حصے میں بھی مسلمانوں پر قہر ٹوٹ رہا تھا۔ گاندھی جی کے بنگال کو اولیت دئے جانے پر کچھ لوگوں کا اعتراض بھی ہوا تھا۔ ایک انار سو بیمار، گاندھی جی کہاں کہاں جاتے؟ آگ تو لگ بھگ پورے ملک میں لگی ہوئی تھی۔ گاندھی جی نے بہاریوں کے نام اپنی اپیل میں کہا تھا:

> ''یہ بہار ہی ہے، جہاں ہندستان میں پہلی بار ''ستیہ گرہ'' کا جنم ہوا، یہ بہار ہی ہے، جہاں سے ہندستان میں میری سیاسی زندگی شروع ہوئی۔ میں نے بہاریوں کے لئے انتھک محنت کی ہے اور بہاریوں کا پیار بھی مجھے ملا ہے۔ آج راجندر بابو اور برج کشور بابو کا بہار پاگل ہو گیا ہے اور ہندستان کے نام پر دھبہ لگا رہا ہے۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ اگر ہندستانی انگریزوں کے خلاف بھی پاگل پن کا مظاہرہ کرینگے، تو مجھے زندہ نہیں پائیں گے۔ آج بے قصور ہندستانی مسلمانوں پر جو قہر توڑا جا رہا ہے اُسے دیکھنے کے لئے میں کیونکر زندہ رہوں گا۔''[5]

بہاریوں کے نام اپیل کرنے کے بعد انہوں نے اپنا کھانا کم کر دیا اور اعلان کیا کہ اگر بہاری ہندو سمجھ سے کام نہیں لینگے، تو بھوکے رہ کر وہ اپنی جان قربان کر دینگے۔ گاندھی جی نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو تار بھیج کر بہار پہنچنے کو کہا۔ جواہر لال جی کے ساتھ مسلم لیگ کے عبدالرحمٰن نشتر بھی پٹنہ پہنچے تھے۔ جواہر لال نہرو جی کے پٹنہ پہنچنے سے فسادات کا سلسلہ رکا اور جب اس کی اطلاع گاندھی جی کو مل گئی اور کلکتہ کی حالت کچھ سنبھلی، تو نومبر میں انہوں نے نواکھالی کا سفر شروع کیا اور فروری تک وہ مشرقی بنگال کے گاؤں گاؤں گھومتے رہے۔ گاندھی جی کا یہ پیدل سفر تاریخی ہونے کے ساتھ بہت خطرناک بھی تھا، کیونکہ وہ اس علاقہ کے سفر پر نکلے تھے جہاں فرقہ واریت نے ماحول کو زہریلا بنا دیا تھا، دو قومی نظریہ کی بنیاد پر اس علاقہ کو پاکستان بنانے کی تیاری لگ بھگ پوری ہو چکی تھی اور گاندھی جی اصولی طور پر اس نظریہ کی مخالفت کر رہے تھے اور مسلم لیگ کے نظریہ سے پاکستان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہی بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ گاؤں گاؤں گھومنا بڑا خطرناک تھا۔ لیکن گاندھی جی دوتی،

امن، پیار اور بھائی چارہ کا پیغام لے کر اپنے مشن پر نکلے اور فروری کے آخر تک ان کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اپنے اس سفر کے بارے میں انہوں نے خود کہا، ''میرا موجودہ مشن میری زندگی کا سب سے دشوار اور الجھا ہوا مشن ہے۔ میں ہر اچھے اور بُرے کے لئے تیار ہوں۔ 'کرو یا مرو' کی یہ آزمائش ہوگی۔ 'کرو' کا مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو امن وسکون اور دوستی سے رہنا سیکھنا ہوگا یا پھر اس کوشش میں مجھے مرنا ہوگا۔'' ۷ نومبر ۱۹۴۶ سے ۲ مارچ ۱۹۴۷ تک گاندھی جی کا یہ مشن چلا۔ ان کے ساتھ نرمل کمار بوس، پرشورام، منو گاندھی تھے۔ ڈاکٹر سوشیلا نیر، پیارے لال، سوچیتا کرپلانی اور آبھا گاندھی دوسرے گاؤں میں کام کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ نہ کوئی پولس کی جماعت ساتھ میں تھی اور نہ کوئی محافظ دستہ۔ اس مہم کے درمیان گاندھی جی نے ۴۹ گاؤوں میں پڑاؤ ڈالا۔ سویرے چار بجے وہ لوگ نکلتے، گاؤں کے کسی مسلمان کسان کے گھر میں رہنے کی اجازت مانگتے، اجازت مل جانے پر رک جاتے، نہیں تو کسی دوسرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ کہیں ان کا خوشی خوشی خیر مقدم ہوتا، تو کہیں جھڑکیاں ملتیں، کچھ دن ہر ایک گاؤں میں وہ رکتے۔ وہ لوگ اپنا کھانا خود بناتے تھے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مسلمان ان کے پرستار بنتے چلے گئے۔ نواکھالی اور ٹیپرا کے آس پاس کے ماحول میں کچھ براہ راست تبدیلی دیکھنے میں آئی اور فرقہ وارانہ جنون کم ہوا، ہندو اور مسلمان دوبارہ امن وسکون سے رہنے لگے۔ ہندوؤں کے لوٹے ہوئے اثاثے واپس کیے گئے۔ ہندوؤں کی زمین پر جو طاقت کے زور پر مسجدیں بنادی گئی تھیں، انہیں مسلمانوں نے خود ہٹایا اور ہندوؤں کے مکانوں کی مرمت کی۔ گاندھی جی کا یہ یک نفری مشن (One Man Mission) کامیاب ہوا۔

گاندھی جی ۵ مارچ ۱۹۴۷ کو فرقہ واریت کی آگ میں جھلس رہے بہار پہنچے اور اس وقت کی سرکار میں وزیر تعلیم سید محمود کے ساتھ ٹھہرے، وہیں ان کا کیمپ دفتر بنا۔ خان عبد الغفار خان، جنرل شاہ نواز خان، مردُلا سارا بھائی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ متاثرہ علاقوں کا دورہ شروع کیا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۴۷ کو پٹنہ میں انہوں نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''امن پسند بہار والوں کے اس پاگل پن پر میں حیران ہوں۔ ایسے لوگ جو یہ سوچ رہے ہوں کہ انہوں نے نواکھالی کا بدلہ لے لیا، تو وہ غلطی پر ہیں۔ میں سختی کے ساتھ یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ بدلا کبھی نہیں۔ اس ملک کے ایک

فریق کو دشمن ماننے والے رجحان کا بڑھنا خودکشی کے برابر ہے۔ یہ ذہنی میلان غلامی کا جوا کندھے پر بنائے رکھنے میں مددگار ہوگا۔ ایسا ذہنی میلان، علاقائیت اور کٹر پن کو مضبوط بنائے گا، جو ہندستان کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ ماحول تو ایسا بننا چاہئے، جہاں ہر ایک آدمی خود کو ملک کا بنانے والا سمجھے اور اپنی کمزوریوں کے لئے سب اپنے کو ذمہ دار مانیں۔"[6]

جب گاندھی جی محبت، شانتی، رواداری، جیو اور جینے دو، ہندو مسلم اتحاد اور آپسی تعاون کا پیغام لے کر بنگال، بہار اور دلّی میں لگی قومی آگ کو بجھانے کی کوششوں میں لگے تھے، کانگریس اور مسلم لیگ اقتدار اور اقتدار میں مناسب حصہ داری نہیں، تو ملک کو منقسم کئے جانے کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ برسوں کی تمنا اور مجاہدین آزادی کی قربانیوں کے نتیجے میں آزادی کا سویرا سامنے دکھ رہا تھا، لیکن ہندستان میں ہندو مسلم اتحاد اور محبت کے رشتے ٹوٹ رہے تھے، اقتدار کی سیاست اپنا رنگ دکھا چکی تھی اور صدیوں میں بنا رنگا رنگ ماحول ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ تقسیم ملک کے منصوبے نے پشاور سے کنیا کماری تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو خیموں میں بانٹ دیا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات آگ زنی، عصمت دری، اغوا، لوٹ مار کی شکلوں میں ظاہر ہو رہے تھے۔ ماحول زہریلا بن چکا تھا اور کوئی کسی کا سننے والا نہیں تھا۔ گاندھی جی اس قیامت کی گھڑی میں اقتدار کی کش مکش سے الگ انسانیت کو بربادی سے بچانے کی انتھک کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس بھیانک حالت میں بھی اگر لوگ کسی کی کوئی بات سننے کو کچھ تیار بھی تھے، تو وہ ان کی ہی شخصیت تھی۔ لیکن گاندھی جی کہاں کہاں جاتے؟ عدم اعتمادی اور خود غرضی نے ہندستانیوں کو جذبات کے طوفان میں بالکل اندھا بنا دیا تھا۔ دلّی میں اقتدار کی منتقلی کی سیاسی سرگرمیاں اپنی انتہائی عروج پر تھیں اور برٹش سامراجیوں کا نمائندہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن فیصلہ کی کنجی لئے لوگوں سے کرتبیں کروا رہا تھا۔

مارچ ۱۹۴۷ کے آخر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی جی کو انتہائی ضروری مشورہ کے لئے دلّی بُلایا۔ یعنی وہی کانگریس اور مسلم لیگ کے اقتدار کی کش مکش، جہاں گاندھی جی کے مشوروں کو کوئی ماننے کو تیار نہیں دکھا۔ اپریل کے وسط میں وہ دوبارہ بہار واپس آگئے۔ بہار کی حالت کچھ سنبھلی، تو بنگال میں فرقہ واریت دوبارہ بھڑک اٹھی۔ پنجاب سے بھی فسادات کی خبر

آنے لگی تھی۔ ہندستان کی قسمت کے فیصلے کے لئے کانگریس مجلس عاملہ کی نشست پہلی مئی کو ہونے والی تھی۔ گاندھی جی کو وہاں بُلایا گیا تھا۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ سے مجلس دستور ساز کی نشستیں شروع ہوئی تھیں، لیکن مسلم لیگ کے مقبول عام رہنما مسٹر جناح نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جاری تھا۔ انسانیت سرِ عام ذلیل ہو رہی تھی اور ہر ذمہ دار حساس انسان ہندستان کے مستقبل کے لئے متفکر تھا۔ آپس میں ہندو مسلمان جس طرح بر سرِ پیکار تھے، شیطان کو بھی شرم آ رہی ہوگی۔ اسی بیچ برٹش وزیر اعظم اٹیلی نے سمجھوتے کی ایک اور پہل کی اور پنڈت نہرو، سردار بلدیو سنگھ، مسٹر جناح اور لیاقت علی خان کو لندن بات چیت کے لئے بُلایا، لیکن کوئی حسب خواہ نتیجہ وہ نہیں نکال سکے۔ لہٰذا ۶ دسمبر کو انہوں نے اعلان کر دیا کہ مجلس دستور ساز مسلم لیگ کی حصہ داری اور اتفاق کے بغیر اگر کوئی آئین بنائے گی تو برٹش سرکار اسے دوسری پارٹی یعنی مسلم لیگ یا مسلمانوں پر اسے زبردستی تھوپنا مانے گی۔ اس اعلان نے مسٹر جناح کے ہاتھوں میں کنجی دے دی۔ گاندھی جی اس کوشش میں لگے رہے کہ حل کا کوئی باوقار راستہ نکلے اور ہندستان منقسم نہ ہو، ہندو اور مسلمان مذہب کی بنیاد پر الگ نہ ہوں، مگر ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ ہندستان بٹے نہیں، اس لئے گاندھی جی مسٹر جناح کو وزیر اعظم ماننے کو تیار تھے، لیکن کانگریس کے دوسرے بڑے لیڈر رضامند نہیں دِکھے۔ برٹش سرکار نے نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک منصوبہ کے ساتھ ہی بھیجا تھا اور وہ منصوبہ تھا ''ملک کی تقسیم''۔ ہندستان کے اقتدار کی سیاست اور نیتاؤں کے بے لچک نظریہ اور سامراجی سازشوں نے گاندھی جی کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ کانگریس نے تقسیم کو منظور کر لیا۔ برٹش ڈپلومیسی اپنا کر ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اہم لیڈروں کو اپنے منصوبے کا حامی بنا لیا اور متحد ہندستان کی تقدیر ہمیشہ کے لئے سیل کر دی گئی۔ ۷ مئی کو اپنی پرارتھنا سبھا میں گاندھی نے کہا، '' کانگریس نے پاکستان کو مان لیا ہے اور پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی متفق ہو گئی ہے۔ میں جس طرح ہندستان کی تقسیم کا پہلے مخالف تھا، آج بھی اسی طرح مخالف ہوں۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟ کوئی میری سنتا ہی نہیں۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ میں خود کو اس سے الگ کر لوں۔''[۲]

۳ جون ۱۹۴۷ کو لندن سے ہندستان کے بٹوارے کے نئے منصوبے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے مطابق ہندستان کو بانٹ کر ایک نئے آزاد ملک ''پاکستان'' کے قیام نے حقیقی

روپ لیا اور ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو دو آزاد ممالک ''پاکستان'' اور ''ہندستان'' نفرت کی فضا میں آگ اور خون کے دریا سے اُبھر کر سامنے آئے۔ گاندھی جی کی مشترکہ قومیت کے تصور نے دم توڑ دیا۔ مشہور امریکی صحافی لوئی فیشر نے گاندھی جی کے دلی کیفیت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

''۳۲ برسوں کی کوششوں کا اختتام نہایت تکلیف دہ ہوا۔ ۱۵ اگست کو ہندستان آزاد ہو جائے گا، یہ فتح صرف سیاسی اعتبار سے ہوئی ہے، جہاں انگریز بیٹھے تھے اب وہاں ایک ہندستانی ہوگا، یونین جیک کی جگہ پر ترنگا لہرائے گا۔ آزادی کا یہ کھوکھلا نقشہ ہوگا۔ یہ ایک درد بھری جیت ہے۔ ایسی جیت، جہاں فوجیوں نے خود اپنے جنرل کو ہی شکست دیا ہے۔''[۸]

گاندھی جی کے نام ان دنوں آئے خط گالیوں سے بھرے ہوا کرتے تھے۔ ہندوؤں کی جانب سے لعنت وملامت کی بوچھار اس لئے ہو رہی تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی مسلمانوں کی غیر مناسب طرفداری کر رہے ہیں۔ ان کی نامناسب حمایت کر ان کی ''پشت پناہی'' کر رہے ہیں اور مسلمان اس لئے انہیں کوس رہے تھے کہ وہ پاکستان کی راہ میں انہیں ہی سب سے بڑی رکاوٹ مانتے تھے۔ یہ گاندھی جی کی عجیب بدقسمتی تھی۔ جب ہندستان آزاد ہوا، آزادی کی لڑائی کا مقبول عام سپہ سالار خود کو بالکل اکیلا پا رہا تھا، وہ دلی اذیتیں جھیل رہا تھا۔ اس تکلیف دہ احساس نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا کہ ہندستان میں ان کا ''عدم تشدد'' ناکام رہا۔ صحت مند اقدار کی بنیاد پر ہندستانیوں کو ایک مثالی ملک کا شہری بنانے کی ان کی ساری کوششیں برباد ہوئیں۔ جن ہندستانیوں پر انہوں نے اٹوٹ اعتماد کیا تھا، ٹھیک آزمائش کی گھڑی میں کوئی ان کا ساتھ نہیں دے سکا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۸ کے رائل امپائر سوسائٹی میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا:

''ہندستان میں لوگ مہاتما گاندھی کا رُوزویلٹ یا چرچل سے موازنہ نہیں کرتے، انہیں دیوتاؤں کی سی عظمت عطا کرتے ہیں، لاکھوں انہیں مہاتما کہتے ہیں اور ان کا پاؤں چومنا اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انہیں عزت دی، قابل احترام اور لائق پرستش مانا، مگر ان کی شخصیت کو مجروح کیا، لوگوں نے ان پر اعتماد کیا، لیکن ان کے اصولوں پر نہیں۔''[۹]

جب ۱۵ اگست کی ۱۲ بجے رات میں ہندستان کی آزادی کا اعلان ہوا، بابائے قوم

آزادی کے جشن میں شریک نہیں تھے۔ وہ تو کلکتہ کے بیلیا گھٹا کے لٹے لٹائے ایک مسلمان کے گھر ''حیدری ہاؤس'' کے ایک اندھیرے کمرے میں دنگوں کے شکار لوگوں کے زخموں کی مرہم پٹی کے منصوبے بنا رہے تھے۔ آزادی کے پہلے ہی دن انہوں نے اُپواس (فاقہ کشی) کیا، کمرے میں روشنی نہیں جلائی، وہاں کھڑکی کے ٹوٹے شیشے بکھرے پڑے تھے، جو دنگائیوں کے پھینکے پتھروں کے سبب ٹوٹے تھے۔ قوم کے نام کوئی پیغام نہیں دیا۔ آخرکار کس خوشی میں پیغام دیتا؟ ان کی باتیں نہ مسلمانوں نے مانیں اور نہ ہندوؤں نے، نہ کانگریسیوں نے مانیں، نہ مسلم لیگیوں نے۔ آج اکیلا وہ ایسے موڑ پر کھڑے تھے، جہاں ان کے اصول بے آبرو ہو رہے تھے اور اقتدار کو للچائی نظروں سے دیکھ لپکنے والے ان کے پرستار ان سے آنکھیں ملانے سے بھی کترا رہے تھے۔

قومی اختلافات، آپسی ٹکراؤ اور نفرت سے ہندستان اور ہندستانیوں کو جتنی بڑی بربادی کا سامنا کرنا پڑا، ان کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی ہے۔ اس وقت کے حالات کا تجزیہ مجاہد آزادی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات کے سلسلے کو ختم کرنے کے لئے ملک کی تقسیم ہوئی۔ ملک کی تقسیم کے سبب وہی چیز ایسی بھیانک صورت میں پیش ہوئی، جس سے بچنے کے لئے تقسیم کو منظور کیا گیا تھا۔ ایسی صورت حال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جسے دیکھتے ہوئے آدمی کے عقل اور شعور پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ چھ لاکھ بچے، عورتیں اور مرد مارے گئے۔ انہیں مارنے، عصمت دری اور ظلم کے شرمناک اور ظالمانہ ڈھنگ پاگلوں کی طرح اپنائے گئے۔ ڈیڑھ کروڑ لوگ اجڑے اور دوبارہ بسنے کے لئے انہیں ایسے علاقوں میں آباد ہونا پڑا، جہاں نہ خوش آمدید کہنے والا کوئی خیر خواہ تھا، نہ کوئی حال پوچھنے والا ہمدرد۔ تاریخ میں یہ سب سے بڑی منتقلی کی مثال تھی۔ تاریخ عالم میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ آج بھی لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ ہندوؤں نے زیادہ حیوانیت کا مظاہرہ کیا تھا یا مسلمانوں نے۔''[10]

برصغیر ہند میں سیاسی کش مکش کے نتیجوں میں جو حالت بن گئی تھی، اسے دیکھ کر دنیا کے

دوسرے ملک حیران تھے۔ صدیوں سے ساتھ رہ رہے لوگوں نے ایک دوسرے کے لئے جو رویہ اپنایا تھا، وہ ان کے اندازے سے پرے تھا۔ لندن کے ''سنڈے ٹائمس'' کے مدیر ایچ۔ بی۔ ہاڈسن نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''ہندستان میں ایک ہی وقت میں دو انقلاب ہو رہے ہیں۔ پہلا ایک سو پچاس سالہ برٹش سرکار سے نجات اور حصول آزادی اور دوسرا ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک دوسرے سے جدائی۔ ہزار سالہ اسلامی اقتدار اور پیش قدمیوں کا شدید ردعمل، اس سے مکمل طور سے انکار کا ہندوؤں کا ذہنی میلان۔''[11] اس ذہنی رجحان کے بُرے اثرات سے فوجی جوان، پولس والے بچ سکے نہ انتظامی افسران ہی۔ لوٹ مار اور فسادات کے درمیان ان کی غیر جانبداری جاتی رہی۔ اکثر وہ فسادیوں کے معاون بن گئے۔ پنجاب باؤنڈری فورس کے کمانڈر ٹی۔ ڈبلیو۔ ریز نے اپنی پہلی رپورٹ میں کہا تھا: ''فرقہ واریت بھیانک شکل میں اپنی انتہائی حد پر تھی۔ قتل اور لوٹ مار کی بربریت عہد وسطیٰ کی حیوانیت کو مات کر رہی تھی۔ نہ عمر کا خیال رکھا گیا اور نہ عورت مرد کا۔ سینوں سے بچوں کو چپکائی ماؤوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ گولیوں سے انہیں چھید ڈالا گیا، چھاتیوں میں برچھے اتار دئے گئے، دونوں طرف بے رحمی اور تشدد کا یکساں مظاہرہ کیا گیا۔''[12]

امریکی اخبار ''لائف'' کے خصوصی خبر رساں نمائندہ مارگریٹ برک وہائٹ ۱۹۴۷ میں ہندستان اس لئے آئی تھی کہ دونوں نئے ملکوں کے ابتدائی دنوں کی ایک باتصویر رپورٹ وہ تیار کریں۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں اس خوفناک دور کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہجرت اور منتقلی آبادی کی تصویر پیش کرتے ہوئے انہوں نے بنی اسرائیلی یہودیوں کی جلاوطنی کا ذکر کیا ہے اور کہتی ہیں کہ بنی اسرائیل کی ہجرت کا اس سے کوئی موازنہ ہی ممکن نہیں ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ''جس وقت میں نے تصویر لینا شروع کیا تھا، اس وقت پچاس لاکھ سے زیادہ لوگ ادھر سے اُدھر ہجرت کر رہے تھے۔ آزادی کا سب سے پہلا کڑوا پھل ان کروڑوں لٹے لٹائے، برباد لوگوں کو مل رہا تھا۔ آزادی کی طویل لڑائی کے آخری دنوں میں دو قومیت کے نظریہ نے زور پکڑا تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں لگ بھگ سبھی مذہبی اکائیوں سے جڑے لوگوں نے مشترک طور پر اہم کردار ادا کیا تھا، لیکن آخر میں ملک کی تقسیم پر لوگوں کو مجبور ہونا پڑا اور

ایک ایسا نقشہ سامنے آیا، جس میں لوگوں کی ضرورتوں، اچھائیوں اور بھلائی کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ ہندو اور مسلمان دوکانداروں اور محنت کش مزدوروں کے مسائل ایک جیسے ہی تھے اور ہندستانیوں کے سامنے سکھی زندگی گذارنے اور اپنی آمدنی اور معیارِ زندگی کو اوپر اٹھانے کا سوال تھا۔ تقسیم نے اس میں رکاوٹ ڈالی۔ یہ بٹوارا بالکل غیر مناسب اور بے معنی تھا، لیکن اس بے معنی بٹوارے کو حقیقت بنانے کے لئے لوگ گروپ در گروپ کوشاں تھے...... سرحدوں کے پار سے قافلے پر قافلے آجا رہے تھے۔ راستے میں بچے پیدا ہو رہے تھے، لوگ مر رہے تھے، کچھ ہیضے کے شکار ہوئے، تو کچھ دوسرے مذہب کے ماننے والے پاگلوں کے حملوں کے، اور بہت سارے تو تھک تھکا کر سڑکوں کے کنارے پڑے اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اکثر ننھے بچوں کو ماں باپ یا دوسرے بزرگوں کے ہاتھوں کو گھسیٹتے دیکھا، انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ ہاتھ اب ان کو سہارا نہیں دے سکتے۔ سلطنت خداداد (ایشور کی دی ہوئی حکومت) کی آرزو لئے کتنے ہی لوگ سڑکوں پر دم توڑ رہے تھے...... وہ وہاں نہیں پہنچ سکے، سڑکوں پر ان کی قبریں بنتی گئیں...... مسائل الجھتے ہی جا رہے تھے، پاکستان کے بینکوں کا کاروبار بالکل ٹھپ تھا، کیونکہ کرانی زیادہ تر ہندو تھے اور وہ ہندستان بھاگ چکے تھے۔ دوکانیں اور بازار سُنسان تھے، ہندو دوکاندار ہندستان جا چکے تھے۔ انہوں نے اپنی پونجی وہاں منتقل کرا لی تھی۔ روئی کے بازار بالکل بند تھے، جوٹ کا ڈھیر پڑا تھا، کیونکہ جوٹ مل ہندستان میں پڑ گئے تھے۔ لوہے کے کارخانے ہندستان میں تھے۔ پاکستان میں ماچس کی بھی ایک فیکٹری نہیں تھی۔ دوسری طرف ہندستان کے چمڑے کے کاروبار میں لگے لوگ، درزی اور مستری کے پاکستان چلے جانے سے یہاں کی حالت بھی بگڑ گئی تھی۔ بدنظمی کی حالت پیدا ہوگئی تھی۔ امن کے لئے الگ ملک کی مانگ کی گئی تھی، مگر جب ایک الگ ملک وجود میں آیا گیا، تو لوگوں کو امن اور راحت نصیب نہیں ہوسکی۔ ایک سکھ

کو کہتے سنا...... اپنی زندگی میں اب ہمیں خوشی کے دن دیکھنے نصیب نہیں۔
مسلمانوں کا مستقبل بھی اب اندھیرے میں ہی ہے۔ وہ بھی ہماری طرح بے
بس اور لاچار ہیں...... ہم لوگوں کی طرح وہ بھی کہیں کے نہیں ہیں...... وہ
ہماری طرح تقدیر، قسمت کے شکار ہیں۔"[۱۳]

مشہور ناول نگار لاری کولنس ڈومینک لاپیرے لکھتے ہیں:

"......امرتسر سے لاہور تک عجیب قیامت کا منظر تھا۔ ۴۵ میل کے اس راستے
میں ہر ایک قدم پر لوگوں کی بے بسی اور بربریت کا ہی ثبوت ملتا تھا۔ ہر قدم
پر مرے ہوئے لوگوں کی لاشیں اور بدن کے حصے بکھرے ہوئے تھے۔
گدھوں نے اتنا پیٹ بھر لیا تھا کہ ان سے اڑا نہیں جاتا تھا اور کتے بھی آدمی
کے گوشت سے شکم سیر ہو چکے تھے، صرف گردے اور کلیجی کھا کر لاشوں کو
سڑنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔"[۱۴]

تقسیم سے پہلے اور اس کے بعد کتنے لوگ مارے گئے، اس کی صحیح گنتی ممکن نہیں۔ ایک سرسری سرکاری رپورٹ کے مطابق آزادی نے انسانی قربانی کی شکل میں جو قیمت وصول کی، وہ حسب ذیل ہے:

کلکتہ میں مرنے والے ہندو اور مسلمان برابر رہے اور دونوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ ۳۰ ہزار لوگ زخمی ہوئے۔[۱۵] نواکھالی میں سرکاری اندازہ کے مطابق ۲۵۰ لوگ مارے گئے، مگر کچھ لوگ یہ تعداد پانچ ہزار تک مانتے ہیں۔[۱۶] دلّی میں دونوں کے اندر لگ بھگ ۱۵ ہزار مسلمان مارے گئے، ۱۳۷ مسجدوں پر حملے ہوئے اور انہیں ناپاک کیا گیا، ان پر زبردستی قبضہ کیا گیا۔ ایک ہفتہ کے اندر ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں نے جان بچانے کے لئے دلّی سے بھاگنے کی راہ اپنائی اور دلّی کی مسلم آبادی آدھی رہ گئی۔[۱۷] بہار کے فسادات میں مارے جانے والے مسلمانوں کی تعداد ۵۳۴۴ کہی جاتی ہے۔ زخمی ہونے والے مسلمان ۱۴۵۱ تھے۔ وہاں فساد میں مارے جانے والے ہندو ۲۲۵ تھے اور ۳۰۳ زخمی ہوئے، ہندو زیادہ تر پولس کی گولی سے مرے۔ ۷۷۰ گاؤں میں فساد ہوئے اور ۹۸۶۹ گھر برباد کئے گئے۔ پورے پنجاب میں ہندو اور مسلمانوں کے مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد لگ بھگ برابر تھی۔ دونوں دو لاکھ سے ڈھائی لاکھ تک مارے

گئے۔ ملک کے دوسرے حصوں کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔[18]

ہندستان زندہ آباد، پاکستان زندہ آباد...... انسانیت؟

حواشی

۱۔ نکولس منسرگ، دی ٹرانسفر آف پاور، ۱۹۴۲۔۴۷، ہر مجسٹیز اسٹیشنری آفس، ۱۹۷۰۔۸۱، جلد ۷، ص ۳

۲۔ درگا پرساد، انڈیا فرام کرزن ٹو نہرو، ہارپر کونسل، نئی دلّی، ۲۰۰۰، ص ۲۲۷

۳۔ عائشہ جلال، دی سول اسپوکس مین، جناح اینڈ مسلم لیگ، ڈیمانڈ آف پاکستان، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، ۱۹۸۵، ص ۲۲۳

۴۔ وی۔ پی۔ مینن نے اپنی کتاب، دی ٹرانسفر آف پاور، اورینٹل لونگ مین، انڈیا ۱۹۵۷ میں اس وقت کے واقعات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

۵۔ یو۔ آر۔ راؤ، دی وے ٹو کمیونل ہارمونی، نوجیون، احمد آباد، ۱۹۶۳، ص ۱۷۱

۶۔ ایضاً، ص ۱۷۳ (گاندھی سنگرہالیہ، پٹنہ نے منو گاندھی کی گاندھی جی کے بہار قیام پر مبنی ڈائری ''بہار کی قومی آگ میں'' ۱۹۹۸ میں شائع کی۔ بہار کے دنگوں کی تفصیل اس میں مل جاتی ہے۔)

۷۔ لوئی فیشر، لائف آف مہاتما گاندھی، جوناتھن کیپ، لندن، ۱۹۶۲، ص ۵۰۲

۸۔ ایضاً، ص ۵۰۷

۹۔ ایضاً، ص ۵۰۲

۱۰۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، گلٹی مین آف انڈیاز پاٹیشن، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۶۰، ص ۳۳

۱۱۔ ایچ۔ ڈبلیو۔ ہڈسن، دی گریٹ ڈیوائڈ، ہچنسن، لندن، ۱۹۶۹، ص ۲۶۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۴۵

۱۳۔ مارگریٹ برک وہائٹ، ہاف وے ٹو فریڈم، سائمن اینڈ شوسٹر، نیویارک، ۱۹۴۹، ص ۱۲۔۱۳

۱۴۔ لاری کولنس، ڈومنیک لاپیرے، فریڈم ایٹ مڈنائٹ، سائمن اینڈ شوسٹر، نیویارک، ۱۹۷۵،

ص ۳۷۹

۱۵۔ جی۔ ڈی۔ کھوسلا، اسٹرن ریکاننگ، بھوانی اینڈ سنس، نئی دلی، ص ۶۶

۱۶۔ ایضاً، ۷۲

۱۷۔ شریف المجاہد، قائداعظم، اسٹڈیز اینڈ انٹرپٹیشن، قائداعظم اکادمی، کراچی، ۱۹۸۱، ص ۲۲۱

۱۸۔ جی۔ ڈی۔ کھوسلا، ص ۸۶

نئے ملک، نئی فضائیں

ہندستان آزاد ہوا، گردشِ دوراں کے بطن سے ایک تاریخی سچائی بن کر ہندستان کا ہی ایک حصہ ''پاکستان'' کی شکل میں وجود میں آیا۔ ''ایک قوم'' اور ''دوقومیت'' کے جھگڑے نے اس برصغیر سے بڑی قیمت وصول کی۔ آپس میں ہندستانی خوب لڑے، ایک دوسرے پر قہر بن بن کر ہندو اور مسلمان ٹوٹے اور شاید صدیوں کی رنجشوں کا حساب آگ اور خون کی ہولی کھیل کر وصول کیا۔ کل تک جو ایک تھے، وہ آج دو ہو گئے۔ دو حصوں میں بٹے لوگوں کی اب اپنی اپنی نئی دنیا تھی، نئے مسائل تھے اور مستقبل کے نئے منصوبے اور پالیسیاں۔

وقت کی نہ سمجھ میں آنے والی رفتار، اقتدار کی سیاست کا ٹیڑھا میڑھا حساب کتاب اور سامراجی سازشوں کی اچوک نشانہ بازیوں نے ہندستان میں عجیب گل کھلائے۔ اعتقاد رکھنے والے مذہبی ہندو اور مسلمان گلے ملتے نظر آئے، لیکن مغربی تہذیب سے متاثر پڑھے لکھے ایسے انگریزی داں لوگ جو ایک ساتھ کھانے پینے والے تھے، ان میں سے ہی کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایسی فضا بنا دی کہ انہیں ایک ساتھ رہنا اب گوارا نہیں تھا۔ نتیجتاً ملک کا بٹوارا ہو گیا اور یہ اس لئے ہوا کہ صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والے یہ ہندو اور مسلمان ناامیدی کی حد تک عدم اعتمادی کے شکار ہو کر مان بیٹھے کہ وہ اب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اپنے اپنے الگ ملکوں کی نئی سرحدوں میں ہی امن و سکون سے وہ رہ سکیں گے۔ ملک کی تقسیم نے کیسی بربادی لائی، ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ پھر بھی ہندو اور مسلمان زمین بانٹ کر الگ نہیں ہو سکے، کروڑوں مسلمان اور لاکھوں ہندو ہندستان اور پاکستان میں رہ گئے، انہوں نے اپنی تقدیر ان ملکوں سے ہی جوڑا، سیکڑوں برسوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ثقافتی رنگینیاں اور اپنی حب الوطنی کے گہرے نقوش مٹائے نہیں مٹ سکے۔ مسلمانوں کی اقتدار میں مناسب حصہ داری کے سوال کو سلجھانے کے لئے ایک الگ ملک پاکستان بنا کیونکہ غیر منقسم ہندستان میں اس مسئلہ کو حل کرنے میں ہم ناکام رہے تھے۔ لیکن مسئلہ کا حل تو ہوا ہی نہیں۔ دونوں ملکوں میں ہندو اور مسلمان اب بھی آمنے

سامنے ہیں اور ان کا ٹکرانا اکثر مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔

۱۹۲۰ کے برسوں میں ہی کچھ اہم ہندو لیڈروں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ مان کر انہیں دو قومیت کے دائرے میں محدود کرنے کی پہل کی تھی۔ اسی سوچ کو بنیاد بنا کر ۱۹۴۰ میں مسلم لیگ نے پاکستان کی مانگ کر دی اور اسے صحیح ثابت کرنے کے لئے لیگ کے رہنما محمد علی جناح نے اپنی قانون دانی کا کمال دکھلایا۔ جمہوریت کی وکالت کرتے ہوئے مذہب اور آبادی کے تناسب کو بڑی ہوشیاری سے استعمال کرتے ایک ایسا ماحول بنایا، جہاں یہ وہم پیدا ہو گیا کہ سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے والے ہندو اور مسلمان اب ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہندستان کے ان علاقوں کو کاٹ کر پاکستان بنایا گیا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، ہندوؤں کو ان سے ڈر ہو سکتا تھا، انہیں ہندوؤں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چودھری رحمت علی کے تصور کا پاکستان ہو، علامہ اقبال یا قائداعظم کے تصور کا، یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسلم اکثریت والے علاقوں کو ہی پاکستان بنانا مسلم لیگ کا مقصد رہا۔ قائداعظم کوئی کٹھ مُلا نہیں تھے، ایک اچھے اور کامیاب بیرسٹر تھے۔ ماڈرن انداز فکر، مغربی سیاست اور سیاسی اصولوں کے ہر پہلو پر ان کی گہری نظر تھی اور عوام کی ذہنیت کو بھی سمجھ رہے تھے۔ دو قومی نظریہ کی حقیقت کو جس کامیابی سے ثابت کیا، اپنے مقدمہ کو مضبوط بنایا، وہ ان کی قانون دانی کی اچھی مثال کہی جا سکتی ہے۔ کسی دوسرے مسلم لیگ رہنما کے دماغ میں دو قومی نظریہ کی کمزوریوں کا احساس رہا ہو یا نہ رہا ہو، قائداعظم کے سامنے یہ بات صاف تھی۔ پاکستان بننے سے صرف چار دن پہلے پاکستان مجلس دستور ساز میں اپنا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو انہوں نے واضح کیا تھا:

> ''آپ چاہے کسی مذہب، ذات یا قوم کے ہوں، آپ کے تعلق کل تک جیسے بھی رہے ہوں، آج ہم سب ایک آزاد ملک کے شہری ہیں، سب کے حقوق اور ذمہ داری یکساں ہیں۔ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر سب کو مل کر ملک کی ترقی کے لئے کام کرنا ہے اور اسی میں ہمارے روشن مستقبل کا راز پوشیدہ ہے۔
>
> ''ہمیں کندھے سے کندھا ملا کر ترقی کے لئے سرگرم ہونا ہے، ہم اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں، ہندو ہوں یا مسلمان، وقت کے ساتھ ساتھ یہ فرق ختم ہو جائے گا۔ آپ آزاد ہیں، پاکستان کے ایک آزاد شہری کے ناطے آپ کو یہ

حق حاصل ہے کہ اپنی مرضی سے مسجد جائیں، مندر جائیں یا کسی دوسری عبادت گاہ میں عبادت کریں، آپ کا مذہب کچھ ہو، آپ کی ذات کوئی ہو، ان کا حکومت کے معاملے میں کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"[۱]

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنے خطاب میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو اسی نظریہ کی تائید کی اور کہا، "پاکستان ایک ایسا ملک ہوگا، جہاں کسی خاص مذہب، قوم، ذات یا فرد کو برتر مقام حاصل نہیں ہوگا۔ پاکستان کا ہر ایک شہری برابر ہے۔ ان کے حقوق، فرائض اور ذمہ داریاں یکساں ہوں گی۔"[۲] قائد اعظم اور وزیر اعظم کے جذبات واضح کرتے ہیں کہ دو قومیت کے جس نظریہ کو حقیقی اور جائز ثابت کرنے کے لئے مسلم لیگ نے زمین آسمان ایک کر دیا تھا، اس کی بنیاد کتنی مضبوط تھی۔ مسلمانوں کے جذبات کا استعمال کر سیاسی فائدہ اٹھایا گیا۔ تاریخ عالم خاص کر اس برصغیر کی تاریخ کا یہ تکلیف دہ باب ہے کہ وہ مسٹر جناح، جنہیں گوکھلے، فیروز شاہ مہتا، سروجنی نائیڈو اور دوسرے سرکردہ قومی رہنماؤں نے ہندو مسلم اتحاد کا پیش رو مانا تھا، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ حصوں میں بانٹنے والی مہم کے خاص رہنما بن گئے۔ بلگاؤں کانگریس میں انہوں نے (مسٹر جناح) کہا تھا:

"سات کروڑ مسلمانوں پر ہندو زبردستی حکومت نہیں کر سکتے۔ اگر ہندو ظلم کرنا بھی چاہیں، تو وہ ممکن نہیں، کیونکہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر ہندستان کا جمہوری نظام چل ہی نہیں سکتا۔ اگر مسلمان مخالفت پر اتر جانے کو طے کر لینگے، تو سرکار کا چلنا ناممکن ہو جائے گا۔ ہندو ایسے نا سمجھ نہیں کہ وہ زور زبردستی کا راستہ اپنائیں گے۔"[۳]

ہندستان کی تاریخ، یہاں کی سماجی بناوٹ، اس کی جغرافیائی حالت، اس کے مختلف مذاہب اور زبانوں کے تقاضے واضح کرتے رہے ہیں کہ یہاں کی آپسی ہم آہنگی ہی ہندستان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ اس سچائی کا احساس لوگوں کو شروع سے ہی رہا ہے۔ کانگریس کی عدم تعاون یا خلافت تحریکوں کے درمیان جو ہندستان میں سیاسی شعور بیدار ہوا تھا، اس وقت یہی ذہنیت کام کر رہی تھی۔ کانگریس کے بڑے رہنما رہے مسٹر جناح جیسے لوگ، جنہیں عوامی تحریکوں سے سیدھا واسطہ نہیں رہا، لیکن ہندستان آزاد ہو، اس کی آزادی کے لئے کیا کچھ کیا جائے، یہ

جذبہ بھی وہاں کافی مضبوط رہا۔ ان کا بھی ماننا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اچھے رشتے اور آپسی میل جول کے بغیر ہندستان کے اچھے مستقبل کی ضمانت نہیں دی جا سکتی اور نہ آزادی حاصل کرنے کی۔[۴] ۱۹۰۶ میں مسلم لیگ نے ہندستان کی دو بڑی اکائیوں، ہندو اور مسلمان، کے درمیان پیدا ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے ساتھ مسلمانوں کی حالت میں سدھار اور ان کی بہتری کا ایک وسیع پروگرام بنایا تھا اور واضح کیا تھا کہ وہ ہندستان کے مختلف فرقوں کے بیچ اختلافات کی بنیاد پر بنے ٹکراؤ کے ذہنی رجحان کو بڑھنے نہیں دے گا۔[۵] عجیب اتفاق حالات نے اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر اسے کانگریس کا حریف بنا کر میدان میں لا دیا۔ ۱۹۴۰ میں اس نے ملک کی تقسیم کی مانگ کر دی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیت کی حدوں میں محدود کر دیا، سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے والوں کا اب ایک ساتھ رہنا اسے ناممکن نظر آنے لگا اور آخر کار پاکستان بنوا لیا۔

پاکستان کے معماروں نے دو قومیت کے نظریہ کی بنیاد پر مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ قوم مانا اور اقتدار میں حصہ داری کی سیاست کا اسے مرکزی نکتہ بنایا۔ مسلمانوں کی جان و مال کی محافظت، سیاسی اور ثقافتی قدروں کے ساتھ باوقار بقا کے لئے پاکستان کے قیام پر زور دیا، اس کے لئے جمہوری اصولوں کی بنیاد پر زوردار تحریک چلائی، جسے حالات نے کامیاب بنا دیا۔ آبادی کا تناسب، ووٹ اور سروں کی گنتی پاکستان کی بنیاد بنی۔ قائد اعظم کے ذہن میں ایک ایسے جمہوری پاکستان کا تصور تھا، جہاں مذہب اور ذات، اکثریت اور اقلیت کے بیچ بھید بھاؤ کئے بغیر سب شہریوں کو یکساں آئینی حقوق کی قانونی ضمانت حاصل ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ان جمہوری تقاضوں سے ہی پاکستان کے وہی معمار مشترک ہندستان میں ڈر گئے۔ انہیں اسلام اور مسلمان خطرے میں گھرا ہوا محسوس ہوا اور پاکستان کی مانگ کی گئی۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ کو مشرقی پاکستان کے چٹ گاؤں (آج کے بنگلہ دیش) میں قائد اعظم نے ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، ''انسانوں کی برابری، بھائی چارہ اور محبت ہمارے مذہب اور ثقافت کی بنیاد ہیں۔ ہم لوگوں نے پاکستان کے لئے جد و جہد کیا، کیونکہ ہمارے حقوق کی پامالی کا ہمیں ڈر تھا۔''[۶] ۱۹۳۰ کے مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر محمد اقبال نے جہاں مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ زون (Safe Zone) کی بات کی تھی، وہیں ایک دلچسپ بات

بھی کہی تھی، مسلمانوں کی تاریخ ایک اہم حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ جب بھی مسلمانوں پر کوئی آفت آئی، انہیں آزمائش کی گھڑیوں سے گذرنے کو مجبور ہونا پڑا ہے، تو اسلام نے ان کی آبرو بچائی، ان کی محافظت کی۔ اسلام کی کبھی محافظت انہوں نے کی ہو، ایسی بات نہیں ملتی۔''[7]
حالات واضح کرتے ہیں کہ مکمل طور پر سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ''اسلام'' کو ہندستان میں استعمال کیا گیا، اس کی دوہائی دی گئی، کیونکہ مذہب کے نام پر ہندستانیوں کو بڑی آسانی سے اکسایا، ابھارا اور متحد کیا جا سکتا تھا۔ اس نسخے کو بہت پہلے سے یہاں آزمایا بھی جاتا رہا ہے۔ بنکم چندر، دیانند سرسورتی، تلک، اروندو گھوش، مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی وغیرہ نے لوگوں کو بیدار اور منظم کرنے کے لئے ''مذہب'' کا سہارا لیا ہے۔ خلافت کے مذہبی سوال پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد کے رشتوں میں باندھنے کا تجربہ بھی ہندستان میں ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے اسی نسخے پر عمل کرنا بہت آسان تھا اور حالات نے مسٹر جناح جیسے ماہر قانون، غیر مذہبی، سیکولر اور ماڈرن آدمی کو بھی اس نسخے کو استعمال کرنے پر مجبور کیا اور بدقسمتی سے اس بار اس کا استعمال ہندو اور مسلمانوں کو الگ ماننے کے لئے کیا گیا۔ اس کا اثر مسلمانوں پر پڑا۔ آزادی سے پہلے ہندستان میں ۱۹۳۷ اور ۱۹۴۶ میں جو الیکشن ہوئے، ان کے نتیجے کے تجزیہ سے پتا چلتا ہے کہ ڈر کی ذہنیت نے مسلم رائے دہندگاں پر کافی اثر ڈالا تھا اور مسلمانوں کے لئے محفوظ سیٹ پر مسلم لیگ کے امیدواروں کو ۱۹۳۷ میں ملے 4.6 فیصد کے مقابلے میں ۱۹۴۶ میں ۷۵ فیصد مسلم ووٹ حاصل ہوئے، جو مسلم لیگ کے منشا کے مطابق تھا، اس کا منصوبہ کامیاب ہوا۔[8]

اپنی پیدائش کے وقت سے ہی پاکستان دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے بیچ جس طرح سیکڑوں میل کی دوری تھی، اس سے کم دوری دونوں علاقوں کے لوگوں کی ثقافت، زبان اور علاقائیت کی شناخت میں نہیں تھی۔ ایک ملک کے دو حصوں کے لوگوں کے درمیان جذباتی اتحاد کا مکمل طور پر فقدان تھا۔ اسلام اور پاکستان کے نظریے صرف جوڑنے والی جذباتی کڑیاں تھیں، لیکن مسٹر جناح کے خوابوں کا پاکستان مذہبی حکومت کا نہیں تھا۔ انہوں نے پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی جمہوری اقدار اور عدل کی بنیاد پر ہر ایک پاکستانی کی برابری پر زور دیا۔ مذہب کو ذاتی حدوں تک ہی محدود رکھنے کے وہ طرفدار رہے۔ مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے میں وہ یقین رکھتے تھے۔[9] پاکستان کی مجلس دستور ساز کے ابتدائی دنوں میں انہوں

نے کہا تھا کہ ''مجھے معلوم نہیں کہ آئین کی کون سی شکل ابھرے گی، مگر اتنا واضح ہے کہ وہ اسلامی قدروں پر مبنی جمہوری ہوگا۔''[۱۰] اپنے نظریہ کو اور بھی واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا، ''جمہوریت ہماری رگوں میں ہے، ہمارے خون میں ہے، اسلام نے ہمیں اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس نے ہمیں ہر ایک آدمی کی برابری کے ساتھ انصاف کی تعلیم بھی دی۔''[۱۱] پاکستان حاصل کرنے کے لئے اس ''مذہب'' کو جس طرح استعمال کیا گیا، اسے پوری طرح سیاسی قدم کہہ سکتے ہیں۔ حصول اقتدار کے لئے مسلم لیگ نے ہندوؤں سے خطرے کی بات کی اور مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کی حساس رگوں کو چھیڑا۔ جب پاکستان وجود میں آ گیا، تب پاکستان کے معماروں نے سیکولر اور غیر مذہبی نظریہ پر خاص زور دیا۔

قائداعظم کی زندگی میں ہی مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش)، پنجاب، بلوچستان اور سندھ کی علاقائیت سر اٹھانے لگی تھی اور نئے ملک پاکستان کے لئے یہ نیک اشارے نہیں تھے۔ اپنی موت سے کچھ دنوں پہلے قائداعظم نے کہا تھا، ''آزادی کے حصول اور پاکستان کے قیام سے دشوار کام پاکستان کے اتحاد کو بنائے رکھنا ہوگا۔ پاکستانیوں کو علاقائی تنگ نظریوں سے محتاط رہنا چاہئے۔''[۱۲] بابائے پاکستان کو جس بات کا خطرہ تھا، وقت گذرنے کے ساتھ وہ صحیح ثابت ہوا، مشرقی پاکستان ''پاکستان'' نہیں رہ سکا اور بچا پاکستان متعدد مسائل سے جوجھ رہا ہے۔ کل کے مشرقی پاکستان گئے پاکستان نظریہ سے متاثر ہو کر ہزاروں لوگ آج کے ''بنگلہ دیش'' میں کیمپوں میں قابل رحم زندگی گذارنے پر مجبور ہیں، کیونکہ بنگلہ دیش میں پاکستانیوں کے لئے اب جگہ نہیں رہی اور پاکستان میں ان بہاریوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

آج پاکستان ایک تاریخی حقیقت بن چکا ہے۔ اس کی کمزوریاں، اس کے مسائل، اس کے اپنے مسائل ہیں، ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ کسی تعلق کے نہیں رہنے کے باوجود وہاں ہونے والے واقعات کی صدائے بازگشت یہاں محسوس کی جاتی ہے، یہ بھی صحیح ہے۔ کچھ برسوں پہلے تک ہم ایک تھے، ہماری تہذیب اور ثقافت ایک رہی، ہماری تاریخ ایک ہے، حالات نے ہمیں ''دو'' کر دیا، لیکن اس ''دُوئی'' کے مزاج کو پختہ ہونے میں ابھی صدیاں لگیں گی۔ زیادہ تر مسلمان پاکستان سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں، کیونکہ ان کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار سرحد کے اس پار موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے مسلمانوں نے اسلامی دنیا کے ساتھ جس جذباتی اتحاد کا شروع سے

مظاہرہ کیا، ان کی جو ذہنیت بنی ہے، پاکستان اس دائرے سے کیسے الگ ہو سکتا ہے؟ پھر آج تو دنیا سمٹ سی گئی ہے، قطب جنوبی میں کوئی واقعہ ہو، کوئی تبدیلی آئی، کچھ لمحوں کے اندر اس کی صدائے بازگشت قطب شمالی میں محسوس کی جاتی ہے۔ عالمی برادری جب اٹوٹ رشتوں میں بندھ رہی ہے، تو کل کے ساتھ رہنے والے علاقے ایک دم اجنبی کیسے ہو جا سکتے ہیں؟ ہاں، ہندوؤں کی خاصی بڑی تعداد نے کچھ خاص وجوہات سے ابھی بھی پاکستان کو تسلیم نہیں کیا ہے، آج بھی متحد ہندستان کے سپنے وہ اپنے سینوں میں سنجوئے ہوئے ہیں۔ نتیجتاً پاکستان کے تئیں ان کا نظریہ ہمیشہ منفی ہی رہتا رہا ہے۔ اب پاکستان ایک تاریخی حقیقت ہے، گو مان لینے کے باوجود ملک کی تقسیم کا زخم تازہ ہے اور اس کے بھرنے میں بہت وقت لگے گا۔ پاکستان کو اپنے سے بالکل الگ ماننے کے رجحان کے پختہ ہونے میں دیر لگے گی۔ تاریخی حقائق کے پس منظر میں جس طرح ہندو مسلم اتحاد وقت کی اہم مانگ اور ضرورت پہلے رہی ہے، اسی طرح اس کی ضرورت ملک کی تقسیم کے بعد بھی ہے۔ ہندستان کا روشن مستقبل ہی صرف اس پر مبنی نہیں، بلکہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی شانتی اور خوش حالی کی ضمانت بھی اسی رشتے پر منحصر کرتی ہے۔ اسی سچائی کے مدنظر ونوبا بھاوے اور رام منوہر لوہیا نے ہندستان، پاکستان ہی نہیں افغانستان کے فیڈریشن کی بات کی تھی۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ کانگریس نے اپنے شروع کے دنوں سے ہی ہندوؤں کے بعد دوسری بڑی آبادی مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ جب مسلم لیگ سرگرمی سے مسلمانوں کی نمائندگی کی دعویدار بن کر سامنے آئی، تو بھی کانگریس نے اپنا سیکولر انداز نہیں بدلا۔ کانگریس میں تنگ نظر خیال والے ہندوؤں کی تعداد کبھی کم نہیں رہی، لیکن عام طور پر اس کی سیکولر پہچان بنی رہی۔ جب آزادی سامنے نظر آ رہی تھی، اس وقت حالات تیزی سے بدلے اور اقتدار میں حصہ داری کے سوال نے پیچیدگیاں پیدا کیں۔ خود کو مسلمانوں کی تنہا نمائندہ بتانے والی پارٹی مسلم لیگ نے زیادہ سے زیادہ سہولیات اور اقتدار میں حصہ داری کے لئے سودا بازی (Bargain) کرنا شروع کر دیا اور ملک کی تقسیم کی مانگ انگریزی حکمرانوں کے سامنے رکھ دی۔ بٹوارے کی مانگ کی اس گتھی کو سلجھانے کی بڑی کوشش ہوئی، لیکن اس بدقسمتی کو ٹالا نہیں جا سکا۔ پاکستان کے اسلامی ملک کا اعلان کر دیے جانے کے باوجود گاندھی جی کے دور میں بنا ہندو مسلم اتحاد اور سیکولرزم کا سبق کانگریس کو یاد رہا اور ہندستان ایک سیکولر جمہوری ملک بنا،

بالغ حق رائے دہندگی کے اساس پر اس کی بنیاد ڈالی گئی۔ مذہب، فرقہ، ذات، زبان، علاقائیت اور جنسی تفریق کے بغیر ہر ہندستانی کو برابری کی بنیاد پر آئینی حقوق ملے۔ ۱۹۵۰ میں جب نئے سیکولر جمہوری ہندستان نے اپنا آئینی سفر شروع کیا، اس کی بنیاد میں یہاں کی رواداری ثقافتی وراثت بھی رہی۔ اپنے آئین کے تحت جب الیکشن ہونے لگے، تو کانگریس کے علاوہ اور جماعتوں نے بھی مسلم امیدوار کھڑے کئے اور بہت سے مسلمان الیکشن میں کامیاب ہو کر اسمبلیوں اور پارلیامنٹ میں اپنے علاقے کے نمائندہ کے روپ میں پہنچے۔ ہندو، ہندوؤں کا نمائندہ اور مسلمان، مسلمانوں کا نمائندہ، یہ تنگ نظر بندش ٹوٹی اور آزاد ہندستان میں مسلمان بھی اعلی سے اعلی عہدے پر پہنچے۔

آزادی کی لڑائی کے طویل دور میں اندرونی اختلافات اور کش مکش کے باوجود کانگریس نے ایک تعمیری ذہنیت کی جڑوں کو مضبوط کیا تھا، جس کو کانگریس کلچر کہنا مناسب ہوگا۔ اس کانگریسی کلچر کے اساس اخوت، ہمدردی اور وسعت خیالی رہے۔ اس نے اجتماعی روپ سے ہندستان میں جس ذہنی رجحان کو فروغ دیا، وہاں براہ راست فرقہ واریت اور تنگ نظری کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ ہندستان میں رواداری اور سیکولر ماحول بنانے میں کانگریس کلچر کے علاوہ یہاں کی لبرل بائیں بازو کی پارٹیوں کے اہم رول سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سماجوادیوں اور کمیونسٹوں نے بھی سیکولر ماحول بنانے کی سیاسی پہل کی اور فرقہ واریت کے خلاف مہم چلائی اور مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ کی ذہنیت پر کارگر چوٹ پہنچائی۔ ان اجتماعی کوششوں کا ہی نتیجہ رہا کہ فرقہ پرست تنگ نظر پارٹیوں کی کوششوں کے باوجود ودھان سبھا لوک سبھا تک فرقہ پرست جماعتوں کو پارلیامنٹ اور عوامی زندگی میں لوگوں نے ترجیح نہیں دی، اسے برتری حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ ہندو دھرم اور اس مذہب میں یقین رکھنے والوں کی رواداری قدم قدم پر فرقہ واریت کو چوٹ پہنچاتی نظر آتی رہی ہے۔ آج لوگوں کے سوچنے کے انداز کا Barometer تو الیکشن کے نتیجے میں اسمبلی اور پارلیامنٹ کے منتخب ارکان ہیں، عام لوگ اپنے ان نمائندوں کے ہاتھوں میں اپنی اور ملک کی تقدیر سونپتے ہیں۔ فرقہ پرست عناصر کو اپنی تنگ نظر اصولی بنیاد پر اکیلے حکومت کرنے کا موقع ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ ادھر کچھ برسوں سے ناخواندگی، جہالت اور غریبی کی مار جھیلتے ہندستانیوں کی کمزوریوں کو جمہوری نظام کی کمزوریاں مان کر اس سے فائدہ اٹھانے کا رجحان

مضبوط ہوا ہے اور منڈل اور کمنڈل کی پیچیدگیوں نے ہندستان کی سالمیت کو دوبارہ داؤ پر لگا رکھا ہے۔ حالات واضح کرتے ہیں کہ یہاں کی عوام نے اجتماعی طور پر عام زندگی میں فرقہ واریت کو نامنظور کر دیا ہے۔ جب کہیں کوئی تکلیف دہ واقعہ رونما ہو جاتا ہے، تو اس کے خلاف آواز اٹھانے والے زیادہ تر ہندو ہی ملتے ہیں۔ فسادات کے شکار اقلیتی آبادی ضرور ہوتی ہے، مگر ان لوگوں کے زخم پر مرہم لگانے والے اور راحت پہنچانے والے بھی زیادہ تر ہندو ہی نظر آتے ہیں۔ یہی سوچ کا انداز ہندستان کی روایتوں کی روح ہے اور روشن مستقبل کی راہ ہموار کرنے کی ضمانت بھی۔

پاکستان بن جانے کے بعد ہندستان کے قوم پرست مسلمان بدترین ذہنی دباؤ کے شکار نظر آتے ہیں۔ قدروں پر مبنی قومی سوچ کو انہوں نے اپنی قربانیوں سے سینچ کر مضبوط کیا تھا، وہ کانگریس کے بنیادی حصے بنے رہے۔ لیکن جب مسلم لیگ نے اقتدار کی حصہ داری کی کش مکش میں اپنے کچھ حمایتی مسلمانوں کو کانگریس کے سامنے لا کھڑا کیا، تو بہت سے ہندوؤں کی نظریں بدلی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ آزادی ملنے سے پہلے اپنے مفادات کے تحفظ کی جذباتی دلیلوں نے بہت سے مسلمانوں کو مسلم لیگ نے متاثر کیا تھا۔ پاکستان کے بن جانے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ دونوں ملکوں کے جو آئین بنے ان کی بنیادی Spirit ایک قومیت ہی رہی۔ دونوں جگہوں کی سرکاروں نے اسی بنیاد پر کام کرنا شروع کیا۔ ''دو قومی'' نظریہ کی وکالت کرنے والوں نے خود اس کو رد کر دیا اور جمہوری قدروں کو ہی اپنی بنیاد مانا۔ دونوں ملکوں نے آپسی رنجشوں اور برتاؤ میں کڑواہٹ کو کم کرنے کی کوشش شروع کی۔ پاکستان روانہ ہونے سے پہلے قائداعظم نے اپنے دوستوں سے دلّی میں کہا تھا، ''یہ میری زندگی میں ممکن ہو، نہ ہو، آپ میری باتیں یاد کرینگے، لاکھوں لوگوں کے قتل کے باوجود آج کے دشمن کل دوست ہو جا سکتے ہیں، یہی تاریخ رہی ہے، یہی انسانی تاریخ بتاتی ہے۔''[۱۳] مسٹر جناح کی سوانح عمری لکھنے والے ہیکٹر بولیتھو نے مسٹر جناح کے ایک دوست، جو کبھی کراچی کارپوریشن کے میئر بھی ہوا کرتے تھے، جمشید نوشیرواں، سے جناح صاحب کے بارے میں انٹرویو لیا تھا۔ انہوں نے انہیں بتایا تھا، ''بٹوارے کے بعد انہوں نے (مسٹر جناح) مجھ سے کہا تھا کہ پاکستان میں ہندو اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا رویہ مسلمانوں کو اپنانا چاہئے۔ میں نے مسٹر جناح کو صرف دو بار روتے دیکھا، ایک تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ میں، جب ہم لوگ ایک ہندو پناہ گزیں کیمپ دیکھنے گئے تھے۔ ہندوؤں کی مصیبت کو دیکھ کر

وہ رو پڑے۔''[۱۴] محترمہ فاطمہ جناح نے ۱۸ اگست ۱۹۴۸ کے سویرے کی اپنے بھائی کی ذہنی کیفیت کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے: ''اپنی شاندار کامیابی کے باوجود قائداعظم بہت غمگین تھے۔ سرحدوں کی دونوں طرف قتل، آگ زنی، عصمت دری جیسے شرمناک جرائم کی تکلیف دہ خبریں مل رہی تھی۔ ناشتے پر اس نازک صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے مجھ سے تبادلہ خیال کیا۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔''[۱۵] عام مسلمانوں کی کیا ذہنی حالت تھی، وہ مولانا آزاد کے اکتوبر ۱۹۴۷ کے اس تاریخی خطبہ سے اچھی طرح واضح ہوتی ہے، جو انہوں نے دلی کے مسلمانوں کو جامع مسجد میں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

''ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا، وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر، تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر، جو تمہارے دماغی لغت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے۔

''انگریزوں کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور رہنمائی کے وہ بت، جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں اور اضافہ میری خواہش نہیں، لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سے گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے ہندستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:

''جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا، تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات

کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں یہ رویہ اختیار کیا، جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے، جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

''یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے، جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بُری شے آ گئی ہے۔ ہاں، تمہاری بے قراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا اور بُری شے کو ملجا و ماوی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے، جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا، جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ اِدھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آ گیا!

''اب ہندستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے، مسلم لیگ کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں، اسی لئے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندستان کے مسلمان رہنماؤں کو دلّی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دئے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو...... یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

''یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اُچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون

سے پہنچی ہوئی ہے۔

''عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش وخروش بے جا تھا، اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انہوں نے تمہیں جانے کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انہوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے، تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں، تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا: ''جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔'' ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ، جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔...... عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

''میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو، اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں، وہ تمہارا ہی قافلہ تھا، انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں، تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لئے ہیں، اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

''آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود اک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اتر گئے،

پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرا دئے۔ بادل گرجے، تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی، تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں، تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے، آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔......"[۱۶]

گاندھی جی کی مرضی کے خلاف کانگریس نے ہندستان کے بٹوارے کی قیمت پر آزادی کو منظور کر لیا اور پاکستان وجود میں آیا۔ حصول اقتدار کے قواعد میں ملوث پیروکاروں نے گاندھی جی کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن گاندھی جی اپنی ابتلا کی اس آزمائشی گھڑی میں ستیہ گرہی کے روپ میں غیر متزلزل رہے اور اقتدار کی بھاگ دوڑ سے الگ رہ کر اپنے امن مشن کو جاری رکھا۔ زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نفرت کا ماحول بنا ہوا تھا اور پورے ملک میں تناؤ کی حالت تھی۔ اس کو معمول پر لانے کی کوششوں کو انہوں نے اور بھی تیز کر دیا۔ ملک کی تقسیم اور دونوں طرف ادھر سے اُدھر ہجرت کر رہے لوگوں کے مسائل نے انسانی اور انتظامی پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ پاکستان سے آئے ہندو اور سکھ جلے بھنے ہوئے تھے اور یہاں مسلمانوں کا وجود انہیں برداشت نہیں تھا۔ لیکن گاندھی جی نے اس ذہنیت کے خلاف میدان سنبھال رکھا تھا۔ وہ مسلمانوں کے محافظ اور معاون بنے رہے۔ اپنی تقریروں، پرارتھنا سبھاؤں اور تحریروں سے پر امن باہمی بقا کا ماحول بنانے کی کوشش کو جاری رکھا۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ اب پاکستان اور متحد ہندستان کی کش مکش ختم ہو چکی ہے، جو سچائی سامنے آئی ہے، اسے کُھلے دل سے ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے اور یہ بھی مان لینا چاہئے کہ دونوں ملکوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ساتھ ہی رہنا ہے۔ ماضی کو سینے سے لگائے رکھنے سے فائدہ کے بجائے نقصان پہنچے گا اور ترقی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی ہوں گی۔[۱۷] ۱۸ ستمبر ۱۹۴۷ کو دلی کی پرارتھنا سبھا میں انہوں نے کہا تھا:

"اب قائد اعظم کو پاکستان مل چکا ہے، انہیں اپنے کام اور کارکردگی سے اسے پرکشش اور اس کے نام کے مطابق بنانا ہے۔ کیا انہیں سب غیر مسلموں کو پاکستان آکر مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی دعوت نہیں دینی چاہئے اور انہیں یقین دلانا چاہئے کہ وہاں وہ مسلمانوں کی طرح ہی امن سے اور خوش حال رہ سکیں گے؟"[۱۸]

پنجاب کی حالت سے گاندھی جی بہت متفکر تھے۔ بنگال کے بعد وہاں کے پاگل پن پر

لگام لگانے اور امن قائم کرنے کے ارادے سے ۹ ستمبر کو دلی پہنچے، تو وہاں کے حالات نے انہیں الجھنوں میں ڈال دیا۔ دلی کی زمین مسلمانوں کے لئے تنگ بنائی جا چکی تھی۔ مغربی پنجاب اور سندھ سے آئے ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی بربادیوں کی سزا یہاں کے مسلمانوں کو دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور وہ انہیں طرح طرح کے ظلموں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے زبردستی نکالا جا رہا تھا۔ ان کی جائداد اور تجارت برباد کئے جا رہے تھے۔ فسادیوں کے بے لگام بڑھے ہاتھوں نے مسلمانوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر "پرانا قلعہ" اور "ہمایوں کے مقبرے" میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ بدقسمتی کا یہ دوسرا موقع تھا، جب مسلمان اپنی شاندار ماضی کی گواہ دلی کی نشانیوں کے کھنڈروں میں پناہ لینے پر مجبور کئے گئے تھے۔ پہلی بار ۱۸۵۷ میں انگریزوں کے ظلم نے انہیں یہاں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا اور آج وہ اپنوں کے ظلموں کے شکار تھے۔ دلی اسٹیشن پر راجکماری امرت کور اور سردار پٹیل نے گاندھی جی کا خیر مقدم کیا اور دلی کی حالت کی مختصر جانکاری انہیں دی۔ آسانی سے گاندھی جی سمجھ گئے کہ بنگال میں جو مسئلہ ان کے سامنے تھا دلی میں اس کی شکل زیادہ ہی پیچیدہ تھی۔ پورے شہر میں نفرت کا ماحول تھا اور ہندو مسلم فسادات کے سبب لوگ بدامنی کی حالت بھگت رہے تھے، چاروں جانب ناامیدی ہی ناامیدی پھیلی ہوئی تھی۔ گاندھی جی نے ۱۵ ستمبر کو اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا تھا، "کیا دلی کے لوگ پاگل ہو گئے ہیں؟ کیا اب ان کے اندر انسانیت معمولی سی بھی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ مجھے معاف کریں، میں ہندوؤں اور سکھوں کو اس حالت کا ذمہ دار مانتا ہوں، کیا نفرت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے؟"[19] ۲۳ ستمبر کو اپنی پرارتھنا سبھا میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا، "مجھے معلوم ہے، آپ چاہتے ہیں کہ میں جلد سے جلد پنجاب جاؤں۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ لیکن اگر میں دلی میں ناکام رہا، تو پاکستان میں میری کامیابی ناممکن ہوگی۔"[20] دلی کی حالت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا اور اپنی بے بسی کے احساس کے نیچے وہ دبے جا رہے تھے۔ گاندھی جی زندگی میں شاید اتنے ناامید کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ کو جب لوگوں نے ان کے جنم دن پر مبارک باد کے پیغام دئے، تو انہوں نے کہا تھا:

"یہ مبارک باد کے پیغام کہاں سے آ رہے ہیں۔ آج لوگوں کو افسوس ظاہر کرنا چاہئے۔ میرے دل میں سوائے دکھ اور درد کے اور کچھ بھی نہیں۔ ایک وقت وہ تھا، جب لوگ

میری باتوں پر دھیان دیتے تھے، ان پر چلتے تھے، آج میری آواز ایک اکیلے آدمی کی آواز ہو کر رہ گئی ہے۔ کبھی میں ۱۲۵ برس زندہ رہنا چاہتا تھا، آج زندہ رہنے کی میری خواہش ختم ہو چکی ہے۔ نفرت، جھوٹ اور خون خرابے کے بنے ماحول میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔''

ذہنی طور سے پریشان گاندھی جی رفیوجی کیمپ کا برابر دورہ کرتے رہے۔ ریلیف کے لئے روپیہ اور سامان اکٹھا کرنے کا ان کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اپنے گھروں سے اجڑے اجاڑے اور برباد ہوئے ہندو، سکھ اور مسلمان کی وہ ہمت افزائی کرتے رہے۔ شام کی پرارتھنا سبھاؤں میں قرآن پاک، گیتا اور گروگرنتھ کا ساتھ ساتھ پاٹھ چلتا رہا۔ شروع میں کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے قرآن پاک کے پڑھے جانے پر اعتراض کیا تھا، لیکن گاندھی جی نے وہ سلسلہ جاری رکھا۔ دلّی کی ۱۳۷ مسجدوں پر پاکستان سے آئے ہوئے ہندو اور سکھ پناہ گزینوں نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا، کچھ کو مندروں میں بھی بدل دیا گیا تھا۔ گاندھی جی ان کو خالی کرانے اور امن اور میل جول کا ماحول بنانے کی کوشش رات دن کرتے رہے۔ اسی بیچ پاکستان کی شہہ پر قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ ابھی تک جموں کشمیر نے ہندستان یا پاکستان کے ساتھ اپنے ملنے کے بارے میں طے نہیں کیا تھا۔ قبائلی گھس پیٹھ نے ایک نئی اور گمبھیر حالت پیدا کر دی۔ حالات کے مدنظر مہاراجا کشمیر ہری سنگھ نے ہندستان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ لیا اور ۲۹ اکتوبر کو اس کا سرکاری اعلان ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ہندستانی فوج کشمیر کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی۔ کشمیر پر حملہ اور اس سے جڑے مسائل نے دونوں نئے ملکوں کے تعلقات میں تناؤ کی شروعات کر دی۔

پڑھے لکھے دانشور ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش میں مسٹر جناح کی دو قومیت کے نظریہ کو مان لیا تھا۔ اسی بنیاد پر پاکستان بن چکا تھا اور وہ ایک دوسرے کو اپنا حریف مان کر آمنے سامنے کھڑے تھے۔ کشمیر کی لڑائی نے ایک اور الجھن پیدا کر دی، تلخیاں بڑھیں۔ لیکن گاندھی جی کے ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں کہیں بدلاؤ یا کمزوری نہیں آئی۔ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی قائم ہو، ساتھ ہی دونوں ملکوں میں پر امن ماحول بنے اور ان کا فروغ ہو، ان کی کوششوں میں کہیں ڈھیل نہیں آئی۔ اسی بیچ ''کریلے پر نیم'' کی طرح ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ کو بھارت کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ پاکستان کو اس کے حصے کی ملنے والی رقم کشمیر کے جھگڑے کے طے ہونے تک

پاکستان کو نہیں دی جائے گی۔ اس اعلان کا منفی ردعمل ہوا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس قدم کو بدنیتی کا نام دیا اور گاندھی جی کے انصاف اور اخلاقی نظریہ کو بڑا دھکا لگا۔[۲۱] دلی کے بگڑتے ہوئے فرقہ وارانہ حالات کو سنبھالنے اور بھارت سرکار کے غیر اخلاقی فیصلہ کو رد کروانے کا ایک ہی راستہ گاندھی جی کے سامنے بچا تھا اور وہ تھا گاندھی جی کا خود کو ہی سزا دینا۔ گاندھی جی نے ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ سے آمرن برت (تا مرگ فاقہ) کا اعلان کر دیا۔ گاندھی جی کے اس اعلان سے پورے ہندستان میں بے چینی پھیل گئی۔ ۱۲ جنوری کو انہوں نے کہا تھا: ''میرا یہ ورت کسی کے خلاف تو نہیں ہے، لیکن کسی کو چھوڑتی بھی نہیں ہے، یہ ورت ہندستان کی مسلم اقلیت کی حمایت میں ہے۔ اس لئے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف ہے، اور وہ پاکستان میں اقلیت کی حمایت میں ہے اور مسلم اکثریت کے خلاف ہے۔'' ۱۳ جنوری کی پرارتھنا سبھا میں انہوں نے کہا تھا،'' جب دلی میں پوری طرح امن قائم ہو جائے گا، تب ہی میں اپنا ورت ختم کروں گا۔ دلی ہندستان کی راجدھانی ہے اور اس کی بربادی ہندستان اور پاکستان دونوں کی بربادی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دلی مسلمانوں کے لئے امن کا شہر ہو، جہاں شہید سہروردی، جسے لوگ غنڈوں کا سردار کہتے ہیں، جیسے آدمیوں کے لئے بھی یہ جگہ محفوظ ہو۔ ہندستان کی بے عزتی میں نہیں دیکھ سکتا۔''[۲۲] ورت کے پہلے دن انہوں نے کہا تھا،'' میں چاہتا ہوں کہ دلی کی پوری صفائی ہو جائے۔ پاکستان میں مسلمان کیا کر رہے ہیں، مجھے اس سے مطلب نہیں، ہندوؤں اور سکھوں کو رویندر ناتھ ٹیگور کے دل پسند گیت کو یاد رکھنا چاہئے، اگر تمہاری آواز کوئی نہیں سنے، تو بھی اکیلے ہی چلے چلو۔'' ورت کے تیسرے دن انہوں نے ہندستانی سرکار پر زور دیا کہ وہ پاکستان کے ۵۵ کروڑ روپیہ فوراً ادا کرے۔[۲۳] اسی دن شام میں کچھ اخبارنویسوں نے گاندھی جی سے پوچھا تھا کہ جب دلی میں قتل اور خون خرابے بند ہیں، آپ نے ورت کا اعلان کیوں کیا؟ انہوں نے جواب دیا تھا،'' فساد رکا ہوا ہے، تو کیا ہوا، کیا یہ کم تکلیف دہ بات ہے کہ منظم ڈھنگ سے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا جا رہا ہے اور طاقت کے زور پر ان کے گھروں پر قبضہ کیا جا رہا ہے؟ اس سلسلے میں پولس کو گولی چلانی پڑ رہی ہے، آنسو گیس استعمال کرنی پڑ رہی ہے؟ یہ ہماری بیوقوفی ہوتی کہ میں اس دن کا انتظار کرتا، جب ایک ایک مسلمان کو دلی سے باہر نکال دیا گیا ہوتا۔ میں اسے سکا سکا کر قتل کرنا مانتا ہوں۔''[۲۴] ورت کے چوتھے دن جب پرارتھنا سبھا میں یہ اعلان کیا گیا کہ بھارت

سرکار پاکستان کو ۵۵ کروڑ روپیہ ادا کر رہی ہے، تب گاندھی جی نے اطمینان کی سانس لی۔ کانگریس صدر ڈاکٹر راجندر پرساد، جواہر لال نہرو اور دوسرے رہنما اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ دلّی کی حالت سدھرے اور گاندھی جی اپنا ورت توڑیں، کیونکہ ان کی صحت تشویشناک ہوتی جارہی تھی، وزن گھٹ رہا تھا اور انہوں نے موسّمی کا رس لینا بھی بند کر دیا تھا۔ ۱۸ جنوری کے سویرے مختلف ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلم تنظیموں سے متعلق لگ بھگ ۱۰۰ آدمی برلا ہاؤس پہنچے اور گاندھی جی کے سامنے انہوں نے سات نکاتی اقرار نامے پر دستخط کیا۔ اقرار نامے کے مطابق حسب ذیل فوری کارروائی کا اعلان ہوا:

۱۔ مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کا یقین دلایا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اب کوئی واقعہ دلّی میں نہیں ہوگا۔

۲۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر ہر ایک سال کی طرح اس سال بھی عرس ہوگا۔

۳۔ سبزی منڈی، قرول باغ، پہاڑ گنج اور دوسرے علاقوں میں مسلمان بلا خوف آجا سکیں گے۔

۴۔ ایسی مسجدیں، جنہیں مسلمانوں نے ڈر کر چھوڑ دی ہیں اور جن پر ہندوؤں اور سکھوں نے قبضہ کر رکھا ہے، مسلمانوں کو واپس کر دی جائیں گی۔

۵۔ جو مسلمان اپنا کاروبار چھوڑ کر ڈر سے بھاگ گئے ہیں، وہ لوٹ کر اپنا کاروبار جاری رکھیں گے۔ اس بات کی بھی ضمانت دی گئی کہ بغیر فوج یا پولس کی مدد کے لوگ مسلمانوں کی مدد کریں گے، تاکہ ان کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو سکے۔[۲۵]

اقرار ناموں کا وہ تاریخی دستاویز گاندھی جی کی خواہش کے مطابق اردو اور ہندی میں تیار کیا گیا تھا اور اس پر حسب ذیل لوگوں نے دستخط کئے تھے:

جمعیۃ العلما کے مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا احمد سعید، دلّی کے مسلمانوں کے نمائندہ مولانا حبیب الرحمٰن، گوسوامی گنیش دت، سنت لال اور نارائن داس، آر۔ ایس۔ ایس۔ اور ہندو مہا سبھا کے نمائندہ اور سکھوں کے نمائندوں نے بھی دستخط کئے۔ اس نشست میں راجندر پرساد، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین، دلّی چیف پولس کمشنر خورشید احمد وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس موقع پر گاندھی جی نے کہا تھا:

''شانتی کے سات نکاتی ڈکلیریشن پر آر۔ ایس۔ ایس۔ اور ہندو مہا سبھا کے نمائندوں

نے بھی دستخط کیے ہیں، اگر وہ سچے دل اور ایمانداری سے اس پر عمل کریں گے، تو دلّی کے علاوہ جن جگہوں پر بھی پاگل پن کے واقعات ہو رہے ہیں، اس کے سلسلے میں بھی ان کا کردار تعمیری ہونا چاہئے اور اگر وہ خاموش رہتے ہیں، تو یہ ایشور کے ساتھ دھوکا کرنا ہوگا۔ دلّی ہندستان کا دل ہے، مختلف پارٹیوں کے جو نمائندہ یہاں جمع ہیں، وہ دلّی کے معتبر لوگ ہیں۔ اگر یہ لوگ یہ نہیں سمجھا سکے کہ ہندو، مسلم، سکھ بھائی بھائی ہیں، تو دونوں ملکوں کا مستقبل تاریک ہے۔"[۲۶]

گاندھی جی نے ۱۸ جنوری کو ورت توڑا۔ لیکن کٹر ہندو سازشیوں نے تو منصوبہ کچھ اور ہی بنا رکھا تھا۔ گاندھی جی کی پالیسی کے وہ مخالف بنے ہی رہے اور ان کی سرگرمی سے اس کا اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ دنوں کے اندر ظاہر ہونے والے واقعات نے واضح کر دیا کہ یہ سازش جتنی قابل نفرت اور شرمناک تھی، اتنی ہی منصوبہ بند، پوشیدہ اور نپی تلی تھی۔ ۲۰ جنوری کو برلا ہاؤس کی پرارتھنا سبھا میں ایک بم بلاسٹ ہوا اور مدن لال پہوا نام کا آدمی گرفتار کیا گیا اور جب ۳۰ جنوری کو گاندھی جی کا قتل کیا گیا، تو اس گھناؤنی سازش کا لوگوں کو پتا چلا۔ گاندھی جی کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دلّی اور اس کے آس پاس پھیل گئی۔ ۱۰ منٹ کے اندر وزیر اعظم جواہر لال نہرو، وزیر داخلہ سردار پٹیل، گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور دوسرے وزراء برلا ہاؤس پہنچ گئے۔ ایک گھنٹے کے اندر برلا ہاؤس کے احاطے اور اس کے آس پاس ہزاروں ہزار غم زدہ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں، گاندھی جی کو ہندو نے مارا، گاندھی جی کو مسلمان نے مارا، کھسر پسر ہو رہی تھی۔ وائسرائے نے حالت کی حساسیت کو بھانپتے ہوئے، کس نے مارا اس الجھن میں پڑنے اور جانچ کے بجائے اعلان کیا کہ ایک ہندو نے گاندھی جی کا قتل کر دیا ہے۔ اگر حقیقت اس اعلان سے مختلف ہوتی، تو پتا نہیں کیا حالت ہوتی اور مسلمانوں پر کیسی قیامت ٹوٹتی، ہندستان کو نہ معلوم کتنی بربادی دیکھنی پڑتی۔ اس شرمناک واقعہ نے عالمی برادری میں ہندستان کا سر تو جھکا ہی دیا، مسلمانوں کو ایک بڑے سہارے سے محروم بھی کر دیا۔ مسٹر جناح نے گاندھی جی کی موت پر دکھ ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا، ان کی موت سے مسلمانوں کا زبردست نقصان ہوا۔[۲۷]

ہندستان اور پاکستان کے درمیان اچھے تعلق قائم ہوں، ہندو، سکھ اور مسلمانوں کے بیچ خوشگوار رشتے کا ماحول ہموار ہو، اس کوشش میں گاندھی جی نے اپنی قربانی دی۔ تاریخ انسانیت جب بھی قربانیوں کا تجزیہ کرے گی، تو بڑی مشکل سے ایسی دوسری مثال اسے مل پائے گی۔ یہاں

کی تکلیف دہ حالت نے ہر حساس آدمی کو بے چین کر رکھا تھا۔ کیا خواب دیکھا تھا اور کیا اس کی تعبیر سامنے آئی تھی۔ پاکستان میں ہندستان کے پہلے ہائی کمشنر شری پرکاش کے تجربوں پر مبنی تبصروں سے مایوس کن حالت کی نزاکت کا ہم اندازہ لگا سکتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''اپنے ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر سمپورن سنگھ کے ساتھ میں وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کے یہاں ہر ایک دن جایا کرتا تھا اور ان کے دفتر میں موجودہ حالت پر تبادلہ خیال ہوا کرتا تھا۔ ایک دن چپراسی نے آ کر مجھ سے کہا کہ بریگیڈیر تھمیا اور بریگیڈیر برار کھڑے ہیں، آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ میں جا کر ان سے ملا، انہوں نے کہا، ''شیخ پورہ سے سرگودھا تک قتل اور خون ریزی کا زبردست خطرہ ہے۔ کیا آپ اس کی روک تھام کر سکتے ہیں؟ میں فوراً اندر گیا اور نواب ممدوٹ سے کہا کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو دونوں بریگیڈیر جو ایک اہم خبر لائے ہیں، آپ سے مل کر باتیں کریں۔ انہوں نے فوراً دونوں کو بلا لیا اور واقعات کو سن کر کہا کہ اگر اتنے ذمہ دار افسران یہ خبر نہیں لائے ہوتے، تو میں کبھی نہیں یقین کرتا۔ ان دنوں وہاں کے انسپکٹر جنرل پولس مسٹر قربان علی تھے۔ ان کی ایمانداری اور غیر جانب داری کی بات ہر ایک آدمی کی زبان پر تھی۔ یہ خبر سنتے ہی پریشان ہو گئے اور میز پر گھونسا مار کر تکلیف بھرے لہجے میں بولے، ''تف ہے تمہارے ہندستان اور پاکستان پر، ملک کی تقسیم لوگوں کی بھلائی کے لئے ہوئی یا قتل اور بربریت کے لیے؟''[۲۸]

حواشی

۱۔ سی۔ ایم۔ نعیم، اقبال، جناح اور پاکستان، بحوالہ تقاریر قائد اعظم محمد علی جناح، جناح پبلیکیشن ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۲، ص ۹۴

۲۔ ہیکٹر بولیتھو، جناح کریٹر آف پاکستان، جان مارلے، لندن، ۱۹۵۴، ص ۱۹۸

۳۔ ایم۔ ایچ۔ سعید، دی ساؤنڈ آف فیوری، اے پولیٹیکل اسٹڈی آف ایم۔ اے۔ جناح، ڈاکیومنٹ پریس، دلی، ۱۹۸۱، ص ۱۲۵

۴۔ محمود الحسن، ہسٹری آف فریڈم مومنٹ، ۱۸۳۱۔۱۹۰۵، پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، پبلیکیشن رینا سا، پبلیکیشن ہاؤس، دلی، ۱۹۸۴، جلد سوم، حصہ ایک، ص ۲۷۱

۵۔ ہیکٹر بولیتھو، ص، ۴۵

۶۔ سی۔ ایم۔ نعیم، ص ۱۰۲
۷۔ ایضاً، ص ۱۸۵، بحوالہ جمال الدین احمد، ہسٹوریکل ڈیولپمنٹ آف دی مسلم فریڈم مومنٹ، یونائیٹڈ پبلی کیشنس، لاہور، ۱۹۷۰، ص ۱۲۶۔۱۲۷
۸۔ ایضاً، ص ۱۸۵
۹۔ ایضاً، ص، ۹۳
۱۰۔ شریف المجاہد، قائد اعظم، جناح اسٹڈیز اینڈ اریسینشس، قائد اعظم اکادمی، کراچی، ۱۹۸۱، ص ۱۴۳
۱۱۔ سی۔ ایم۔ نعیم، ص ۱۴۴
۱۲۔ سی۔ ایم۔ نعیم، ص ۱۴۶
۱۳۔ ہیکٹر بولیتھی، ص ۱۹۰
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۹
۱۵۔ اسٹینلی آلپرٹ، جناح آف پاکستان، آکسفورڈ پریس، نیویارک، ۱۹۸۴، ص ۳۴۳
۱۶۔ مالک رام، مولانا ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد، ساہتیہ اکادمی، نئی دلی، ۱۹۸۱، ص ۳۳۷۔۳۴۳
۱۷۔ ایم۔ کے۔ گاندھی، ہریجن، ۱ فروری، ۱۹۴۸، ص ۱۳
۱۸۔ ایضاً، ۲۸ ستمبر، ۱۹۴۷، ص ۳۵۱
۱۹۔ ایضاً، ص ۳۳۸
۲۰۔ ایضاً، ۵ ستمبر، ۱۹۴۷، ص ۳۵۴۔۳۵۵
۲۱۔ کے۔ ایل۔ گوبا، اسی سینیشن آف مہاتما گاندھی، جیکو پبلی کیشن، بمبئی، ۱۹۶۹، ص ۶۰
۲۲۔ ایضاً، ص ۵۲۵
۲۳۔ لوئی فیشر، دی لائف آف مہاتما گاندھی، گریناڈا پبلی کیشن، لندن، ۱۹۸۲، ص ۶۱۴
۲۴۔ ایضاً، ص ۶۱۹۔۶۲۰
۲۵۔ کے۔ ایل۔ گوبا، ص ۶۶
۲۶۔ کے۔ ایل۔ گوبا، ص ۶۶

۲۷۔ اسٹینلی آلپرٹ، جناح آف پاکستان، آکسفورڈ پریس، نیویارک، ۱۹۸۴، ص ۳۵۸
۲۸۔ شری پرکاش، پاکستان: استھاپنا اور حالات، مکتبہ جامعہ، نئی دلی، ۱۹۶۸، ص ۳۳۔۳۸

تاریخ کا سچ...... سمرتھ کو ناہی دوس گسائیں

(طاقتوروں کا کوئی قصور نہیں)

انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ میں خونی تصادم ایک اہم پہلو رہا ہے۔ عہد وسطیٰ کی تاریخ خاص طور سے مختلف قبائلی تشدد آمیز مڈبھیڑ اور علاقائی لڑائیوں سے جڑی بربریتوں کی کہانی ہے۔ سنٹرل ایشیا سے ہلاکو اور چنگیز خان اپنے منگول سرداروں کے ساتھ بھیانک طوفانوں کی طرح چلے اور اپنے راستے میں آئی حکومتوں کو نیست و نابود کرتے وہاں کٹے ہوئے سروں کے مینار بنائے۔ اپنی سفاکی کا ریکارڈ قائم کرتے وہ بغداد کی شاہراہوں اور محلوں تک پہنچے (۱۲۵۸) اور وہاں کی مستحکم اور ترقی یافتہ تہذیب کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

یورپ کی عہد وسطیٰ کی تاریخ بھی خونی داستانوں کی تاریخ رہی ہے۔ آٹھویں صدی کے شروع میں چارلس دی گریٹ نے اپنی اقتداری ہوس اور مذہبی جنون سے مغلوب ہو کر اپنے فرینک سامراج کو یورپ میں وسعت دینے کی زوردار مہم چلائی اور بہت جلد سیکسن، لوبارڈ، جرمنی، اٹلی اور وسط یورپ کے دوسرے علاقوں کو شکست دے کر اپنے ماتحت کیا اور وہاں کی مقامی آبادی پر ظلموں کی انتہا کو جائز مانا۔ اس کی عسکری فتح عیسائیت کی بھی فتح مانی گئی۔ جس کسی نے عیسائی مذہب یا چرچ کی اندیکھی کی، اسے بے دردی سے قتل کیا گیا۔ سترہویں صدی کے ابتدائی دور کے یورپ میں سو سالہ اور تیس سالہ جنگ (Hundred Years And Thirty Years War) کی خونی داستانیں ملتی ہیں۔ یہ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک عیسائیوں کے درمیان مذہبی عقیدوں کے سوال پر عیسائیوں کی آپسی لڑائی تھی۔ اس مذہبی جنگ میں یورپ کے زیادہ تر ممالک شامل تھے۔

مہذب ہونے کے دعویدار سفید نسل کے یوروپی لوگوں نے اپنے حلقہ اقتدار اور

نوآبادیات کے پھیلاؤ کی کوششوں میں دنیا کے دوسرے علاقوں میں، خاص کر غیر گوروں پر جو ظلم ڈھائے، وہ انسانی تاریخ کے شرمناک باب ہیں۔ اسپین یارڈس کے کورٹس اور حجارو وحشیوں نے میکسیکو اور پیرو میں جو ظلم کئے، اس کی مثال عالمی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ افریقہ اور آسٹریلیا میں ان گوروں نے تو جان لیوا بیماریوں کے جراثیم بھی اصل مقامی باشندے کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ جب اسپین پر عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ جما لیا، تو مسلمانان اندلس (Moors) پر ظلم کی انتہا کر دی اور انہیں وہاں سے پوری طرح ختم کر دیا گیا۔ کروسیڈ کی داستان بربادیوں کی تلخیوں سے بھری ہوئی ہے، جو مذہب کے نام پر جائز مانے گئے۔ یہاں برصغیر ہند اور اس کے اردگرد کے علاقوں کی تاریخ بھی خونی تصادم کی کہانی سے بچی ہوئی نہیں رہی ہے۔ باہری قبائلی حملوں کا جب سلسلہ رکا، تو مقامی لوگوں کے بیچ تسلط اور دبدبہ کی کش مکش یہاں لمبے عرصے تک چلی ہے۔ ویشنوؤں کا شیووؤں سے خونی تصادم اور بودھوں سے ہندوؤں کے ٹکراؤ کا طویل سلسلہ چلا ہے اور اس دور کی تاریخ کے صفحات بھی خون سے آلودہ ہیں۔ اس تصادم کے نتیجے میں ہی بودھ دھرم کا ہندستان سے خاتمہ ہی ہو گیا تھا۔ اس تصادم کا خمیازہ بڑے پیمانے پر مندروں اور بودھ وہاروں کو بھی بھگتنا پڑا اور سیکڑوں کی تعداد میں وہ برباد کئے گئے۔ لیکن انگریزوں نے جب لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت یہاں کی تاریخ لکھی اور لکھوائی، تو نالندہ یونیورسٹی سمیت ان بربادیوں کی پوری ذمہ داری مسلمانوں کے سر تھوپ دی گئی۔

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر عربوں کے پہلے مسلم حملے سے جو سلسلہ شروع ہوا، وہ قطب الدین ایبک (۱۱۹۲-۱۱۹۳) کے وقت تک آتے آتے تھم گیا ہے۔ محمود غزنوی کے حملے عام طور پر لوٹ پاٹ، خاص کر سومنات مندر اور دوسرے مندروں کی دولت کی لوٹ اور بربادی تک محدود رہے۔ شہاب الدین غوری کے بعد حالت بدلی۔ اپنی مضبوط ثقافتی شناخت لئے مسلمانوں نے جب یہاں رہ بسنے کا طے کر لیا، تو صورت حال بدل جاتی ہے۔ انہوں نے یہاں کی ثقافت کو نہ صرف اپنایا، بلکہ آپسی میل ملاپ سے نیا رنگ لئے ایک نئی مشترک ثقافت کو فروغ دیا، جو مغلوں کے وقت تک پہنچتے پہنچتے اور نکھری اور گنگا جمنی تہذیب کے نام سے مستحکم ہوئی۔ ثقافتی لین دین کے نتیجے میں یہاں نیا رنگ لئے پرکشش انڈو اسلامک تہذیب مضبوط سطح پر ارتقا پذیر ہو کر مقبول ہوئی۔ یہی وہ وقت ہے، جب مسعود، قطب علی، امیر

ماحول میں آزادی کی منزل سامنے نظر آ رہی تھی، لیکن وہاں پہنچنے کی راہ میں متعدد چنوتیاں منہ بائے کھڑی تھیں۔ اس ماحول میں اقتدار میں حصہ داری کے خاص چار دعویدار گروپ سرگرم نظر آتے ہیں:

۱۔ ۱۸۸۵ میں قائم آل انڈیا کانگریس پارٹی، شروع سے خود کو ہندستان کے ہر علاقے، طبقے اور فرقے کی تنہا تسلیم شدہ نمائندہ مانتی رہی۔ تنگ نظری کے حامل متعدد سرکردہ مہاسبھائی لیڈر کانگریس سے بھی جڑے رہے۔ اس لئے ان کی منزل کانگریس سے الگ منزل نہیں رہی۔ مسلمانوں کے معاملے میں ان لیڈروں کا رویہ روادار نہیں رہا۔ اے۔ او۔ ہیوم نے جس مقصد سے بھی کانگریس کو قائم کیا ہو، لیکن یہ سچائی ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ اس کا کینوس بڑا ہوتا گیا اور ہم مذہبی یا فکری قربت رکھنے والے کئی عناصر اس کے ساتھ ہو گئے اور اسی کے بینر تلے ملک کو آزادی ملی۔

۲۔ ۱۹۰۶ میں بنی مسلم لیگ خود کو مسلمانوں کی تنہا نمائندہ پارٹی سمجھتی تھی اور کانگریس کے ہندو اور مسلمانوں کی نمائندہ ہونے کے دعوؤں کو چیلنج کرتی اس کے مقابلے میدان میں سرگرم رہی۔ لیکن اس کی منزل بھی کچھ اور نہیں ہندستان کی آزادی ہی تھی۔ حالات کی وجہ سے ۱۹۳۷ کے بعد اس کے رویے میں تبدیلی آئی اور ۱۹۴۰ کے بعد اس کا تیور بہت تلخ ہو گیا۔ وہ ۱۹۲۰ کے عشرے سے کچھ سرکردہ ہندو رہنماؤں کے ذریعہ اپنائی گئی ''دوئی'' کی تھیوری پر زور دیتی اقتدار میں اپنی یعنی مسلمانوں کی حصہ داری کی دعویدار ہو کر سیاست کے میدان میں وہ سرگرم نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کے ایک چھوٹے حصہ کی حمایت یافتہ مسلم لیگ نے ایسی فضا بنا دی کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ ہونے کی دعویدار بن گئی اور برٹش حکومت کی اسے تائید حاصل ہوئی۔ آزادی ضرور ملے لیکن اس سے پہلے مسلمانوں کی حصہ داری طے ہو جائے وہ اس کی اولیت بنی رہی۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) نے بھی مسلم لیگ کے مطالبات کو جائز مانا تھا اور اس کی سرگرمی سے حمایت کی۔ اقتدار میں مسلمانوں کی مناسب حصہ داری ہو، اس سوال پر وہ ساتھ تھے، اس کی وہ وکالت کرتے رہے۔ اسی نظریہ کے مدنظر الگ پاکستان کے مطالبے کی بھی اس نے تائید کی۔

۳۔ ریپبلکن پارٹی آف انڈیا کے بینر تلے بابا صاحب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اچھوت، دلتوں کے مفادات کے مدنظران کے لئے سماجی اور سیاسی شعبوں میں خاص جگہ محفوظ کرانے کے لئے دل وجان سے سرگرم تھے۔ انہیں ہندوؤں سے الگ باوقار پہچان ملے اور برابری کی بنیاد پر اسی طرح سیاسی اختیار بھی ملے، جس طرح Separate Eletorate کی بنیاد پر مسلمانوں کو خاص اختیار ملے ہوئے تھے۔ اسی مدعا کو فوقیت دیتے ہوئے وہ برٹش سرکار اور دوسری جماعتوں سے سودابازی(Bargain) کررہے تھے۔ کانگریس پارٹی ہندستان کے سب طبقوں اور فرقوں کی نمائندگی کرتی رہی ہے، اس دعوے کو وہ سرے سے خارج کرتے رہے۔ گاندھی۔ اروِن معاہدہ (پونا معاہدہ) کے بعد گاندھی جی، ان کے نام نہاد پیروکاروں اور کانگریس سے وہ کچھ زیادہ ہی ناامید نظر آتے ہیں۔ آزادی ملنے کا وہ اس وقت تک انتظار کرنا چاہتے رہے، جب تک اچھوتوں کو ان کے حقوق کی ضمانت نہیں مل جاتی۔ اچھوتوں کے حقوق ان کی اولیت تھی، آزادی نہیں۔

۴۔ اکالی دل کے بینر تلے سکھوں کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ اپنے حمایتیوں کے ساتھ الگ ''سکھ ہوم لینڈ'' کا خواب دل میں سنجوئے ہوئے تھے۔ ہندوؤں سے ''سکھ'' اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اسی بنیاد پر اپنے لئے خاص اختیارات کے لئے وہ سرگرم تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی پارٹیاں ان کی حمایت پانے کی ہمیشہ متمنی رہیں۔ مسلم لیگ نے تو ایک قدم آگے بڑھ کر پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے اندر ایک سکھ ہوم لینڈ دینے کا ان سے وعدہ بھی کرلیا تھا۔

مذکورہ بالا چاروں اہم خیموں کے سرکردہ رہنماؤں کی حب الوطنی پر انگلی اٹھانے کی جرأت کوئی نہیں کرسکتا ہے، لیکن ہندستان کو آزادی کب اور کیسے ملے، اس سوال پر ان کے نظریے مختلف ہونے کے ساتھ بڑے دلچسپ بھی دکھائی دیتے ہیں:

(الف) کانگریس کے مقبول عام نیتا گاندھی جی اس وقت تک آزادی کا انتظار کرنے کو تیار نظر آتے ہیں، جب تک کہ غیر منقسم ہندستان کے فریم ورک میں مسلم لیگ کے مطالبات کا مناسب حل نہیں نکل جاتا اور صداقت اور عدم تشدد، ہندو مسلم اتحاد اور اخلاقی قدروں پر مبنی سیاست پر یقین رکھتی ایک مضبوط لیڈرشپ آزاد ہندستان کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لائق تیار نہیں ہو جاتی ہے۔ پہلے عدم تعاون اور خلافت تحریک کے درمیان جب ایک سال کے اندر

آزادی مل جانے کی فضا بنی ہوئی تھی، چوری چورا حادثہ کے سبب سب رہنماؤں کی مرضی کے خلاف تحریک کو واپس لے لینا گاندھی جی کا اس سمت میں واضح اشارہ ہے۔ بڑے کانگریسی لیڈروں کی سوچ ان سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ نتیجتاً اقتدار کی سیاست جب فیصلہ کن موڑ پر پہنچتی ہے، تو اپنے قدروں پر اٹل گاندھی جی اکیلے نظر آتے ہیں۔ ان کے سارے قریبی مانے جانے والے لوگ اقتدار کی کرسیوں کی جانب لپک جاتے ہیں اور ان کے سپنوں کے ''سوراجیہ'' کی شبیہ والے ہندستان کے تانے بانے بکھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

(ب) مسلم لیگ کے مقبول عام رہنما قائد اعظم محمد علی جناح اس وقت تک آزادی نہیں چاہتے رہے، جب تک اقتدار میں مسلمانوں کی مناسب حصہ داری کی بات طے نہیں ہو جاتی۔ انگریزوں کے جانے سے پہلے اس مسئلے کے تشفی بخش حل کی ضمانت پر وہ اٹل دِکھتے ہیں۔ ۱۹۳۷ کے بعد کے سیاسی منظر نامے نے انہیں بہت محتاط بنے رہنے پر مجبور کیا تھا اور دو قومیت کی بنیاد پر اقتدار میں مناسب حصہ داری یا متبادل کے طور پر پاکستان کی مانگ پر وہ شدت سے سودا بازی (Bargain) کرتے نظر آتے ہیں۔

(ج) ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر سماجی وقار، سیاسی حقوق اور معاشی یکسانیت کی بنیاد پر دلتوں کے مستقبل کی ضمانت ملنے کے بعد ہی ملک کی آزادی کی سوچتے رہے۔ چونکہ ہندستان کے سماجی تانے بانے کی شدت پسندی کے وہ خود شکار رہ چکے تھے، دلتوں کے حقوق کے سوال پر وہ کافی حساس دِکھتے رہے۔ وہی ان کی اولیت رہی اور انگریزوں کے رہتے ہوئے اس کا مناسب حل چاہتے رہے۔

(د) ماسٹر تارا سنگھ کی قیادت میں اکالی دل ''سکھ ہوم لینڈ'' کے لئے سرگرم رہا۔ آزادی ملنے سے پہلے اس مسئلے کو ترجیحی بنیاد پر حل کیا جانا وہ ضروری مانتے رہے۔ ستمبر ۱۹۴۴ میں ماسٹر تارا سنگھ نے کہا تھا کہ گاندھی جی پر ان کا یقین نہیں رہا ہے۔...... ''اگر انگریزوں نے ہندستان کی قسمت ہندستانیوں کو سپرد کر دی اور ہندستانی لیڈروں نے ہمارے مطالبے پورے نہیں کئے، تو سکھوں کے سامنے سوائے کھلی بغاوت کے اور کوئی راستہ نہیں بچے گا۔''[۱]

مہاتما گاندھی، ڈاکٹر امبیدکر اور ماسٹر تارا سنگھ کا ہندستان کے اکثریتی ہندو سماج کے بڑے تانے بانے سے تعلق رہا۔ ڈاکٹر امبیدکر نے اپنے پیروکاروں کے ساتھ بودھ دھرم اپنا لیا

تھا، پھر بھی وہ ہندو سماجی بناوٹ کے حصے ہی رہے، کیونکہ ہندوؤں نے مہاتما بدھ کو ہی وشنو کا اوتار مان کر انہیں اپنا لیا ہے۔ یہی حال سکھ دھرم ماننے والے ماسٹر تارا سنگھ کا بھی رہا، کیونکہ اپنی الگ پہچان رکھنے کے باوجود سکھ، ہندو فولڈ کا حصہ ہی مانے جاتے رہے ہیں۔ لیکن محمد علی جناح، جس ہندستانی سماجی بناوٹ سے آتے تھے، وہ مختلف رہا، یعنی وہ ہندو نہیں اسلام کو ماننے والے مسلمان تھے۔ نتیجتاً ہندستان کی آزادی کی منزل پر پہنچنے کی راہ میں مسٹر جناح ہی بڑی رکاوٹ مانے جاتے رہے، گاندھی جی، ڈاکٹر امبیدکر اور ماسٹر تارا سنگھ کی طرف کسی نے انگلی بھی نہیں اٹھائی۔ یعنی مسلمانوں کی اقتدار میں مناسب حصہ داری اور باعزت جینے کی جدوجہد کو ہندستان کے لئے بہتوں کے ذریعہ صحیح نہیں مانا گیا، انہیں ترچھی نظروں سے دیکھا گیا۔ اسی ذہنیت کی وجہ سے ساری پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور جب بات نہیں بنی، انگریزوں نے وہی کیا، جو ان کی طے شدہ پالیسی تھی۔ الجھنوں کو اور الجھانا اور پھر ملک کی تقسیم اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل خلیج بنا دینا۔ اسی پہلو کو مرچ مسالہ لگا کر اب تک پیش کیا جاتا رہا ہے، جس کی وجہ سے سچائی سامنے نہیں آئی اور ہندستانیوں کی دونوں بڑی اکائیوں کے درمیان پنپی تلخی کی کھائی کو پٹنے نہیں دیا گیا۔ آزادی کے بعد بھی وہی ذہنیت بنی رہی۔ نتیجتاً نہ پاکستان کے وجود کو ابھی بھی پوری طرح قبول کیا جا رہا ہے اور نہ تقسیم کا زخم ہی بھر رہا ہے۔

اکثریتی ہندوؤں کے بیچ آریہ سماج، ہندو مہا سبھا، جن سنگھ، آر۔ ایس۔ ایس۔ اور اس کی متعدد تنظیموں کی اپنی الگ الگ پہچان رہنے کے باوجود ان میں بہت سے لوگ کانگریس سے بھی کسی نہ کسی شکل میں سرگرمی سے جڑے رہے اور قومیت کا ان کا لبادہ ان کے لئے ڈھال بنا رہا۔ اُدھر اقلیتی مسلمانوں کی حالت کچھ عجیب رہی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے مفادات کی واحد نمائندگی کرنے کی دعویدار ضرور تھی، لیکن اس میں زیادہ وزن نہیں تھا، کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس، جمعیۃ علمائے ہند، مومن کانفرنس، خدائی خدمتگار جیسی مسلم تنظیموں کے ساتھ تھی، جو کم و بیش کانگریس کی حمایتی تنظیمیں ہی تھیں۔ مسلم لیگ کی پاکستان کے مطالبہ کی وہ کھل کر مخالفت کر رہی تھیں۔ مسلم اکثریت والے بنگال، پنجاب اور سرحدی علاقے کی متعدد مسلم تنظیموں نے بھی مسلم لیگ کی پالیسیوں کی حمایت نہیں کی تھی۔ ۱۹۱۶ کے لکھنؤ کانگریس اجلاس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان Separate Electorate کی بنیاد پر ساتھ مل کر آزادی کی لڑائی

لڑنے کا سمجھوتہ ہو جانے کے بعد مسلم لیگ کو جو سیاسی مقبولیت ملی، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر مسلم لیگ کے اسٹینڈ کی حمایت میں حالات واضح اور مضبوط ہوتے گئے۔ اور جب تیس کے عشرے میں کمیونل اوارڈ سامنے آ گیا، تب کانگریس کے دعوؤں کے باوجود بہت جلد مسلم لیگ مسلم توقعات کی علامت بن کر ابھری۔ ۱۹۳۷ کے الیکشن کے بعد کانگریس کے رویے سے جو سیاسی حالت بنی، اس نے الجھنیں ہی پیدا کیں اور فرقہ وارانہ اسٹینڈ لئے مسلم لیگ کی حمایت میں زمین ہموار ہوتی گئی۔

بلورل بناوٹ والے ہندستان کے ہر طبقے اور فرقے کی اقتدار میں مناسب حصہ داری کے حساس سوال کو غیر جانبداری سے دیکھے جانے کی پہلے بھی ضرورت تھی اور آج بھی ضرورت ہے۔ آزادی سے پہلے اس مطالبے کی جدوجہد کو مسلمانوں کی یا کسی دوسرے فرقے یا مذہبی اکائی کی علیحدہ پسند ذہنیت (Separetist) کہہ دینے سے ہی نہ سچائی بیان ہوتی ہے اور نہ وہ انصاف کا تقاضا ہی ہے۔ کسی فرد یا جماعت کے اندر اپنی پہچان کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے حقوق کی جستجو یا اس کی حصولیابی کے لئے جدوجہد لازمی ہے۔ ان کی کوششوں کو کسی نظریے سے غیر مناسب نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ملک اور سماج کے اتحاد اور سالمیت پر سوال اٹھنے لگے، تو حالت دوسری ہو جاتی ہے۔ ہم اس سیاسی ماحول پر غور کر رہے ہیں، جب ابھی ہندستان انگریزوں کا غلام ہے اور آزادی کی لڑائی چل رہی ہے۔ اقتدار میں حصہ داری کی جو کش مکش اور جوڑ توڑ چل رہی ہے، وہ آزادی مل جانے کے بعد کے حالات اور امکانات کے مدنظر ہو رہی ہے۔ یہاں ایک خاص حالت ہے، کیونکہ اقتدار اور حکومت کی نکیل کے ساتھ فیصلے کی کنجی انگریزوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ساری کش مکشوں کے مثبت انجام کا دارومدار ان انگریزوں پر ہے، جو اپنی نپی تلی پالیسیوں کو پورا کرنے کے مقصد سے شطرنج کی بساط بچھائے ہوئے تھے۔ اور ان پالیسیوں کی جڑیں ۱۸۵۷ کے بعد سے ملے سبق سے جڑیں رہی، یعنی ہندستانیوں کو لڑاؤ، ان کے آپسی اختلافات کو بڑھاؤ اور راج کرو (Divide And Rule)۔ اپنے مقصد میں انگریزوں کو بڑی کامیابی ملی، اس میں دو رائے نہیں۔ لیکن ہندستان کی الجھی ہوئی سماجی بناوٹ، لوگوں کی آپسی رسہ کشی اور آپسی اتحاد کے فقدان نے انہیں کامیاب ہونے کا پورا موقع مہیا کیا، یہ بھی تلخ سچائی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہندستانی سماج کی اس کمزوری کا احساس ہمارے مصلحین سماج اور دوراندیش

لوگوں کو نہیں تھا۔ اپنے مختلف پروگراموں کے توسط سے اس خطرناک بیماری سے چھٹکارا پانے کی کوشش بھی کی جاتی رہی۔ لیکن ہزاروں برس پرانے سماج میں اختلافات کی جڑیں اتنی گہری رہیں کہ لگاتار کوششوں کے باوجود حالت میں مطلوبہ تبدیلی لانے میں پوری کامیابی نہیں ملی۔ اپنی سماجی جکڑن اور ذہنی تنگ نظریوں سے نجات پانے کی منزل جب جب سامنے دِکھی، تب تب شرپسند عناصر نے کھیل کو بگاڑا اور بات جہاں سے چلی، پھر وہیں پر آکر ٹھہری سی جاتی رہی ہے۔ انگریزوں کی موجودگی میں ایسے عناصر کو انتظامیہ کی بھرپور ہمت افزائی ملی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بھی صاحب اقتدار طبقہ نے یہاں کے اختلافات کی جڑوں کو ہی مضبوط بنائے رکھا۔ اتحاد کی کڑی کو کمزور بنایا جاتا رہا، کیونکہ اسی میں انہیں اپنا سیاسی مستقبل اور اقتصادی فائدہ محفوظ نظر آیا۔

پچھلے ابواب میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ ۱۹۰۵ میں بنگال کے دو حصوں میں بانٹے جانے کے بعد جو ملک کی فضا بنی تھی، اسی ماحول میں ۱۹۰۶ میں مسلم لیگ کا ڈھاکہ میں جنم ہوا تھا۔ بنکم چندر چٹوپادھیاے (۱۸۳۸۔۱۸۹۴) اور ان کے معاون بنگالی مصنفوں، دانشوروں کے اثر سے نیشنلزم کے فروغ کے ماحول میں برٹش سرکار کی پالیسی جو بھی رہی ہو، 'بنگ بھنگ' کا بنگال کے مسلمانوں نے خیر مقدم کیا تھا۔ غریبی اور جہالت کی مار جھیلتے ہوئے مسلمانوں نے ظالم ''بھدر بنگالی'' ہندو زمینداروں کے ناقابل برداشت استحصال کے دباؤ سے نجات کا اسے اچھا موقع مانتے ہوئے راحت محسوس کی تھی۔ بٹے ہوئے مشرقی بنگال کے نظم ونسق میں مسلمانوں کا بڑا دخل ہوگا، ناانصافیوں کے خلاف عدل کی بنیاد پر ان کی شنوائی ہوگی، سوچ کا یہ ماحول بنا تھا۔ مشرقی بنگال میں آبادی میں اکثریت کی بنیاد پر سیاست پر مضبوط گرفت اور اقتدار کی تکمیل ان کے ہاتھوں میں ہونے کی فضا بننے کی گنجائش بنگال کے مسلمانوں کو دکھائی پڑی تھی۔ اسی ماحول میں مسلم لیگ کا قیام ڈھاکہ میں ہوا تھا۔ گرچہ مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی پارٹی تھی، لیکن قومی مسائل پر انڈین نیشنل کانگریس سے شروع میں اس کا کوئی بنیادی اختلاف نہیں تھا۔ اس کے بانیوں میں بہار کی سیاست اور کانگریس کے قدآور رہنما مانے جانے والے مظہر الحق بھی ایک تھے۔ شروع کے دنوں میں دونوں تنظیموں کے اجلاس ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ مسٹر جناح، جن کی حالات کے پیش نظر آگے چل کر علیحدگی پسند (Separatisit) ہونے کی پہچان بنی، وہ اس وقت

مسلم لیگ سے الگ تھے۔ ۱۹۱۳ میں مظہرالحق نے مسلم لیگ کے ممبر سکریٹری کے ناطے اس وقت کانگریس کی پہلی صف کے ایک بڑے لیڈر مسٹر محمد علی جناح کو بھی اس میں شامل ہونے کو کہا تھا۔ لیکن ایک خاص فرقہ، مسلمانوں پر مرکوز اس پارٹی میں مسٹر جناح نے شامل ہونے سے انکار کیا تھا۔ ان کی سیکولر فکر کے دائرے میں مذہب کے نام پر علیحدگی کی گنجائش نہیں تھی۔ لبرل سوچ رکھنے والے قد آور نیتا گوپال کرشن گوکھلے نے ان کے بارے میں ۱۹۱۲ میں کہا تھا، ''وہ تنگ نظریوں سے پرے، بہت سی خوبیوں کے ایک ایسے پرکشش انسان ہیں، جنہیں ہندو مسلم اتحاد کا ترجمان کہنا چاہئے۔'' لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک اور مسٹر جناح کی کوششوں سے کانگریس اور مسلم لیگ کے بیچ ۱۹۱۶ میں تاریخی سمجھوتہ لکھنؤ میں ہوا تھا، تاکہ دونوں پلیٹ فارموں سے ہندو اور مسلمان اجتماعی طور سے آزادی کی لڑائی کو آگے بڑھا سکیں۔ Separate Electorate کی بنیاد پر اتحاد کو برقرار رکھنے کا وہ ایک تاریخی سمجھوتہ تھا، جسے تلک، گوکھلے، مدن موہن مالویہ، اینی بسنٹ اور جناح جیسے اس وقت کے بڑے رہنماؤں کی تائید حاصل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب گاندھی جی ابھی جنوبی افریقہ میں تھے اور کانگریس کی سیاست میں شامل بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہوم رول لیگ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مسٹر جناح کی انتھک کوششوں کو کافی سراہا گیا تھا اور سروجنی نائیڈو نے انہیں ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر مانا۔ اپنے بارے میں خود مسٹر جناح نے سنٹرل اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے ۱۹۲۵ میں کہا تھا، ''وہ پہلے نیشنلسٹ ہیں، دوسرے بھی اور آخری بھی نیشنلسٹ ہی ہیں۔'' ۱۹۲۸ کی نہرو رپورٹ میں لکھنؤ پیکٹ کے ''Separate Electorate'' کے دفعہ (Clause) کو ہٹا دیا گیا تھا۔ مسٹر جناح خود لکھنؤ پیکٹ کے معماروں میں سے ایک تھے، لیکن ملکی بہبود کے مدنظر نہرو رپورٹ کو نہ صرف منظور کیا، بلکہ مسلم لیگ سے اس رپورٹ کو بڑی مشکل سے منوایا بھی تھا، تاکہ مشترکہ طور سے آزادی حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف تگ و دو جاری رہے اور ملک دونوں تنظیموں کی مشترکہ کوششوں سے آزادی کی منزل پر پہنچے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ بعد کے دنوں کے واقعات نے نہ صرف نہرو رپورٹ کو بے معنی دستاویز بنا دیا، بلکہ دونوں تنظیموں کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لا کھڑا کیا اور آخرکار ملک کی تقسیم ہی لازمی متبادل مانا گیا۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان لکھنؤ پیکٹ کے بعد اقتدار میں حصہ داری پر مبنی

آئینی حل ڈھونڈنے کی کوششوں میں نہرو رپورٹ ایک سنگ میل (Landmark) کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آسکا۔ اس رپورٹ کے نتیجے میں حالت سدھرنے کے بجائے زیادہ الجھ گئی۔ نہرو رپورٹ (Nehru Report) کے بعد ہندستان کے سیاسی ماحول سے نا امید ہو کر مسٹر جناح مئی ۱۹۲۸ میں وکالت کرنے لندن چلے گئے۔ نیشنلسٹ مسٹر جناح نے اس وقت کی سیاست کو ملک کے حق میں نہیں مانا اور خود کو اس سے کچھ دنوں کے لئے الگ کر لینا ہی مناسب سمجھا۔ مسٹر جناح کے اس غیر متوقع قدم پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے موتی لال نہرو نے اپنے دوست پرشوتم ٹھاکر داس سے کہا تھا، ان کا (مسٹر جناح) لندن چلا جانا افسوس کی بات ہے، کیونکہ مسلم رہنماؤں میں ان کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ کانگریس کے بڑے لیڈر ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری بھی اسی خیال کے تھے کہ مسلم لیگ میں سوائے مسٹر جناح کے کوئی دوسرا شخص فیصلہ لینے والا ہے ہی نہیں۔ جب اکتوبر میں وہ ہندستان لوٹے، تو موتی لال نہرو نے اپنے دوستوں کے ساتھ بمبئی میں ان کا شاندار خیر مقدم کیا تھا۔

نہرو رپورٹ (Nehru Report) پر غور کرنے کے لئے کلکتہ میں ایک آل پارٹیز اجلاس بلایا گیا تھا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ کو اپنی رائے رکھتے ہوئے مسٹر جناح نے وہاں کہا تھا:

''کسی دوسرے ملک کے غلام رہے ایک ملک کو اپنے لئے جمہوری آئین یا نمائندگی کی بنیاد پر کوئی ادارہ تیار کرنے میں وہاں موجود ''اقلیتوں'' کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت دیئے بغیر کامیابی نہیں ملتی ہے۔ ''اکثریتوں'' کے خود غرض اور بے لگام ہو جانے کا ہمیشہ خطرہ بنا رہتا ہے۔ ''اقلیتوں'' کے سامنے اپنے مفادات کی اندیکھی کا خطرہ اس وقت تک بنا رہتا ہے، جب تک کہ قانونی دفعات کی بنیاد پر ان کو برقرار رہنے کی ضمانت نہیں دی جاتی ہے۔ اس وقت یہ خطرہ زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، جب فرقہ پرست اکثریتوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔

''مسٹر جیکر کے طنز کی کوئی حیثیت نہیں، وہ بھی ہم سے متفق ہوں گے کہ آزادی حاصل کرنے اور جمہوریت کی بحالی کی کوششوں میں کوشاں ہر ملک کو ''اقلیتوں'' کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مقصد چاہے کتنا ہی آئیڈیل اور مکمل کیوں نہ ہو، جب تک اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جاتی، ان کو مثبت حمایت نہیں ملتی، وہ نظام آئین کے بنیادی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔''

ہندو مہا سبھا کے مسٹر جیکر نے ہندوؤں کے مفادات کے تحفظ کی بات کرتے مسٹر جناح پر طنز کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے اقلیتی فرقے کے نمائندہ ہیں، (مسٹر جناح بوہرا شیعہ تھے، جو مسلمانوں میں ایک چھوٹی سی اکائی رہی ہے)۔

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا تھا:

''ہم لوگ ایک ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے ایک بہتر سمجھوتہ کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں، تاکہ ہم اس کی بنیاد پر اپنی کامیابی کی منزل پر پہنچ سکیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے مل کر کام کریں۔ اس لئے نہ صرف مسلم لیگ، بلکہ ہر مسلمان کو ساتھ لینے کی بات ہمیں کرنی ہوگی۔ ابھی میں ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندستانی کی حیثیت سے اپنی باتیں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان ہمارے ساتھ آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں شامل ہوں۔ کیا آپ چند لوگوں کا ساتھ چاہیں گے یا ہندستان کے سب مسلمانوں کا آپ کو ساتھ ملے؟...... یہ تو اکثریتوں کے رویہ پر منحصر کرتا ہے، یہ بات تو وہی بتا سکتے ہیں۔ میں تو مسلمانوں کے ساتھ تال میل کرنے کی بات کرتا ہوں، کیونکہ مسلمانوں کے لئے یہی بہتر متبادل ہے۔''

کناڈا اور مصر کے آئین کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

''وہاں کے حقائق کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ وہاں کی ''اقلیت'' کس طرح اپنے بارے میں ہمیشہ متفکر رہتی ہے۔ ''اکثریت'' خاص کر مذہبی اکثریتوں کی سوچ ہمیشہ جانبدارانہ ہوتی ہے، اس لئے ''اقلیتوں'' کے تحفظ کی ضمانت پوری وضاحت سے ہونی چاہئے۔......

''ہم کسی عدالت میں نہیں کھڑے ہیں اور نہ قانونی داؤ پیچ کو ہمیں حل کرنا ہے۔ ہمیں سیاست کے مدعوں کو طے کرنا ہے اور یہ مدعا بہت اہم اور بڑا ہے، اس لئے اسے بڑی سمجھ داری اور سیاسی دوراندیشی (Statemanship) سے طے کیا جانا ہے۔''[۲]

اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر فرقہ وارانہ ذہنیت نے ہمیشہ الجھنیں ہی پیدا کی ہیں۔ اسی مسئلے کا خوشگوار ماحول میں حل ڈھونڈنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی بنی تھی، لیکن اس کی رپورٹ نے حالات کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا۔ نہرو رپورٹ کے غلط نتیجے کے بارے میں بہار کے ایک مجاہد آزادی، گاندھی جی کے چمپارن ستیہ گرہ

(۱۹۱۷) کے ساتھی جنگ دھاری پرساد نے اپنی ''خودنوشت حیات'' میں اپنے ایک اہم رفیق کار مجاہد آزادی شفیع داؤدی کو سامنے رکھتے ہوئے حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:

''اب میں ایک تکلیف دہ موضوع پر آرہا ہوں، جس کا بہت شدید ردعمل ملک بھر میں ہوا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ سنہ ۱۹۲۳۔۱۹۲۴ میں مظفر پور میونسپلٹی اور ضلع بورڈ کے الیکشن ہوئے۔ ضلع بورڈ الیکشن میں پاتے پور تھانے سے محمد شفیع داؤدی صاحب کھڑے ہوئے، مگر فرقہ وارانہ تفریق کے سبب وہاں ان کو ووٹ نہیں مل سکا اور وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس سے ان کے دل و دماغ پر گہری چوٹ پہنچی۔ تین برس بعد ۱۹۲۶۔۱۹۲۷ میں مذکورہ بالا دونوں بورڈوں کا پھر الیکشن ہوا۔ اس بار شفیع صاحب حاجی پور سے کھڑے ہوئے۔ فرقہ پرست عناصر نے ان کی شدید مخالفت کی اور وہ اس بار بھی ہار گئے۔ نتیجتاً ان کو پھر گہری چوٹ لگی اور ان کے خیالات میں تبدیلی آنے لگی۔

''۱۹۲۸ میں لکھنؤ میں آل پارٹیز اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں محمد شفیع صاحب نے مسلمانوں کے تحفظ کے لئے کچھ خاص سہولتیں مانگیں۔ اجلاس میں ان کی مانگ مسترد کر دی گئی اور پنڈت موتی لال نہرو نے انہیں کافی جھڑک دیا۔ اس واقعہ سے محمد شفیع صاحب کی ذہنیت ایک دم بدل گئی۔ انہوں نے بیڑا اٹھایا کہ کانگریسی مسلمانوں کو کانگریس سے ہٹا کر موتی لال کو دکھا دینگے کہ ان کی (شفیع صاحب کی) بھی کچھ ہستی ہے۔ انہوں نے کانگریس اور سوراج پارٹی سے، جس کے وہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر منتخب کئے گئے تھے، استعفیٰ دے دیا اور آزادانہ طور سے الیکشن لڑ کر اسی جگہ پر مسلمانوں کے ووٹ سے جیت کر آگئے۔ محمد شفیع صاحب نے سارے ہندستان کا دورہ کیا۔ کلکتہ، مدراس، بمبئی، کراچی، لاہور، دلی جیسے تمام مقامات پر گھوم گھوم کر بہت سے مسلمانوں کو کانگریس سے ہٹا کر ان کی نئی پارٹی آل انڈیا مسلم کانفرنس کی تشکیل کی۔''[۳۰]

اسی مسئلہ پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے مشہور سماجوادی مجاہد آزادی رام ورکچھ بینی پوری لکھتے ہیں:

''ذاتی مخاصمت کے ساتھ فرقہ وارانہ رجحان بھی زوروں پر تھا۔ ہندو اور مسلمانوں میں کھل کر چھڑپ چل رہے تھے۔ ملک میں کتنی ہی جگہوں پر بھیانک فساد ہو رہے تھے۔ کوہاٹ کے فسادات کے سبب گاندھی جی نے انیس دنوں کا بھوک ہڑتال کیا تھا۔ تھوڑے دنوں تک لگا کہ دونوں کے دل مل گئے ہیں، لیکن ملک کی بدقسمتی اتنے سستے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ مرض بڑھتا

گیا، جیوں جیوں دوا کی۔ بہار میں اس فرقہ وارانہ رجحان کے بُرے نتائج میں ایک تھا مولوی شفیع صاحب کا کانگریس سے الگ ہو جانا۔ شفیع صاحب کی شخصیت بڑی مقناطیسی تھی۔ وہ اپنے رفقاء کار سے بڑا پیار کرتے، ان سے بھائی چارہ کا سلوک رکھتے۔ ان کے ایثار کا بھی کیا کہنا، ان کے گھر میں کئی شام تک مکئی کی روٹیاں پر ہی گذارا ہونے کی بات ہم جانتے تھے۔ ان کے ذہن میں فرقہ واریت کا شائبہ تک نہیں تھا، لیکن حالات کے ردعمل کی لہر میں ان کے ایسے مخلص، صوفی کے پاؤں بھی مستحکم نہیں رہ سکے۔ مولوی شفیع صاحب کا کانگریس سے ہٹنے میں ہندو کانگریسی نیتاؤں کی فرقہ پرست اور تنگ نظر ذہنیت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

''کانگریس کی جگہ اب ہندو مہا سبھا کا دور تھا اور مالویہ جی، بھائی پرمانند، ڈاکٹر مُنجے کی باتیں ہندو بہت دھیان سے سنتے۔ مسلمانوں کے بغیر ہم سوراج حاصل کر سکتے ہیں، اس جھوٹی شان والی بات کو ہندو نوجوان طبقہ فخر سے دُہراتے...... چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا، جس میں آدمی کو سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔''[۴]

ڈاکٹر راجندر پرساد نے بھی اپنی ''خودنوشت سوانح حیات'' میں مشہور بیرسٹر اور سماجی کارکن سید خورشید حسنین کے پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن میں پیش آئی اسی طرح کی فرقہ وارانہ دقتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے ایسے ایسے سوال حسنین صاحب اور مسلمانوں کے سلسلے میں کھڑے کیے، جن کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر کانگریس سے نا امیدی پیدا ہوتی گئی۔ حالت ایسی بن گئی کہ لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جب تک کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا، مسلمان کوئی الیکشن جیت ہی نہیں سکتا، ''اکثریت'' اور ''اقلیت'' کا سوال ہمیشہ کھڑا ہوتا ہی رہے گا اور مسلمان حاشیے پر آ جائیں گے۔ بہار کی سیاست کے قائد مانے گئے مظہر الحق کو بھی چھپرہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر کے الیکشن میں کچھ ایسے ہی حالات سے واسطہ پڑا تھا اور انہوں نے بددل ہو کر خود کو سیاست سے ہی الگ کر لیا تھا۔

آزادی ملنے کے بعد کی حالت میں ہندستان کے مختلف فرقوں، خاص کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نارمل صورت حال بنائے رکھنے کے مناسب متبادل کی تلاش کرنے کے لئے نہرو کمیٹی کی تشکیل ہوئی تھی۔ لیکن اس رپورٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق اور ملنے والی سہولتوں کے آئینی سوال کو سلجھانے کے بجائے کافی الجھا دیا۔ اس رپورٹ کے ناموافق رد

عمل کے نتیجے میں مسلم رہنماؤں کے درمیان کانگریس سے مایوسی کی فضا بن گئی۔ مسلم سیاست اور عام مسلمانوں پر گرفت رکھنے والی کانگریس اور تحریک خلافت کے مقبول عام قائد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی ناراض ہوکر کانگریس سے الگ ہوگئے۔ مجاہد آزادی اور سرکردہ کمیونسٹ لیڈر زیڈ۔اے۔ احمد اپنی خودنوشت سوانح حیات ''میرے جیون کی کچھ یادیں'' میں مولانا محمد علی سے لندن میں ہوئی اپنی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مولانا صاحب اس وقت کانگریس سے بہت ناراض تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کانگریس ہندوؤں کی پارٹی ہوگئی ہے۔ اس لئے موتی لال نہرو کمیٹی کی رپورٹ میں مسلمانوں کے جائز مطالبات بھی نہیں مانے گئے ہیں۔...... وہ ہر ملنے والوں سے کہتے رہتے تھے کہ گول میز کانفرنس میں ہر مسلم سیاست دانوں کے ذریعہ موتی لال نہرو اور مہاتما گاندھی کی مخالفت کی جانی چاہئے۔''[۵]

یہ وہی مولانا محمد علی ہیں جو کہا کرتے تھے کہ پیغمبر اسلام کے بعد وہ شخص جن کا حکم ماننا وہ فرض سمجھتے ہیں، وہ مہاتما گاندھی ہیں۔ دوسرے گول میز کانفرنس میں مولانا نے بڑی جذباتی تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ یا تو انہیں ہندستان کی آزادی کا پروانہ دیا جائے یا آزاد ملک میں دفن ہونے کے لئے دوگز زمین۔ عجیب اتفاق وہیں ان پر دل کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہوگیا۔ انہیں یروشلم۔ فلسطین میں دفن کیا گیا۔

نہرو رپورٹ کے سلسلے میں دسمبر ۱۹۲۸ میں لکھنؤ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا کھلا اجلاس ہوا تھا۔ مسلم ممبروں کی مخالفت کے باوجود وہ رپورٹ منظور ہوئی تھی۔ اس اجلاس میں مولانا محمد علی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان پر لوگوں نے تھوک بھی پھینکا۔ دوسرے سال ۱۹۲۹ میں دلّی میں مسلمانوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ آغا خان کی صدارت میں ''آل انڈیا مسلم کانفرنس'' کا قیام ہوا اور اس کے سکریٹری کانگریس اور کانگریسیوں سے ناراض بہار کے معزز رہنما محمد شفیع داؤدی منتخب ہوئے۔ انہوں نے کانگریس کے خلاف پورے ملک میں مہم چھیڑ دی، جس کا آگے چل کر مسلم لیگ کو خوب فائدہ ملا، کانگریس کے خلاف بنی بنائی زمین اسے مل گئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ اقتدار میں حصہ داری، عہدہ اور حصول وقار کی کش مکش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی سوچ میں تبدیلی آتی گئی اور اس کے مدنظر حالات کے تجزیہ میں ہندوؤں

اور مسلمانوں کے درمیان فرق آتا گیا۔ عام مسلمانوں کے درمیان یہ بات بیٹھ گئی کہ مسلمان بحیثیت ایک مسلمان کوئی الیکشن جیت ہی نہیں سکتا۔ آگے چل کر اس کش مکش کے نتیجے المیوں سے ہی ابھرے سامنے آئے۔

پلاسی (۱۷۵۷) اور بکسر کی لڑائیوں (۱۷۶۴) میں جیت حاصل ہو جانے کے بعد انگریزوں کے حوصلے کافی بلند ہو گئے تھے۔ ۱۷۶۵ میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مل جانے کے بعد تو انہیں کامیابی کی کنجی ہی مل گئی۔ انگریزوں نے مقامی لوگوں کی کمزوریوں، ان کی آپسی رقابت اور بے شمار راجے۔ رجواڑے کی آپسی دشمنی اور عوام سے ان کی دوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنے قدم اچھی طرح جما لئے۔ انہیں خود غرض عیاش راجاؤں اور نوابوں سے واسطہ رہا اور مختلف طریقوں سے ایک کے بعد ایک ان سب کو اپنے شکنجے میں کسا، انہیں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجتاً انہیں کسی مجموعی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور یہ سلسلہ سو برس تک چلا۔ لیکن ۱۸۵۷ تک آتے آتے حالت بدلی اور ان کے خلاف عوامی ناراضگی ابھرنے لگی، جو عوامی بغاوت کی شکل میں ۱۸۵۷ میں سامنے آئی۔ ۱۸۵۷ کی بغاوت پر قابو پانے کے بعد انگریزوں کا انتقام جابرانہ استحصال کی شکل میں سامنے آیا اور خاص کر مسلمان اس کے بری طرح شکار ہوئے۔ ۱۸۵۷ کے بعد سے ہی ان کی آزمائشوں کا جو سلسلہ چلا، اس کا خاتمہ ابھی بھی نہیں ہوا ہے۔ ایک سازش کے تحت سچائیوں پر پردہ ڈالتے ہوئے ۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کا سارا الزام ان کے سر ہی ڈال دیا گیا۔ آزادی کے بعد تحریک آزادی کی تاریخ بھی اسی طرح مسلمانوں کے رول پر پردہ ڈال کر گمراہ کرتے حقائق کو ترجیح دیتی بنیادوں پر لکھی جاتی رہی جس طرح ۱۸۵۷ کے بعد فورٹ ولیم اسکول نے لکھوائی تھی، جن کا بہت حد تک سچائیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ نتیجتاً مسلمانوں کے اندر مایوسی کی ذہنیت پنپی اور حالات نے انہیں اپنے محدود دائروں میں گھٹن کی زندگی جینے پر مجبور کیا۔

۱۷۵۷ کے بعد سے مہاتما گاندھی کی قیادت میں چلی تحریکوں تک آزادی کی لڑائی کی ہر اہم مہم میں مسلمانوں کا سرگرم رول اور حصہ داری رہی ہے۔ ۱۹۳۷ کے بعد حالات کے سبب مسلمانوں کی سرگرم حصہ داری میں خوش دلی سے لبریز جوش کی کمی ہوتی گئی۔ خاص کر یوپی کی سیاست میں کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ جو برتاؤ کیا، اس کا بڑا دوررس نتیجہ سامنے آیا۔

حالات ایسے بنتے گئے جہاں کانگریس اور مسلم لیگ کی راہیں الگ ہوتی نظر آنے لگیں۔ اب تک مسٹر محمد علی جناح کا نام ایک سیکولر نیشنلسٹ مجاہد آزادی اور کانگریس کی پہلی صف کے پہلے چند لوگوں میں ایک شمار ہو رہا تھا، لیکن ۱۹۴۰ تک آتے آتے سیاسی واقعات اور اقتدار میں مناسب حصہ داری کے سوال نے حالات کو بُری طرح الجھا دیا اور مسٹر جناح صرف اور صرف مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ کرتے علیحدگی پسند (Sepratist) لیڈر مانے جانے لگے۔ ۱۹۴۰ میں ان کی قیادت میں لاہور میں مسلم لیگ نے دو قومیت کے اصول (Two Nation Theory) کی بنیاد پر "پاکستان" کی مانگ کر ڈالی، جس کی وجہ سے حالت اور بھی سنگین ہوگئی۔ جمعیۃ علماء ہند، مومن کانفرنس، شیعہ کانفرنس، احرار پارٹی، خدائی خدمتگار جیسی با اثر مسلم تنظیم تو کانگریس کی معاون ہی مانی جاتی رہی، ان تنظیموں نے پاکستان کے مطالبے کی زوردار مخالفت کی۔ اس الجھے حالات میں اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش اور فیصلہ کرنے والے انگریزوں کے خطرناک رول نے معنی کو بے معنی کر دیا۔ ایسے حالات بنا دئے گئے جب ہندستانیوں کو آزادی کے حصول کے لئے ملک کی تقسیم جیسے تکلیف دہ متبادل کو تسلیم کرنا مجبوری ہوگئی۔ ستم ظریفی یہ رہی کہ اس المیہ کا پورا الزام صرف اور صرف مسلم لیگ کے اوپر ڈال کر اسے ہی نہیں سب مسلمانوں کو کٹھہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے سوال کرنے اور جواب طلب کرنے کا سلسلہ ابھی بھی نہیں رکا ہے۔ ایسے ایسے لوگ ان سے حب الوطنی کا سرٹیفکٹ مانگتے نہیں تھکتے، جن کی آزادی کی لڑائی میں ذرا سا بھی رول نہیں رہا ہے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اسی لاہور میں ۱۹۲۹ میں مکمل سوراجیہ کی تجویز کانگریس نے پاس کیا تھا اور گیارہ برسوں کے بعد اسی لاہور میں مسلم لیگ نے دو قومیت (Two Nation) کی بنیاد پر ملک کے بٹوارے کی تجویز "پاکستان" کی شکل میں منظور کیا۔ اس مسئلے پر سنجیدگی سے تجزیہ کرنے کی ابھی بھی ضرورت ہے، کیونکہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان خوشگوار رشتوں کے ساتھ یہاں کی فرقہ واریت کے زہر کی کاٹ کا راز بہت حد تک اسی مسئلے میں پوشیدہ ہے۔

ہندو مسلم رشتے، فرقہ واریت اور ہندستان کی تقسیم کے سوال کافی حساس ہونے کے ساتھ پیچیدہ بھی رہے ہیں۔ آزادی کی لڑائی کے بیچ سرگرم رہے متعدد سرکردہ مجاہدین آزادی، تاریخ دانوں اور ماہر سماجیات نے ہندو مسلم رشتوں کی پیچیدگیوں پر اپنے خیالات وضاحت سے

رکھنے کی کوشش کی ہے، تاکہ حقائق کی روشنی میں اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرتے اس برصغیر میں یکجہتی کی بنیاد پر ایک سول سوسائٹی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکے۔ اس سلسلے میں مشہور سوشلسٹ مجاہد آزادی مدھو لیمیے کی رائے قابل غور ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''تاریخ پر نظر ڈالنے سے ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کے کئی اسباب تھے۔ یہ مکمل طور سے برٹش سرکار کی پالیسیوں کا نتیجہ نہیں تھا، نہ ہی اس کی خاص وجہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں میں سیاسی دوراندیشی کا فقدان یا کچھ لوگوں کی بددیانتی تھی۔ اس کی یک وجہی وضاحت غیر تشفی بخش ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برٹش سرکار نے مسلمانوں میں علیحدگی کے جذبہ کو پروان چڑھایا، مگر انہوں نے یوں ہی یہ جذبہ پیدا نہیں کیا۔ اس کی جڑیں آٹھ سو برس قبل اسلام اور ہندو مذہب کے لاینحل تضاد اور ہندو سماج کی طاقت کو کمزور کرنے والی ہزاروں سال پرانی سماجی تفریق کرتی کمزوری تک جاتی ہے۔

ایک مشہور امریکی ماہر سیاسیات نے اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کے بارے میں جو بات کہی ہے، وہ میرے خیال سے ہندو مسلم تضاد پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہے، انسانی تاریخ کے تانے بانے میں ایک واقعہ دوسرے کو جنم دیتا ہے۔ ہر غلطی پچھلی سب غلطیوں کا نتیجہ ہوتی ہے، جس سے وہ ایک طرح کی عوامی معافی پاتی ہے۔ اسی طرح ہر غلطی مستقبل کی غلطیوں کو متاثر کرتی ہے، جس سے موجودہ غلطی ایک معنی میں ناقابل معافی بن جاتی ہے۔

''ہندوؤں نے جمہوریت کا سطحی معنی لیا یعنی ایک آدمی، ایک ووٹ۔ مسلمانوں نے ہندو تسلط سے ڈر کر ''حق خود ارادیت'' کی پناہ لی۔ لیکن مغرب کے انداز نیشن اسٹیٹ (میں ثقافتی اتحاد کی بات نہیں کر رہا ہوں) کے تصور کا اتنا گہرا اثر ہو گیا تھا کہ مسٹر جناح جولائی ۱۹۴۶ تک تقسیم کے ڈراؤنے نتیجے کے لئے اپنے کو تیار نہیں کر پائے اور کانگریس کے لیڈر تو دسمبر ۱۹۴۶ تک اس کے امکانات کو رد ہی کر رہے تھے۔''[6]

ہندستان کی تقسیم پر مبنی بہت ساری کتابیں اور اہم بنیادی دستاویز شائع ہو چکے ہیں، جن کی وجہ سے تقسیم کے ذمہ داروں کے چہرے سامنے آ چکے ہیں اور آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہو گیا ہے کہ حمام میں سب ہی ننگے ہیں اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک ''خلیج'' موجود ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ مسلمانوں کے ''اقلیت'' ہونے کی وجہ سے کچھ مسلمانوں کی پارٹی

رہی مسلم لیگ کی آڑ میں سب مسلمانوں کے سر تقسیم کا الزام ڈالنا آسان ہوا ہے۔ نتیجتاً مسٹر جناح کو ایک ویلن (منفی کردار) کے روپ میں پیش کرنے کا جو سلسلہ چلا، وہ برسوں تک چلتا رہا۔ گمراہ کرتی غلط تاریخ کی بنیاد پر شدید حملے مسلمان اب بھی لگاتار جھیل رہے ہیں۔ لیکن اب منصفانہ تجزیوں کے سامنے آنے سے مسٹر جناح کی شخصیت پر لگے داغ آہستہ آہستہ دھلنے لگے ہیں اور سب مسلمانوں کو مجرم ماننے میں دقت محسوس کی جا رہی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سرکردہ نیتا، این۔ڈی۔اے۔(N. D. A.) سرکار کے ہی سابق وزیر داخلہ مع نائب وزیر اعظم ایل۔کے۔اڈوانی کے ذریعہ مسٹر جناح کو ''سیکولر'' ہونے کا سرٹیفکٹ دیا جانا اہمیت رکھتا ہے اور این۔ڈی۔اے۔(N.D.A.) سرکار کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر جسونت سنگھ کی مسٹر جناح پر لکھی اہم کتاب مسٹر جناح کو سیکولر مانتے ہوئے تاریخی حالات کا شکار شخص ثابت کر رہی ہے۔ یہ مثبت انداز فکر اس پارٹی اور تنظیموں سے تعلق رکھنے والے بڑے لیڈروں کے ہیں، جس نے اسی ''تقسیم'' اور مسٹر جناح کو سیاسی مدعا بنا کر اپنی عوامی زمین کو مضبوط کیا اور دلی تک سرکار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ سچائیوں کو تو آج نہ کل سامنے آنا ہی تھا، لیکن جو نقصان اس برصغیر کا ہونا تھا، وہ تو ہو چکا، جن کو سیاسی فائدہ لینا تھا، وہ تو لے چکے ہیں اور لے بھی رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کی جو ذہنیت بن چکی ہے، اس کو بدلنے میں ابھی کچھ اور وقت لگے گا، کیونکہ قدروں کی نفی کرتی سیاست کے حق میں ہے کہ تقسیم کا زخم ہرا ہی رہے اور اس کی آڑ میں اقتدار کا کھیل آسانی سے کھیلا جاتا رہے۔ انگریزوں کی ڈپلومیسی اور ان کے ذریعہ اپنائی گئی پالیسی کے بارے میں ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر کے حوالے سے سوشلسٹ مفکر مدھو لیمے کہتے ہیں:

''انہوں نے (ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر) ہندوؤں کو آگاہ کیا تھا کہ وہ یہ امید نہ کریں کہ انگریز جارح ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں اقتدار سونپ دینگے اور انہیں اپنا جانشیں بنا دینگے۔ ہندوؤں کے چاہنے پر بھی وہ پاکستان کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ انگریز ملک کا بٹوارا کر سکتے ہیں اور اس کے کئی ٹکڑے کرنے میں بھی انہیں ذرا بھی ہچک نہیں ہوگی، بشرطیکہ سبھی ٹکڑے سامراج کے ہمنوا رہیں۔ بہرحال ہندوؤں کو یہ امید نہیں کرنی چاہئے کہ انگریز طاقت کے زور سے پاکستان کے مطالبے کو دبا دینگے، یہ ناممکن ہے۔''

انسان نے اپنی علمی صلاحیتوں کی بدولت آج دنیا کو بہت چھوٹا بنا دیا ہے اور انفارمیشن

ٹیکنالوجی کی نئی نئی دریافت نے کسی راز کو بہت حد تک راز نہیں رہنے دیا ہے۔ اس لئے اب تاریخ کی سچائیوں اور ماضی کے واقعات کے حقائق کو چھپا کر رکھنا ممکن نہیں ہے۔ گذرے دنوں کے واقعات کا منصفانہ تجزیہ اب ممکن ہو رہا ہے۔ آئے دن ریسرچ پر مبنی کتابیں تاریخ کے پوشیدہ گتھیوں کو عام کر رہی ہیں۔ اسی زمرہ میں ممبئی کے مشہور مصنف بیرسٹر اے۔ جی۔ نورانی کی ایک اہم کتاب " Jinnah & Tilak, Comrades in the Freedom Struggle, Oxford Press, Karachi" سے ۲۰۱۰ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مسٹر جناح کی سیاسی اور عوامی زندگی کے کچھ اہم پہلوؤں کو انہوں نے سامنے لایا ہے۔ ساتھ ہی کچھ اہم دستاویزوں کو بھی شائع کیا گیا ہے، جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے ساتھ ناانصافیاں تو ہوئی ہی ہیں، ان کی سیاسی اور سماجی جدوجہد کے اہم پہلوؤں کو ایک سازش کے تحت تاریکی میں رکھ کر ہندستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہوئی ہے اور وہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں اب بھی چل رہا ہے۔ سچائیوں کی بنیاد پر اگر حالات کا منصفانہ تجزیہ ہو اور اس کی بنیاد پر کوئی بامعنی پالیسی بنے، تو نہ صرف ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش، جو تینوں اب ایک تاریخی سچائی بن چکے ہیں، کے آپسی رشتے بہتر اور مضبوط ہونگے، بلکہ ہر جگہ فرقہ وارانہ یکجہتی کا ماحول بھی بنے گا اور اس برصغیر کے تینوں ملکوں ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی عوام کو آپسی تعاون سے اپنے مستقبل کو سدھارنے کا موقع ملے گا۔ اس قدم سے گذرے کل کو واپس لانا تو ممکن نہیں لیکن آپسی غلط فہمیوں کو دور ہونے کے ساتھ سب کو بدحواس کرتی جنگی اقتصادیات (War-Economy) سے راحت بھی مل سکتی ہے، اس سرمایہ کا ترقیاتی کاموں میں استعمال ہو سکتا ہے، اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

اے۔ جی۔ نورانی اپنی کتاب کے مقدمہ میں کہتے ہیں:

''ہندستانیوں اور پاکستانیوں کو مسٹر جناح کی شخصیت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ کر ان کے بارے میں ایک رائے ہونا پڑے گا۔ ہندستانیوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے اور پاکستانیوں کو یہ قبول کرنا پڑے گا کہ وہ اپنی غلطیوں کے شکار ہوئے ہیں۔ دونوں کو ان کی زندگی کے مختلف پرکشش پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ ایک سرگرم محب وطن، مجاہد آزادی، ممبر سنٹرل اسمبلی، شہری حقوق اور سماجی انصاف کے حامی کی حیثیت سے

ان کی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔

''مسٹر جناح کی یا تو بے حد تعریف ہوئی یا ان کو تلخ تنقیدوں کا نشانہ بنا گیا۔ اپنے وقت کی اس بے مثال اور بے نظیر شخصیت کے کارناموں کا منصفانہ تجزیہ ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔''[۸]

بمبئی کے مشہور سوشلسٹ مجاہد آزادی یوسف مہر علی کے ۴ مئی ۱۹۴۴ کے فری پریس جرنل کے ہفتہ وار ''بھارت جیوتی'' میں شائع ایک بیان کے حوالے سے اے۔ جی۔ نورانی لکھتے ہیں:

''مسٹر جناح کا سیاسی کیریر اختلافات سے بھرا رہا ہے۔ لیکن ان کی پچاس برسوں کی عوامی زندگی میں دو سچائیاں غیر اختلافی رہی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ کسی بھی پہلو سے وہ برٹش حکومت کے معاون نہیں اور دوسری بات وہ پوری طرح آئین پرست (constitutionalist) شخص ہیں۔

''ان کی شخصیت بڑی ہی مؤثر اور پرکشش تھی۔ ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ آدھے گھنٹے کی بات چیت کے بعد ان سے بات کرنے والا ان کا مداح بن جاتا تھا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مسٹر جناح جدید ہندستان کے ایک اہم رکن پارلیامنٹ (Parliamentarian) ہیں۔ ۱۹۱۰ سے آج تک لگاتار وہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ ان کی مؤثر شخصیت، متعدد شعبوں کے ان کے ہمہ جہتی تجربات، قانون کی گتھیوں پر زبردست گرفت اور لاجواب حاضر جوابی کے سبب وہ اپنے مدمقابل پر ہمیشہ بھاری پڑتے رہے۔''[۹]

اس تبصرہ پر اے۔ جی۔ نورانی اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مہر علی ایک ایسے نیشنلسٹ تھے، جنہیں نہ مسلمان اور نہ جناح کو نیچا دِکھانے کی ضرورت تھی۔ وہ ایک سرکاری مسلمان نہیں تھے۔''[۱۰]

بابا صاحب امبیڈکر پاکستان اور خاص کر مسٹر جناح پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مسٹر جناح کا بدترین دشمن بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ وہ انگریزوں کے ہتھکنڈے تھے۔ وہ ''انا پرست'' اور ''انفرادی'' ذہنیت سے متاثر ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے مخالفین جو انہیں سر پھرا یا ناشائستہ کہتے ہیں، اس میں حقیقت نہیں ہے۔ ان کے اندر کمزوریاں

ہو سکتی ہیں، لیکن ہندستان کا کوئی سیاست داں ان کی طرح غیر بدعنوان ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا۔ ان کے سارے جاننے والے جانتے ہیں کہ سرکار کے وہ ہمیشہ ناقد ہی رہے ہیں۔ پیسوں کے پیچھے بھاگنے والا یہ شخص نہیں، انہیں کوئی خرید نہیں سکتا۔"[۱۱]

سماجی ناانصافیوں کو جھیلتے ہریجنوں کے حقوق کی حصولیابی کی جدوجہد کی راہ میں آتی دقتوں کے مدنظر ڈاکٹر امبیدکر نے مسلمانوں کے لئے مسٹر جناح کے مطالبہ پاکستان کو بہت حد تک جائز مانا ہے۔ اس وقت کے حالات کا تجزیہ کرتے مسلمانوں کی حالت اور پاکستان کے مطالبہ پر ان کی ایک اہم کتاب Pakistan or Partition of India بھی ۱۹۴۶ میں سامنے آئی۔ ہندستانی سماج کی جکڑن اور ہندوؤں کے بیچ رائج توہم پرستی اور تنگ نظر ذات پات پر مبنی نظام، خاص طور پر ان کے نشانے پر رہے۔ کانگریس کی پالیسی اور گاندھی جی کے رخ پر بھی انہوں نے تیکھے حملے کئے ہیں۔ اقتدار میں حصہ داری کا مسئلہ الجھ کر ملک کے بٹوارے تک کیوں پہنچ گیا، اس کے لئے ہندستان کی روایتی سماجی ساخت اور معیشت کی پرورش کرتی کانگریس کی پالیسیوں کو انہوں نے ذمہ دار مانا ہے۔ اس پس منظر میں پاکستان اور تقسیم کے اصل ذمہ دار مان لئے گئے مسٹر جناح کی شخصیت کی تعریف کچھ معنی رکھتی ہے۔

بہار کے معزز بیرسٹر ڈاکٹر سچیدانند سنہا، جو کنسٹی چیوایئنٹ اسمبلی کے پروٹیم صدر رہے، وہ مسٹر جناح کے لندن میں کلاس فیلو تھے اور لیجسلیٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے بھی ان کے بہت قریب رہے۔ وہ بھی مانتے رہے ہیں کہ مسٹر جناح کے ساتھ کانگریس کے بڑے لیڈروں کا رویہ ٹھیک نہیں رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ ناتجربہ کار جواہر لال نہرو نے کانگریس کے علاوہ کسی پارٹی کے وجود سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر کوئی ہے بھی تو اسے ''کانگریس'' کے اشاروں پر ہی چلنا ہوگا۔ اس کا شدید ردعمل ہوا اور مسٹر جناح کا رخ تلخ ہوتا گیا اور ایک نیشلسٹ آدمی علیحدگی پسند (Separatist) ہو گیا۔[۱۲] اس ذہنیت کا خمیازہ کانگریس اور ملک کو آگے چل کر بھگتنا پڑا۔ پاکستان کی مانگ کو سودا بازی (Bargain) کے طور پر استعمال کرنے والے مسٹر جناح کا رخ سخت ہوتا گیا اور حالات نے اس مطالبہ کو حقیقت میں بدل دیا۔

مؤرخوں نے تاریخی حقائق کو اپنی ٹیڑھی میڑھی سوچ کی تنگ گلیوں سے گذار کر مسلمانوں کے باوقار جینے کی جدوجہد کو ناانصافیوں کی غیر متوازن نظروں سے دیکھا ہے۔

ہندستان کی جو حقیقی حالت تھی، اس نے انگریزوں کو یہاں جم جانے کا سنہرا موقع دیا تھا۔ بہت سے ہندوؤں نے خاص کر بنگال کے ''بھدر بنگالیوں'' نے اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا ہے، جب کہ مسلمانوں نے کئی وجہوں سے اسے ناپسند ہی نہیں، بلکہ مسترد کیا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنے بے لچک انداز کی وجہ سے بڑی قیمت چکانی پڑی ہے۔ انگریزوں کے ذریعہ اٹھائے قدم کسی نہ کسی شکل میں مسلمانوں کو چوٹ پہنچانے کے ہی رہے، یہ بھی تاریخی سچائی ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں جب مسلمانوں کے پڑھے لکھے بیدار اور خوشحال لوگوں کے اندر مسلمانوں کی پستی اور ہر شعبے میں ان کی بدحالی اور گراوٹ کا احساس جاگا، تو ان کے اندر بھی اپنی قوم کی حالت کو سدھارنے کی جستجو پیدا ہوئی۔ اور وہ سرسید احمد خان ان کے نمائندے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جنہوں نے ۱۸۵۷ کی بربادیوں کو دیکھا اور خود بھگتا تھا۔ انہوں نے میرٹھ سے دلّی تک سڑکوں کے دونوں کناروں کے پیڑوں پر مسلمان خوشحال رئیسوں کی ہزاروں لاشیں لٹکی ہوئی دیکھی تھیں، اپنی قوم کی بے بسی پر آنسو بہایا تھا۔ مسلمانوں کے اندر جو انگریز مخالف ذہنیت تھی، انہوں نے اپنے رفقاء کار کے ساتھ مل کر اس کو حقیقت پسندانہ بنانے کی کوشش کی اور اس کے لئے تعلیم کے مناسب نظم کو اولیت دی۔ سرسید احمد خان کے قدم کو تنگ نظر مؤرخوں نے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔ بدقسمتی سے وہ ''نظروں کا ٹیڑھاپن'' ہر اس شخص کے سلسلے میں برقرار رہا، جس نے بھی ''مسلمانوں'' کے مفادات کی بات کی ہے۔

راجا رام موہن رائے نے ہندوؤں کے درمیان مروّج سماجی بُرائیوں کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی، بلکہ اس کی اصلاح کے لئے حیرت انگیز پہل بھی کی تھی۔ مناسب ماحول بنانے کی خاطر تعلیم کے نظام کو فوقیت دی اور ۱۸۱۷ میں ہندو کالج کے قیام میں سرگرمی سے حصہ لیا (وہی کالج ترقی کرتے ہوئے آج کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج کے روپ میں موجود ہے)۔ ۲۰ اگست ۱۸۱۸ کو کلکتہ میں انہوں نے برہمو سماج کی تشکیل کی، تاکہ ہندو دھرم کے نام پر جو بُرے رسومات اور توہم پرستی ہندوؤں میں مروّج ہے، ان سے لوگوں کو نجات ملے۔ ۱۸۲۷ میں انہوں نے اینگلو انڈین اسکول اور ویدانتا کالج قائم کیے۔ ہندو مذہبی گرنتھوں کا بنگلہ اور انگریزی میں ترجمہ کیا، تاکہ عام لوگوں تک ان کے پیغام پہنچ سکیں۔ ایک حساس مفکر کے ناطے یہاں کی سماجی تنگ نظریوں اور ذہنی جکڑن، سیاسی افراتفری اور توہم پرستی سے گھرے مذہبی شدت پسندی سے

وہ کافی متفکر رہے۔ سرکاری تعاون سے حالات میں تبدیلی آئے، اس کے لئے انگریزی سرکار سے انہوں نے قربت بنائی۔ ان کی بھرپور کوشش رہی کہ سرکار ہر شعبہ زندگی میں اصلاح کے مناسب قدم اٹھائے۔ انگریزوں کی حکومت کو ہندستان کے لئے انہوں نے نعمت ہی مانا۔ سماجی حقائق کے مدنظر انہوں نے عملی حقیقت پسندانہ رخ اپنایا تھا۔ اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے ۱۸۲۳ میں انہوں نے کہا تھا:

''ہم ایشور کے ممنون ہیں کہ نعمت کی شکل میں برٹش حکومت یہاں قائم ہوئی۔ دل کی گہرائیوں سے ہم پرارتھنا کرتے ہیں کہ عوامی فلاح میں سرگرم یہ حکومت آنے والی صدیوں تک یہاں قائم رہے۔''[۱۳]

انگریزوں نے سب سے پہلے بنگال میں اپنے قدم جمائے تھے اور اپنی ضرورتوں کے مدنظر انتظامی اداروں کو قائم کیا۔ انگریزوں کے ساتھ عیسائی مشنریز کی جماعت بھی عیسائیت کو پھیلانے کے لئے یہاں آنے لگی۔ نتیجتاً انگلینڈ اور یورپ میں چل رہی اصلاحات کی صدائے باز گشت بنگال میں بھی سنائی دینے لگی۔ لہذا بنگال میں پڑھے لکھے ''بھدر لوگوں'' نے لبرل (Liberal) خیالات کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ اس کو بنیاد بنا کر یہاں بھی اصلاح کی تحریکیں چلائیں۔ ان تحریکوں میں راجا رام موہن رائے کی سرگرمیاں کافی قابل تعریف مانی گئیں اور سب نے انہیں "Father of the Indian Renaissance" (ہندستانی نشاۃ ثانیہ کا بانی) تسلیم کیا۔

اب تصویر کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہندستان کی شکل میں خوبصورت دلہن کی دو آنکھیں ماننے والے سرسید احمد خان نے ۱۸۵۷ کے بعد اینگلو اورینٹل اسکول قائم کیا، تاکہ مسلمانوں کے اندر تعلیم کے ذریعہ سے بیداری لانے کی کوشش کی جائے، تو انہیں علیحدگی پسند ذہنیت پیدا کرنے والا کہا گیا۔ علی گڑھ میں مسلم کالج اور ۱۹۲۰ میں اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سطح پر پہنچانا، علیحدگی پسند رجحان (Separatist Tendency) پیدا کرنے والے قدم کیسے ہو جائیں گے، جب کہ ۱۹۱۶ میں بنارس کے کاشی ہندو یونیورسٹی کے قیام کرنے والے پنڈت مدن موہن مالویہ دیش بھگت ''مہاتما'' مان لئے گئے۔ جب میتھلی شرن گپت نے ''بھارت بھارتی'' لکھی، تو وہ قومی شاعر کہلائے اور الطاف حسین حالی نے ''مسدس

حالی‘‘ لکھی، تو انہیں سر سید کی صف میں ہم نے کھڑا کر دیا۔ ۱۹۲۴ کے بعد پنپی فرقہ واریت کی زہریلی فضا کے پس منظر میں ’’سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا‘‘ کے لکھنے والے ڈاکٹر محمد اقبال نے مسلمانوں کے لئے کچھ خاص رعایتیں اور ہندستان میں ایک محفوظ گوشے کی بات کی، تو انہیں بھی نہیں بخشا گیا، انہیں بھی علیحدگی پسند سر سید کی صف میں ہی لا کھڑا کیا گیا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور ڈاکٹر امبیدکر کے مطالبات پر ہماری نظریں نہیں گئیں۔ ایک ہی جذبہ، ایک ہی منشا، ایک ہی کام، ایک ہی طریقہ، ایک ہی منزل، لیکن اگر وہ ہندوؤں کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچے، تو وہ دیش بھگتی مانی گئی، انہیں انعام و اکرام سے نوازا گیا، ان کی بھرپور عزت افزائی کی گئی اور وہی کام جب ایک ’’مسلمان‘‘ نے کیا، تو اسے مؤرخوں نے ’’علیحدگی پسند ذہنیت‘‘ کا پیدا کرنے والا غدار ثابت کر دیا: سمرتھ کو نہیں دوس گوسائیں۔ اقتدار کی سیاست کرنے والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ تو ایک دو بڑے لوگوں کی نظیر ہم نے پیش کی ہے۔ پورے ملک میں ہزاروں ایسے لوگ ہوں گے جن کے کارناموں کو ایسی ہی ٹیڑھی نظروں سے دیکھا گیا ہوگا اور آج بھی دیکھا اور پرکھا جا رہا ہوگا۔ سیکولر جمہوری ملک کے ایسے رہنما جنہیں ہندستان کے ’’آئین‘‘ کو صحیح وسالم بنائے رکھنا ہے، ان کے سامنے یہ بڑا چیلنج ہے۔ یہ ذہنیت کل بھی غلط تھی اور آج تو نہایت ہی افسوسناک ہے۔ آزاد سیکولر ہندستان کے نظریات اور اقدار کے ساتھ عالمی برادری اور انسانی حقوق کے لئے ایسی سوچ کھلا چیلنج بھی ہے۔ ہمارا آئین "We, the People of India" (ہم، ہندستان کے لوگ) جیسے خوبصورت اعلان سے شروع ہوتا ہے۔ ہر ہندستانی کو برابری کی بنیاد پر اپنی آرزوں کو پورا کرنے کی ضمانت کے ساتھ حساس ہندستانی ہونے کی ذمہ داریوں سے بھی سے آگاہ کراتا ہے۔ اگر آئین کی روح کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی طبقہ، فرقہ یا فرد کے ذریعہ ہوتی ہے تو وہ ہماری گنگا جمنی ثقافت اور ہندستانی روایت پر حملہ ہوگا اور ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں لگے ہمارے بدخواہوں کو نقب لگانے کا سنہرا موقع دے دیگا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کو ’’دو قوم‘‘ ماننے والے سرکردہ مجاہد آزادی لالہ لاجپت رائے نے اس سنجیدہ موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ "Separatist representation" (علیحدگی پسند نمائندگی) کی جڑیں علی گڑھ کالج اور ’’آریہ سماج‘‘ کی

مہموں سے جڑی ہوئی ہیں۔ دیانند سرسوتی اور سرسید احمد خان دونوں ہی بڑے دیش بھگت تھے، لیکن ان دونوں کی تحریکوں کا انجام علیحدگی پسندی (Separatism) کی ذہنیت کو جنم دینے والی ثابت ہوئیں۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر تعلیم کی رغبت تو پیدا ہوئی، انہیں حکومت کے نزدیک بھی لا دیا۔ سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی صلاح بھی دی، تاکہ سرکاری حلقوں میں مسلمانوں کے تئیں ناراضگی نہیں پیدا ہو اور ایک مرحلہ ایسا آیا، جب کانگریس ہی نہیں' ہندو مخالف انداز اس تحریک نے اپنا لیا۔[۱۴] آریہ سماج کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اس نے قدیم ہندستان کے کارناموں پر زور دیتے ہوئے مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں پر ہوئے مظالم اور مندروں کو لوٹنے، انہیں برباد کرنے کی باتوں کو ضرورت سے زیادہ ترجیحی انداز میں پیش کیا۔ آریہ سماجیوں نے غیر ہندوؤں کے خلاف ہندوؤں کو منظم کرنے کی جو زوردار مہم چلائی اس کے تیکھے ردعمل میں مسلمانوں کے درمیان علیحدگی پسند جذبہ پیدا ہوا اور آگے چل کر وہ مضبوط ہو گیا۔ مرحوم بدرالدین طیب جی، رحمت اللہ، اعجاز رسول اور اپنے معاصرین میں مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح، حسن امام اور مظہر الحق کی حب الوطنی اور ہندو مسلم اتحاد کے جذبات کی لالہ لاجپت رائے نے کافی تعریف کی ہے۔[۱۵] ہندو مہا سبھا کے صدر کے ناطے لالہ لاجپت رائے نے بمبئی کے ہندو کانفرنس میں ۵ دسمبر ۱۹۲۵ کو اپنا صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ ہندو مہا سبھا کے قیام کا خاص مقصد ہندوؤں کو منظم کرنا ہی ہے۔ ہندوؤں کے سب طبقوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر انہیں ایک مضبوط اکائی میں بدلنا اس کی اولیت ہے۔ ہندوؤں کے مفادات کیسے محفوظ رہیں، اس کے لئے کوشش تو کرنی ہی ہے، ہندوؤں کو مذہبی، تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی سطح پر مستحکم کرنا بھی اس کے خاص مقاصد ہیں۔[۱۶] یہاں ایک حقیقت قابل غور ہے کہ جب ایک ہندو لالہ لاجپت رائے اور دیانند سرسوتی کی دیش بھگتی پر کوئی سوال نہیں اٹھا سکتا، تو اگر کوئی غیر ہندو مسلمان لیڈر اپنے فرقہ کو منظم کرنے اور ان کے مفادات کی حفاظت کی ضمانت مانگنے کی پہل کرے، تو اسے ''علیحدگی پسند'' کیوں کر کہا جائے گا؟ حالات کا جب منصفانہ تجزیہ کیا جائے گا، تو یہ واضح ہوگا کہ انصاف کے اسی دہرے انداز نے الجھنوں کو جنم دیا اور وقت گذرنے کے ساتھ اسی نے اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش کا روپ لے لیا اور آگے چل کر اس کا انجام اچھا نہیں ہوا۔

آج آزادی کے ۶۴ برسوں کے بعد ہر طبقہ اور فرقہ کی اقتدار میں مناسب حصہ داری اور ریزرویشن کے سوال پر ہندستان میں جو حالت بنی ہوئی ہے، اسے دیکھتے ہوئے انگریزوں کی موجودگی میں مختلف پارٹیوں، تنظیموں اور فرقوں کی اقتدار میں مناسب حصہ داری کی کش مکش کا انداز لگانا آسان ہوگیا ہے۔ پارلمانی جمہوریت (Parliamentry Democracy) میں Adult Franchise (بالغ حق رائے دہندگی) ''ایک آدمی، ایک ووٹ'' کے نظام نے اقتدار میں حصہ داری کی چاہت کو بے حساب بڑھایا ہے اور منڈل کمیشن کی رپورٹ کے لاگو ہوجانے کے بعد کتنے ہی کمیشن مختلف ذاتوں کی حصہ داری کو محفوظ کرانے کی ضمانت دیتی بن چکی ہے۔ ایسے حالات میں اس وقت یعنی آزادی سے پہلے جو نتیجہ سامنے آیا، وہ اس وقت کے پیچیدہ حالات کے پس منظر میں لازمی ہی کہا جائے گا، اب اس کی قیمت چاہے جس کسی کو بھی چکانی پڑے......۔

مسٹر جناح کی سوانح عمری لکھنے والے ویریندر کمار برنوال نے اپنی کتاب کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''جناح مہابھارت کے ایک پرکشش کردار کرن کی یادتازہ کردیتے ہیں، پانڈوؤں کا ہم نسب ہونے کے باوجود جس کی تقدیر تھی گوروکی طرف سے لڑنے کی۔ اس میں دورائے نہیں کہ گاندھی اور نہرو کی طرح مسٹر جناح کی شخصیت بھی برصغیر ہند میں وقتاً فوقتاً پھر سے محاسبہ کی مانگ کرتی رہے گی۔ اپنے انداز کی ایک بے مثال تاریخی شخصیت کے ناطے یہ ان کا حق ہے۔''[۱۷]

حواشی

۱۔ زمزم، لاہور، ۹ اگست، ۱۹۴۴، بحوالہ محمد فاروق قریشی، مولانا ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلّی، ۲۰۰۴، ص ۵۳۹

۲۔ روبندر کمار اور ہری دیو شرما، سیلکٹڈ ورکس آف موتی لال نہرو، جلد ششم، این۔ ایچ۔ ایم۔ ایل۔ ویکاس، ص ۵۸۲۔۵۹۰، بحوالہ جناح اینڈ تلک کامریڈ ان فریڈم اسٹرگل، اے۔ جی۔ نورانی، آکسفورڈ پریس، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۸۹۔۹۱

۳۔ جنگ دھاری پرساد، کچھ اپنی، کچھ دیش کی، جانکی پرکاشن، پٹنہ، ۲۰۰۹، ص ۹۳۔۹۴

۴۔ رام ورکچھ بنی پوری، کچھ میں کچھ وہ، انامیکا پبلشرس، دلی، ۲۰۱۲، ص ۳۶۔۳۷

۵۔ زیڈ۔اے۔احمد، میرے جیون کی کچھ یادیں، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دلی، ۲۰۰۹، ص ۷۱۔۷۲

۶۔ مدھولیمیے، ڈاکٹر امبیڈکر، ایک چنتن، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ایجوکیشنل سوسائٹی، نئی دلی، ۱۹۹۰، ص ۵۳

۷۔ ایضاً ص ۳۶۔۳۷

۸۔ اے۔جی۔نورانی، جناح اینڈ تلک کامریڈ ان فریڈم اسٹرگل، آکسفورڈ پریس، کراچی، ۲۰۱۰، ص XVI-VII

۹۔ ایضاً ص VII

۱۰۔ ایضاً ص VIII

۱۱۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر، لیکھ اور بھاشن، جلد ۸، شکچھا وبھاگ، مہاراشٹر سرکار، ۱۹۹۰، ص ۳۲۸

۱۲۔ ڈاکٹر سچیدانند سنہا، جناح، جیسا میں نے انہیں جانا، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۳، ص ۱۴۔۱۵

۱۳۔ ویریندر گروور، راجا رام موہن رائے، دیپ اینڈ دیپ پبلی کیشن، نئی دلی، ۱۹۹۸، ص ۱۷۲۔۱۷۳

۱۴۔ لالہ لاجپت رائے، رائٹنگس اینڈ اسپیچیز، جلد ۲، یونیورسٹی پبلی کیشن، نئی دلی، ۱۹۶۶، ص ۱۹۲۔۱۹۵

۱۵۔ ایضاً ۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ویریندر کمار برنوال، جناح ایک پورن درشٹی، راج کمل پرکاشن، نئی دلی، ۲۰۰۵، ص ۳۷۹
اردو کی پرکشش پہچان کے ساتھ اسے اونچائی تک پہنچانے میں منشی نولکشور، دیاشنکر نسیم، نہال چند لاہوری، مہر چند کھتری، پریم چند، فراق گورکھپوری، پنڈت برج نارائن چکبست، پنڈت رتن ناتھ سرشار، گوپی ناتھ امن، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، کنور مہندر سنگھ بیدی ایک طویل فہرست ان غیر مسلم اردو کے ادیبوں کی ہے جن کا ذکر کیے بغیر اردو ادب کی

تاریخ ادھوری ہے۔

تاریخ سے ہم نے کچھ نہیں سیکھا......

۱۹۳۷ میں اقتدار کی لذت اور آزادی کی پہلی قسط مل جانے کے بعد مکمل آزادی اور پھر اقتدار میں سب کی حصہ داری کے سوال پر جو کش مکش چلی، اس نے ہندستانیوں کو بڑی قیمت چکانے پر مجبور کیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزادی کی لڑائی جب منزل مقصود پر پہنچی، تو ہم جھلسے ہوئے لٹے لٹائے زخموں سے چور تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان کو دو غیر فطری حصوں میں بانٹ کر ایک الگ آزاد ملک ''پاکستان'' بنایا گیا تھا۔ اس سیاسی پیش رفت نے اس برصغیر میں صدیوں کے آپسی میل ملاپ اور ساجھے تجربوں کی بنیاد پر سنورے اور فروغ پائے مشترکہ سماجی تانے بانے کو پوری طرح تار تار کر دیا۔ بڑے پیمانہ پر ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب ہندستان اور پاکستان میں ہر جگہ غم، غصہ، مایوسی اور عدم اعتماد کا ماحول تھا اور تناؤ کی حالت میں بیشتر ہندو، سکھ اور مسلمان جی رہے تھے۔ ایمرجنسی میں سیزیرین (cesarean) عمل ولادت جیسا طریقہ اپنا کر انجانے حالات میں پاکستان کا جنم ہوا تھا اور اس سنگین ماحول میں نوتولد معصوم بچے کے لئے جس حساس ماحول کی فطری ضرورت ہوتی ہے، وہ اسے میسر نہیں تھا۔ ایک نئے ملک کے لئے ایک نیا نظام بنانے، اسے مستحکم اور متوازن بنائے رکھنے میں جو نارمل ماحول چاہئے تھا، اس کا وہاں پورا فقدان تھا۔ سیزیرین سرجری (cesarean surgery) کے عمل سے گذری ''ماں'' کا جو درد ہوتا ہے، بٹوارے کے بعد وہی درد ہندستان بھی بھگت رہا تھا اور فرقہ وارانہ فسادات کی شدت نے یہاں کی حالت کو ابنارمل بنا دیا تھا۔ اپنے ایک حصے کے الگ ہو جانے کی جان لیوا تکلیف کو برداشت کرنا یہاں بھی آسان نہیں تھا، لیکن ایک انہونی واضح شکل لے کر دو ملکوں کی شکل میں قائم ہو چکی تھی اور اس حقیقت کو تسلیم کرنا سب کی مجبوری تھی۔ نظم ونسق کے مدنظر دونوں ملکوں کی حالت میں پیدائشی طور پر تھوڑا فرق تھا۔ چونکہ برٹش سرکار کے مختلف شعبوں کے دفتر دلی،

کلکتہ اور ہندستان کے دوسرے بڑے شہروں میں پہلے سے کام کر رہے تھے، اس لئے یہاں بنا بنایا نظام اور کارگر ڈھانچے موجود تھے۔ بٹوارے کا اثر یہاں بھی تھا، لیکن اسے جلد ہی پٹری پر لانے کی یہاں پوری گنجائش تھی۔ لیکن وہاں پاکستان میں بہت کچھ نئے سرے سے بنایا جانا تھا۔ نئے ملک کے لئے مناسب اقتصادی نظام کے ساتھ نئے انتظامی ڈھانچے کو فروغ دینا تو تھا ہی، نئے ملک کے تجربوں کے مطابق ماحول اور لوگوں کی ذہنیت بھی بنانی تھی، جو کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سب بڑے کارخانے، بجلی گھر، معدنیات کے ذخیرے، دفاعی اہمیت کے بیشتر بڑے اسٹیبلشمنٹ ہندستان کے حصے میں آئے تھے۔ اس لئے پاکستان کے سامنے مشکلیں ہی مشکلیں تھیں۔ پیدائشی طور پر وہ دو حصوں میں منقسم بھی تھا۔ ایک حصہ سے دوسرے حصہ (مشرقی پاکستان) تک آنے جانے کے لئے ہزاروں میل کا سمندری راستہ طے کرنا پڑتا تھا اور جو زمینی اور ہوائی راستے تھے، وہ ہندستان سے ہو کر گذرتے تھے، جسے استعمال کرنے کے لئے اسے ہندستان کی اجازت کی ضرورت تھی۔ نئے ملک ''پاکستان'' کے بن جانے اور جذباتی ماحول میں ٹھہراؤ آجانے کے بعد جب حقائق سامنے آئے، تب پتا چلا کہ نئے ملک پاکستان کے ذمہ دار لوگوں کے سامنے ہر شعبے میں چیلنج ہی چیلنج منہ کھولے کھڑے تھے۔

دونوں ملکوں کی مشترک وراثت رہی، ایک ہی تاریخ اور جغرافیہ رہا، لیکن انہیں اب دو بنانے کا عمل چل رہا تھا۔ اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش اور سامراجی انگریزوں کی سازش کے نتیجے میں ہندستان کی دو خاص اکائیوں کو ''دو قوم'' ثابت کرتی اقتدار کی سیاست کامیاب ہوگئی تھی اور اب ہندستان کے حقائق سے انجان رڈ کلف نے ہندستان کو منقسم کرنے کے لئے جو ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچی تھیں، اس کی بنیاد پر جغرافیائی حقائق کو بھی بدلا جا رہا تھا۔ دونوں طرف پیچیدگیاں ہی پیچیدگیاں تھیں۔ دونوں طرف ایک دوسرے کے تئیں عدم اعتماد کا ماحول تھا۔

ہندستان کی مختلف تنظیموں کے سرکردہ بڑے ہندو لیڈروں اور کانگریس اور اسے حمایت دینے والی پارٹیوں کے مسلم رہنماؤں نے مسلم لیگ کی ''دو قومیت'' کے نظریہ اور اس بنیاد پر ''پاکستان'' کے بننے کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ لیکن مخالفت کے باوجود حالات نے ''پاکستان'' کو ایک حقیقت کے روپ میں بدل دیا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو اس کے قیام کا اعلان ہو گیا اور ایک آزاد ملک کی حیثیت میں وہ عالمی برادری میں شامل ہو کر منظوری حاصل کر چکا تھا۔ لیکن ابھی بھی

ہندستان میں ایسے لوگ تھے، جنھیں یہ تبدیلی گوارا نہیں تھی۔ پاکستان کے وجود کو نامنظور کرنے والے ایسے ہی ذمہ دار لوگوں کے اکثر بیان بھی دیکھنے کو مل رہے تھے کہ ''پاکستان'' بن تو گیا ہے، مگر وہ کتنے دنوں تک برقرار رہے گا......؟ بس سال دو سال...... مہینے چھ مہینے، یہی اس کی زندگی ہے۔ جن حالات میں پاکستان وجود میں آیا تھا، وہ اپنے آپ میں پیچیدہ حالات تھے۔ اس ماحول میں نئے نئے بنے پاکستان کے بارے میں پھیلی افواہ اور مایوس کن بیانوں کا پاکستان میں مثبت اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ وہاں بھی ہندستان کے خلاف منفی ذہنیت مضبوط ہو رہی تھی۔ گوا ستیہ گرہ اور پھر گوا کا ہندستان میں ملا لینا، حیدرآباد میں ہندستان کا پولس ایکشن (۱۹۴۸) اور جوناگڑھ کا ہندستان میں ضم کیا جانا (۱۹۴۸) کچھ ایسے واقعات تھے، جن کی وجہ سے ڈر کی ذہنیت میں گرفتار وہاں کی لیڈرشپ اور عام لوگ ''ہندستان'' کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ شک کے ماحول میں وہاں لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہندستان اور ہندستانی، خاص کر یہاں کے ایسے ہندو، جو غیر منقسم ہندستان کا خواب برسوں سے دلوں میں سموئے ہوئے تھے، وہ اس کو بھولنے کو تیار نہیں، پاکستان کے وجود کو ماننے کو ہی تیار نہیں، وہ کسی وقت اسے ختم کر سکتے ہیں، طاقت کے زور پر دوبارہ اپنے میں ملا بھی لے سکتے ہیں۔ نتیجتاً اپنے قیام کے کچھ دنوں کے بعد ہی اپنی محافظت کے مدنظر پاکستان بغداد اور سنٹو پیکٹ جیسے مغربی ملکوں کی فوجی محافظتی تنظیموں کا ممبر بن کر امریکی خیمہ میں جا بیٹھا۔ کشمیر میں پاکستان حمایت یافتہ قبائلی دراندازی (۱۹۴۷) کے ساتھ دونوں نئے پڑوسی ملکوں کے درمیان تلخی بھرے ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہی وہ وقت ہے، جب پاکستان کی سرکاری پالیسیوں میں فوجیوں کی دخل اندازی بھی شروع ہوئی، جو وقت گذرنے کے ساتھ مضبوط اور لازمی ہوتی چلی گئی، نتیجتاً وہاں جمہوریت کی جڑیں نہیں جم سکیں۔ وہاں کی سیاسی حالت امریکی خیموں کو وہاں پاؤں جمانے کا موقع دیتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں نہ خود انحصاری آئی اور نہ خود اعتمادی اور نہ وہاں سرکاروں کا استحکام۔ ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور پاکستان شدت پسندوں کا گڑھ۔ پڑوسی ملک افغانستان کے واقعات کا اثر بھی یہاں پڑنا تھا ہی، لہٰذا کسی نہ کسی بہانے وہاں امریکی دخل اندازی شروع ہوئی۔ یو۔ این۔ او۔ کے فیصلوں کی آڑ میں ان شدت پسندوں پر امریکی بم گرنے لگے اور وہ علاقہ نئے امریکی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ بن گیا۔ نتیجتاً پاکستان ہی نہیں پورے برصغیر کے لئے آج خطرناک حالت بنتی چلی جا

رہی ہے۔

پاکستان کے بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶-۱۹۴۸) کی ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ کو موت اور ہندستان کے عبوری سرکار میں وزیر خزانہ رہے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا پشاور کے عوامی جلسے میں ۱۹۵۱ میں قتل کے بعد وہاں سیاسی عدم استحکام اور سازشوں کا سلسلہ چلا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ کو دوسرے وزیر اعظم خواجہ نظام الدین کو جنرل غلام محمد نے برخواست کر خود کو صدر بنا کر وہاں نہ ختم ہونے والے سیاسی عدم استحکام اور فوجی دخل اندازی کی شروعات کر دی۔ علاقائیت کی لعنت نے بھی رنگ لانا شروع کیا۔ اقتدار کی کش مکش کے اس ماحول میں ہندستان سے گئے مہاجروں کے لئے بُرے دنوں کی آمد کی آہٹ سنائی پڑنے لگی تھی۔ مرکزی حکومت میں مایوس کن تبدیلیوں کا ایسا سلسلہ چلا کہ لوگ یہ کہنے کی حالت میں نہیں رہے کہ آج جو وزیر اعظم یا صدر وہاں ہیں، کل وہ رہیں گے بھی یا نہیں۔ مارشل لا، صدروں کی تاناشاہی، وزیروں اور وزیر اعظموں کے قتل نے پاکستانیوں کی روزمرہ کی زندگی کو تو الجھا دیا ہی، وہاں کی انتظامیہ سوالوں کے گھیرے میں آتی گئی۔ سرکاری پالیسیاں، خاص کر خارجہ پالیسی، ہندستان مخالفت پر ہی مرکوز رہی اور ہندستان کے تئیں ہمیشہ شبہات کا ماحول ہی بنا رہا۔ نتیجتاً دونوں ملکوں کے درمیان تین لڑائیاں ہوئیں اور سرد اور گرم رشتوں کا سلسلہ اب تک چلتا آرہا ہے۔ کشمیر کا مسئلہ دونوں ملکوں کے درمیان عدم اعتماد اور ٹکراؤ کی فضا بنانے میں اہم مدعا رہا ہے۔ ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کے بننے کے بعد اس برصغیر کی سیاست نے مزید الجھنوں کو جنم دیا اور دونوں ملکوں کے درمیان موجود گہری خلیج اور گہری ہوگئی ہے۔

آزادی کے بعد ہندستان میں بھی حالت کو معمول پر لانے میں کافی وقت لگا۔ یہاں انتظامی ڈھانچہ موجود تھا اور تجربہ کار لیڈرشپ کی موجودگی میں حالت کو سنبھالنے میں جلد کامیابی ملی۔ گاندھی جی ابھی موجود تھے اور اپنے نظریات پر پڑ رہے چوطرفہ حملوں کے ساتھ اپنے پیروکاروں کی بے رخی کا درد جھیل رہے تھے۔ لیکن امن اور یکجہتی کا ماحول کیسے بنا رہے ان کی اولیت بنی رہی۔ آزادی کی لڑائی میں سرگرم رول ادا کرنے والے ان کے پرستاروں کے سامنے جب اقتدار آگیا، تو انہوں نے اسے ہی ترجیح دی، گاندھی جی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے وجود کو گاندھی جی نے ایک حقیقت پسند مدبّر کے ناطے کھلے دل سے تسلیم کیا تھا

اور دونوں ملکوں کے درمیان اچھے رشتے قائم رہیں، اس کے لئے مناسب ماحول بنانے میں وہ سرگرمی سے لگے رہے۔ وہ کشمیر کی صورت حال سے متفکر تھے اور اس مسئلہ کو یو۔این۔او۔ میں لے جانے کے خلاف تھے، لیکن اقتدار میں بیٹھے لوگوں نے اسے نامنظور کیا۔ ۴ جنوری ۱۹۴۸ کو دلّی کی اپنی پرارتھنا سبھا میں انہوں نے کہا تھا کہ ان ملکوں (ہندستان اور پاکستان) کو اپنے مسائل خود مل بیٹھ کر طے کر لینا چاہئے۔ اپنے اختلافات کو حل کرنے کے لئے تیسرے فریق کو اس میں لانا ان دونوں ملکوں کے لئے نقصان دہ ہوگا اور آگے چل کر دونوں بڑی طاقتوں کے غلام ہو جائیںگے۔ گاندھی جی کے وہ شبہات اب حقیقی روپ میں ہمارے سامنے ہیں۔

گاندھی جی پوری طرح سمجھ چکے تھے کہ جواہر لال اور کانگریس ان کے خوابوں کے ہندستان کے تصورات سے متفق نہیں۔ ''ہند سوراجیہ'' کے نظریات کے بجائے مغربی پارلمانی جمہوریت اور وہاں کے ترقیاتی ماڈل ہی ان کی اولیت ہے۔ جواہر لال نے گاندھی جی کو لکھے اپنے خطوط میں اس کا اشارہ دے دیا تھا اور اپنے اٹھائے قدموں سے واضح کر دیا کہ ہندستان کی تعمیر نو اور اس کی چوطرفہ ترقی پارلمانی جمہوریت اور مغرب کے ترقیاتی ماڈل کو اپنانے سے ہی ممکن ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ میں گاندھی جی سے ہوئی ان کی مراسلت سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ آزاد ہندستان گاندھی جی کے تصورات کا ہندستان نہیں بننے جا رہا ہے۔ گاندھی جی اپنے پرستاروں کے بدلے رویے سے مایوس ہو چکے تھے، لیکن ملک کی جو حالت بن گئی تھی اس میں کوئی نئی پہل کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے امن بحالی ہی ان کی اولیت بنی رہی۔ [1]۶۴ برسوں کے آزاد ہندستان کی تاریخ واضح کر رہی ہے کہ اس برصغیر کے بیشتر مسائل اور ہند پاک رشتوں کی الجھنیں کشمیر سے ہی جڑی ہوئی ہیں اور مغربی طاقتیں یو۔این۔او۔ کی آڑ میں چوہے بلی کا کھیل کھیل کر اپنے ہتھیاروں کا کاروبار چمکائے ہوئے ہیں اور اب تک کا اپنایا ترقیاتی ماڈل بھی بیشتر ہندستانیوں کی تقدیر نہیں بدل سکا ہے۔

ہم ان سیاسی حالات کا جائزہ لے چکے ہیں، جہاں حالت کچھ ایسی بن گئی تھی جہاں گاندھی جی اکیلے نظر آتے ہیں اور ان کے نہیں چاہنے کے باوجود ملک کا بٹوارا ہوا اور ہندستان کی کوکھ سے پاکستان کا جنم ہوا۔ اپنی کوششوں میں مات کھائے گاندھی جی نے کھلے دل سے حقیقت کو تسلیم کیا اور نہ صرف پاکستان کے وجود کو فراخدلی سے قبول کیا، بلکہ اپنے امن مشن میں اسی

انہماک سے لگے رہے، جس طرح پہلے لگے ہوئے تھے۔ دونوں ملکوں کے درمیان پر امن رشتہ قائم ہو، دونوں ملکوں کی عوام کے بیچ یکجہتی کا رشتہ بنا رہے، یہ کوشش ان کی اولیت تھی، اسی مقصد سے وہ پاکستان جانے کا منصوبہ بھی بنا چکے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ پاکستان اور متحدہ ہندستان کی کش مکش اب ختم ہو چکی ہے، اس حقیقت کو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا اور دونوں ملکوں میں ہندو اور مسلمان امن پسند شہری کے روپ میں ساتھ ساتھ رہیں، یہی کوشش سب کی ہونی چاہیے۔ گذرے ہوئے کل کی باتوں پر ماتم کرنا آگے بڑھنے کے راستے میں معاون نہیں، بلکہ رکاوٹ ہی بنے گا۔ انہوں نے صاف الفاظ میں لوگوں سے کہا۔ انہوں نے صلاح دی کہ حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے کو مہذب شہری کی شکل میں پیش کرنے کی لوگوں کو کوشش کرنی ہوگی۔ حوصلہ بڑھاتے ہوئے اقلیتوں کو انہوں نے صلاح دی کہ انہیں بھی سمجھنا چاہیے کہ اکثریتوں کی طرح وہ بھی اس ملک کے باوقار شہری ہیں اور ملک کی تعمیر میں انہیں بھی اہم رول ادا کرنا ہے۔

تاریخی واقعات کے پس منظر میں حالات کے منصفانہ تجزیہ سے واضح ہوتا ہے کہ گاندھی جی ہی واحد ایسے ''ہندو'' ہیں، جنہوں نے پاکستان بننے کی پرزور مخالفت کرتے اپنی لاش پر ملک کے بٹوارے کی بات کی، لیکن جب ان کی مرضی کے خلاف سیاست نے کروٹ لے لی اور پاکستان بن گیا، تو اس کے وجود کو کھلے دل سے تسلیم کیا۔ ہندستان کے ساتھ پاکستان میں بھی امن قائم ہو، اس کے لئے اپنی مستعدی دکھائی اور وہاں کے حالات کا جائزہ لینے پنڈت سندر لال کو اپنا نمائندہ بنا کر پاکستان کے گورنر جنرل محمد علی جناح اور وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملنے کے لئے بھیجا تھا، تاکہ اپنے امن مشن میں وہ پاکستان جا سکیں، یہ فضا بنے۔ ۱۲ فروری ۱۹۴۸ کا دن بھی ان کی روانگی کا لگ بھگ طے تھا، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان کا وہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا، اقتدار کی سیاست راستے میں حائل ہوگئی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو ان کے مار دئے جانے کے بعد ''پاکستان'' کو ایک آزاد اور خود مختار ملک ماننے والا شاید ہی کوئی ''ہندو'' بچ رہا ہو۔ آج ۶۴ برسوں کے بعد جو حالت ہے، اس میں واضح ہوتا ہے کہ واقعی ''پاکستان'' ایک خود مختار مسلم ملک ''پاکستان'' کے روپ میں ہندستانیوں، خاص کر ہندوؤں کی اکثریت کو قبول نہیں ہے۔ حقائق کو جھٹلاتے اس منفی نظریہ کا نتیجہ بھی غیر تعمیری ہی شروع سے دِکھتا چلا آرہا ہے۔ اس ذہنیت کا بُرا اثر دونوں ملکوں کے رشتوں پر تو پڑتا ہی رہا ہے، یہاں کی ہندو اور مسلم آبادی کے رشتوں کو بھی اس

نے بہت متاثر کیا ہے۔ نتیجتاً دونوں فرقوں کی خاصی بڑی آبادی کے درمیان عدم اعتماد کے رجحان کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چلتا آرہا ہے۔ چونکہ سوچ کا یہ انداز ہمارے درمیان گہرائیوں تک موجود ہے، لہذا حالات کے مدنظر وہ کبھی ابھر کر سامنے آتا ہے اور کبھی اندر ہی اندر ہماری سوچ اور برتاؤ کو مستحکم نہیں ہونے دیتا اور ''فرقہ واریت'' کی شکل میں اکثر وہ ابھر آتا ہے۔ یہ گرم اور سرد رشتوں کا سلسلہ ہماری ہی نہیں، شاید اس پورے برصغیر کی تقدیر بن گئی ہے۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں دو آزاد ممالک تو بن گئے لیکن دونوں کے درمیان کے رشتوں پر عدم اعتماد کا گہرا چھایا رہا۔ پاکستان میں کسی طرح کی بدامنی ابھرے یا وہاں کوئی تکلیف دہ حادثہ ہو، وہاں کی انتظامیہ کو اس واقعہ کے پیچھے ہندستانی ایجنٹ اور خفیہ ایجنسی را (RAW) کا ہاتھ نظر آنے لگتا ہے اور پھر بڑے پیمانے پر ہندستان مخالف پروپیگنڈا شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں بچ رہے ہندو اور سکھ اُسی تکلیف دہ حالات سے دوچار ہو جاتے ہیں، جو یہاں کے مسلمانوں کی اکثر ہو جاتی ہے۔ خوف زدہ ذہنیت کا شکار پاکستان ہمارے مقابلے میں چھوٹا ملک ہے اور وہاں بدقسمتی سے جمہوریت کی جڑیں نہیں مستحکم ہو پائی ہیں۔ وہاں کی پالیسیوں کے تعین میں ''سول'' سے زیادہ ''فوجی'' مداخلت ہوتی رہی ہے۔ پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش بنائے جانے کے بعد ہندستان مخالف ذہنیت وہاں اور مضبوط ہوئی ہے۔ اس علاقے میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے مغربی ملکوں کی بھی پالیسی رہی ہے کہ اس علاقے میں عدم توازن بنا رہے، تاکہ انہیں ان کی بگڑی ہوئی حالت سے فائدہ ملے۔ ان کے ہتھیاروں کا کاروبار بھی چمکے، دونوں ملکوں کے درمیان ثالثی کرنے کا سنہرا موقع بھی انہیں ملے اور انسانی اقدار کے نگہبان ہونے کا ان کا نادنہاد مکھوٹا برقرار رہے۔

یہاں ہندستان میں بھی تھوڑے فرق کے ساتھ سوچنے کا انداز وہاں سے بہتر نہیں ہے۔ ہر ناپسندیدہ واقعات کے پیچھے پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی۔ ایس۔ آئی۔ (ISI) یا اس سے متاثر افراد اور تنظیموں کی کرتوت ہمیں بھی نظر آنے لگتی ہے۔ دونوں طرف کے کچھ واقعات میں ان کے ہاتھ ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی، دونوں باتوں کی گنجائش ہے۔ چونکہ دونوں ملکوں کے درمیان شبہات اور عدم اعتمادی کی جڑیں پیدائشی طور پر گہری ہیں، اس لئے بغیر تحقیقات کے ان کی طرف اشارہ کر دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ دونوں ملکوں کی سرکاریں تو آمنے سامنے دِکھنے لگتی

ہی ہیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی تلخی بڑھتی ہے، تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ دونوں ملکوں کے آپسی شک وشبہ کے ماحول میں تخریب کاری عناصر حالات کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں، اس کی بھی پوری گنجائش بنی رہتی ہے۔ پاکستان سے حاصل قابل اعتبار خبروں کے فقدان میں وہاں کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن یہاں ہندستان میں جب کوئی ناپسندیدہ واقعہ رونما ہوتا ہے، تو کچھ رٹے رٹائے مسلم تنظیموں کا نام اچھال کر بغیر جانچ کئے، بغیر وارنٹ کے پولس کچھ مسلمانوں کو پہلے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتی ہے اور اس کے بعد جانچ پڑتال میں لگتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس عمل میں زیادہ تر بے قصور مسلمان پولس کے ٹارگیٹ بن جاتے ہیں۔ پہلے داڑھی والے مولوی، مدرسے اور نوجوان شکار بنتے تھے اور اب تاجر، کاریگر، انجینئر، کمپیوٹر کے جانکار اور ڈاکٹروں کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اس عمل میں پولس اور جانچ ایجنسیوں کی غیر جانبداری سوالوں کے گھیرے میں ہے۔ ایسے پولس ایکشن کا ملک گیر احتجاج ہونے لگا ہے۔ بہار اور یوپی کے کچھ علاقے ایسے ایکشن کے نشانے پر ہیں اور یہاں کی مقامی سرکاریں مسلمانوں کے ساتھ حقوق انسانی سے متعلق تنظیموں کے اعتراضات جھیل رہی ہیں کیونکہ اس جانبدارانہ رویے سے اصلی مجرم تک پہنچنا مشکل ہو رہا ہے۔

دنیا میں ہماری پہچان ایک ایسے پلورل بناوٹ والے سیکولر جمہوری ملک کی ہے، جس کا مذہبی اور سماجی تانا بانا بڑا الجھا ہوا ہے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کی کوشش میں آپسی کش مکش اور ٹکراؤ کی لازمی حالت بھی اکثر بنتی رہتی ہے۔ خالص اقتدار کی سیاست کرنے والوں کے لئے یہاں کی سماجی بناوٹ کی پیچیدگیاں اکثر موافق ثابت ہوتی ہیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کا خوب موقع انہیں ملتا رہتا ہے۔ مغربی پارلمانی نظام پر مبنی ہماری جمہوریت بالغ حق رائے دہندگی کے ایک آدمی ایک ووٹ کے نظم پر منحصر ہے۔ اس نظام کا غلط استعمال یہاں کھل کر ہوتا رہا ہے۔ اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے، تو تھوڑے سے فرق کے ساتھ ''ذات'' اور ''فرقہ وارانہ'' سیاست ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ لیکن اس سیاست کا سماج پر جو اثر پڑتا ہے، اس میں تھوڑا فرق ہے۔ ایک سماج میں ناچاقی پیدا کرتی ہے تو دوسرا نفرت اور جلد نہ مٹنے والی خلیج۔ اور حالات سے فائدہ اٹھانے کے فراق میں دونوں ہی ذہنیت والے لوگ لگے رہتے ہیں۔ خاص کر فرقہ واریت کی سیاست کرنے والے عناصر ایسے موقعوں کی تلاش میں ہی رہتے ہیں اور موقع نہ ملے، تو بھی

ویسی حالت بنانے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ فرقہ واریت پھیلانے کے سلسلے میں یہاں کی میڈیا کا رول بھی تعمیری نہیں رہا ہے۔ کچھ اصلی اور کچھ فرضی حقائق کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کی وجہ سے دونوں فرقوں کے درمیان جو تناؤ بڑھتا ہے، اس کا اثر سرحد پار تک پہنچتا ہے۔ دونوں طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عدم اعتماد کی خلیج کچھ اور ہی بڑھ جاتی ہے۔ صبح سے شام تک اکثر یہی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ یہاں کے سارے ناپسندیدہ واقعات کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے۔ ایسے پروپیگنڈا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''پاکستان'' اور یہاں کے مسلمانوں کے خلاف منفی ماحول بنتا ہے، کیونکہ اس ''سازشی پاکستان'' کو تو مسلمانوں نے ہی بنوایا ہے، یہاں یہی ذہنیت پہلے سے بنی ہوئی موجود ہے۔ ملک کے بٹوارے کے وقت سے ہی غلط جانکاریوں کی بنیاد پر جو ماحول بنایا گیا، اس کی روشنی میں پاکستان بنوانے کے مجرموں میں صرف اور صرف ''مسلمان'' ہی دکھائے جاتے رہے ہیں، جو تاریخی سچائی نہیں ہے۔ مسلم لیگ کچھ مسلمانوں کی پارٹی رہی۔ اس نے پاکستان کا مطالبہ کیا، اسے صاف کہنے کے بجائے سب مسلمانوں کو ناکردہ گناہ کے الزام میں کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا رہا، جو مناسب نہیں ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کانگریس اور بڑی تعداد میں اس کے لیڈران، ہندو مہا سبھا، اکالی دل، جن سنگھ اور سنگھ پریوار، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ فی زمانہ انگریزی سرکار کے ملک کے بٹوارے میں رہے رول کو جرم کی حد تک چھپانے کی کوشش کی گئی۔ لہذا مسلمانوں اور صرف مسلمانوں کو بٹوارے کا مجرم مان کر سیاست کی جاتی رہی اور یہاں کا ماحول پراگندہ ہوتا رہا۔ اور ایسے وہ لوگ جن لوگوں کی نظر میں یہاں کے مسلمان ہمیشہ کھٹکتے ہی رہے ہیں، ان کو اپنی سیاست چمکانے کا سنہرا موقع ملتا رہا۔ نتیجتاً مسلمانوں کے لئے تحفظ اور سکون کی زمین سکڑتی گئی۔ ہندستانیوں کی یہ دوسری بڑی آبادی اپنے تحفظ اور عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی فکر میں چوبیس گھنٹے مبتلا کر دی گئی۔ حالات ایسے بن گئے ہیں کہ جس پارٹی نے ان کی جان و مال کی محافظت کی ضمانت دینے کا بھروسہ دلایا یا باوقار، خوشحال زندگی گذارنے کے مواقع مہیا کرنے کا سبز باغ دکھایا، یہ ان کے ساتھ ٹھگتی گئی۔ آج ۶۴ برسوں کے آزاد ہندستان میں مسلمان کہاں پر کھڑے ہیں، یہ گوپال سنگھ، رنگناتھ مشرا اور سچر کمیشن کی رپورٹیں بتلا رہی ہیں۔

''فرقہ واریت'' اقلیتوں کی ہو یا اکثریتوں کی، دونوں ہی خطرناک اور قابل مذمت

ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے سول سوسائٹی کا بنا بنایا تانا بانا بکھر جاتا ہے۔ اس سیاق وسباق میں زیادہ تر دانشور ایک رائے ہیں کہ ''اکثریتوں'' کی فرقہ واریت زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ وہاں تعداد کی انا موجود ہوتی ہے، ساتھ ہی قومیت کا وہ لبادہ اوڑھے رہتی ہے۔ تاریخی شواہد وضاحت سے اس دلیل کی تصدیق کرتے ہیں۔ کلچرل نیشنلزم کی ابتدا ۱۹۰۴-۱۹۰۵ سے ہی ہندستان میں ہونے لگی تھی۔ گذشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چلی اصلاحی اور احیا پرستی کی تحریکوں نے ان کے درمیان بیداری لائی، لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ ان تحریکوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے تیکھے تیور لئے لا کھڑا بھی کیا ہے۔ غلامی کے دنوں میں نفرت اور ٹکراؤ کے خاص اسباب تھے شُدھی، سنگھٹن، گئوکشی، جہاد، قربانی، کافر، مسجدوں کے سامنے باجوں کا بجانا اور تبلیغ۔ ان مسائل پر آزادی سے پہلے کافی بحثیں ہو چکی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سر پھٹوول اور فرقہ وارانہ فسادات بھی خوب ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے سے دوری بنانے کی جو لگاتار کوشش ہوئی، نتیجتاً اس نے ملک کو تقسیم کی حدوں تک پہنچا دیا۔ لیکن اتنی بڑی قیمت چکانے کے باوجود ہماری ذہنیت میں بنیادی تبدیلی نہیں آسکی، یہ ہماری بدقسمتی ہے، ملک کی تقسیم، لاکھوں لوگوں کا مارا جانا اور بے انتہا بربادی ہمیں مثبت سبق نہیں دے سکی۔ پاکستان بننے کے بعد جو ماحول بنتا رہا، اس کے منصفانہ تجزیہ سے پتا چلتا ہے کہ اکثریتوں کے فرقہ پرست عناصر کے لئے یہ المیہ ''سبق'' بننے کے بجائے ''طاقت بڑھانے والا ٹونک'' ثابت ہو گئے۔ تقسیمِ ملک کو ایشو بنا کر ان کی فرقہ وارانہ مہم اور تیز ہوئی اور ان مہموں نے ایسی زہریلی فضا بنا دی، جہاں ان کے لئے حصولِ اقتدار آسان ہوا، لیکن پاکستان اور بہت حد تک ہندستانی مسلمانوں کے خلاف ماحول غیر دوستانہ بنتا گیا۔

آزادی سے پہلے جو صورت حال بنی تھی اس میں اکثریتوں کے وہ فرقہ وارانہ عناصر اپنی تنگ نظریوں پر مبنی مقاصد کے حصول میں ناکام ضرور رہے، لیکن انہوں نے فرقہ واریت کی توسیع کی زمین پوری طرح تیار کر دی۔ آزاد ہندستان میں اسی ایجنڈا پر انہوں نے پھر مستعدی سے کام کرنا شروع کیا۔ آزادی کے بعد ہندستان نے جو سیکولر جمہوری نظام کو اپنایا، وہ انہیں آج بھی منظور نہیں ہے۔ فاشسٹ ذہنیت کے پروردہ آر۔ ایس۔ ایس۔ اور سنگھ پریوار نے سب ہندستانیوں کو عام آئینی حقوق اور مواقع کی ضمانتیں مہیا کراتے جمہوری نظام ''جمہوریت'' اور

سیکولر جمہوری آئین کو بھی ''ہندستان'' کے لئے کبھی مناسب نہیں مانا ہے۔ ان عناصر کے محرک پیشوا آر۔ ایس۔ ایس۔ کے بانی ڈاکٹر ہیڈ گووار اور ان کے جانشیں گرو مادھو سدا شیو گول والکر نسل پرست جرمن فاشسٹ ڈکٹیٹر ہٹلر کو اپنا رول ماڈل مانتے رہے اور یہاں ہندستان میں بھی ویسے ہی نظام کو قائم کرنا ان کی اولیت رہی ہے۔ گرو گول والکر نے اپنی کتاب "Our Nationhood Defined" کے ۱۹۴۷ کے ایڈیشن میں واضح الفاظ میں کہا، ''ہندستان میں رہنے والے غیر ہندوؤں کو ہندو ثقافت اور ہندو مذہب کا احترام کرنا ہوگا، اسے عقیدت سے دیکھنا ہوگا۔ جو لوگ بیرونی ملکوں کی جانب دیکھتے ہیں، انہیں یہاں کا وفادار ہونا پڑے گا۔ انہیں ہندو قوم کا تسلط قبول کرنا ہوگا۔ انہیں خاص رعایت نہیں ملنی چاہئے، یہاں تک کہ انہیں ہندستان کی شہریت کا حق بھی نہیں ملنا چاہئے۔'' انہوں نے اپنے سنگھٹن آر۔ ایس۔ ایس۔ کے قیام (۱۹۲۵) کے ساتھ جس خطرناک ایجنڈا پر کام کرنا شروع کیا، وہ کھلے طور پر ہٹلر کے ذریعہ اپنائی گئی راہ ہی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ وہ وہی برتاؤ کرنا مناسب مانتے، جو ہٹلر نے جرمنی میں یہودیوں کے لئے جائز مانا تھا۔ اپنے خیالات کو واضح کرتے ہوئے گرو گول والکر "Our Nationhood Defined" میں کہتے ہیں: ''اپنی ثقافت اور نسل کو اچھوتا رکھنے کے نظریہ سے جرمنی میں جو یہودیوں کی نسل کشی کی گئی، اس سے دنیا کو بہت گہری چوٹ پہنچی۔ اپنی خاص نسل کے تئیں فخر کے احساس کی وہ انتہا ہے۔ مختلف نسلوں کا انضمام کتنا مشکل ہے، اسے جرمنی نے ثابت کیا ہے۔ ہندستان کے لئے یہ سبق بن سکتا ہے، اس کا فائدہ اسے اٹھانا چاہئے۔'' گول والکر وہیں پر نہیں رکتے ہیں۔ ۱۹۶۶ میں ان کی کتاب، جسے سنگھ پریوار اصولی گائیڈ مانتا ہے، Bunch of Toughts شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے ہندستان کی سالمیت کے لئے خصوصی طور پر تین خطروں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ ہیں: مسلمان، عیسائی اور کمیونسٹ۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جن سنگھ کے اہم لیڈر رہے بلراج مدھوک نے اپنی کتاب Indianization میں ان خطروں سے نمٹنے کے لئے ویسے ہی قدم اٹھانے کی صلاح دی ہے، جن پر چل کر ہٹلر نے جرمنی میں کامیاب تجربہ کئے تھے۔ بلراج مدھوک نے صاف لفظوں میں یہاں کی اقلیتوں کو ہندستانی ہندوؤں کے رنگ میں خود کو رنگ لینے کی دھمکی بھری صلاح دی، ورنہ انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ اسی ذہنیت کو آگے بڑھاتے ہوئے ''وشو ہندو

پریشد''، ''بجرنگ دل'' اور ''سنگھ پریوار'' نے انہیں صاف اشارہ بھی دے دیا ہے، ''پاکستان'' یا ''قبرستان''۔ اسی زہریلی ذہنیت کا ابھی ثبوت دیا ہے جنتا پارٹی کے صدر، جو آر۔ ایس۔ ایس۔ کے سرگرم ممبر رہے ہیں اور ابھی مشہور امریکی ہاورڈ یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں، سبرمنیم سوامی نے۔ انہوں نے ۱ جولائی ۲۰۱۱ کے D.N.A. میگزین میں اپنے ایک مضمون میں واضح طور پر کہا ہے کہ ہندستانی آئین میں مسلمانوں کو جو ووٹ دینے کا اختیار ہے، اسے ختم کر دیا جانا چاہئے۔ اس بیان پر ملک گیر تیکھا ردعمل ہوا اور اسی یونیورسٹی سے جڑے ۲۶۰ اسکالروں نے زبردست احتجاج کیا اور دو اسکالروں، امنگ کمار اور سنجے پٹنو نے یونیورسٹی کے ذمہ داروں پر زور ڈالا ہے کہ اس قابل اعتراض کردار والے سوامی کو ہاورڈ یونیورسٹی سے نکال دیا جانا چاہئے۔ (ہندستان ٹائمس، پٹنہ، جولائی ۲۹، ۲۰۱۱)

ہندستان میں سیکولر سوچ اور انسانی قدروں میں یقین رکھتے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ انہوں نے ہندستان کی تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اسے غیر جانبداری سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ ہندستان کو بنانے اور سنوارنے میں مسلمانوں کے تاریخی رول کو تسلیم کرتے ہوئے اسے وہ ہندستان کی تاریخ کا سنہرا باب مانتے ہیں۔ کئی معنی میں اس رول کو اس علاقہ کے لئے نعمت مانا ہے۔ نفرت سے بھری تنگ نظر سنگھی ذہنیت کو ایسے لوگوں نے کبھی پسند نہیں کیا، بلکہ انہوں نے پلورل ہندستان کے لئے انہیں نہایت خطرناک اور ضرررساں مانا ہے۔ ایسے لوگ نظریاتی سطح پر سنگھ پریوار کی مخالفت تو کرتے ہی ہیں، آئے دن سماجی اور سیاسی سطح پر ان کے نظریہ کے خلاف مورچہ بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ سیکولر اقدار اور انسانی نظریات میں اعتقاد رکھنے والے یہی وہ لوگ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کے لئے تنگ ہوتی زمین میں ان کا حوصلہ بنائے رکھا اور ہر آزمائش کی گھڑی میں ان کے ساتھ دیانتداری سے کھڑے رہے ہیں۔ ناموافق حالات کے باوجود مایوسیوں کے بھنور میں پھنسے مسلمانوں کی پشت پناہی میں سرگرم رہے یہی لوگ اس مشترکہ ثقافت کی علامت ہیں، جس ثقافت پر ہمیں ناز ہے۔ آزاد ہندستان کے ۶۴ برسوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے لوگ ہی سیکولر جمہوری ہندستان کی آبرو بچائے رکھنے کی ضمانت بھی ہیں۔ سنگھ پریوار ان پر بھی نشانہ سادھنے میں ہچکچاتا نہیں۔ آزادی کے بعد بہت نشیب وفراز جھیلتا ہندستان اب اس مقام پر آ پہنچا ہے، جہاں سے اس کے پیچھے لوٹنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا،

عالمی برادری میں اس کی اپنی پہچان قائم ہو چکی ہے اور یہ پہچان ہندستان نے اپنے وسیع نظریات کی بنیاد پر حاصل کی ہے۔ اگر تنگ نظر اور دقیانوسی خیالات کے حامل لوگوں کا زور بڑھتا ہے، تو وہ ہندستانی روایت (Ethos) کے خلاف ہوگا اور اسے پناہ دینا، حوصلہ افزائی کرنا ہندستان کی بربادی کو دعوت دینے جیسا ہوگا۔

''پاکستان'' کے بن جانے کے بعد ہندوؤں کو گمراہ کرنے والے نظریات کے حاملوں کو ہندستان میں اپنا اثر بڑھانے کا سنہرا موقع ملا۔ ملک کی تقسیم کا جلتا ہوا مسئلہ تو ان کے پاس تھا ہی، مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی غلط فہمی پیدا کرنے اور پھیلانے کی منظم مہم چلی۔ مسلمانوں کی چار شادیاں، ان کی بڑھتی ہوئی آبادی، پاکستان کے لئے جاسوسی، یکساں سول کوڈ، دفعہ ۳۷۰، اردو اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے جذباتی مسائل کو بنیاد بنا کر حالات کو الجھانے کی لگاتار کوشش ہوتی رہی۔ بٹوارے کے بعد کچھ دنوں تک یہاں کی سول سروسیس، پولس محکمہ اور Military Stablishment انگریزوں کے زمانے میں بنے درمیانہ ڈھرّے پر چلی، فرقہ واریت کے زہر سے وہ بچی رہی۔ ذمہ دار جگہوں پر تقرر کرنے والے افسروں اور نیچے کے اہلکاروں کی تقرریوں میں چوکسی برتی گئی تھی۔ تاکہ انتظامی ڈھانچہ تنگ نظر دقیانوسیت سے پاک رہے۔ انگریزوں نے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی ضرور اپنائی تھی، لیکن یہاں کے پلورل سماج کے حقائق اور کام میں معیار کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا، کیونکہ چست درست نظم و نسق ان کی حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے بہت ضروری ضمانت تھی۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ آزادی کے بعد سیاست کے اثر میں اس شعبہ میں بھی فرقہ پرست عناصر کی منظم دراندازی شروع ہوگئی۔ بڑی قیمت چکانے کے باوجود آزادی کے بعد بھی ''فرقہ واریت'' کے زہر نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آزادی کے کچھ دنوں کے بعد ہی تنگ نظر ذہنیت سے متاثر عناصر نے سرگرمی سے سر اٹھانا شروع کیا اور فسادات کا دور شروع ہوا۔ آزاد ہندستان میں پہلا بڑا فرقہ وارانہ فساد ۱۹۶۱ میں مدھیہ پردیش کے جبل پور میں ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۳ میں ۱۶، ۱۹۶۴ میں ۳۱، ۱۹۶۵ میں ۵۶، ۱۹۶۶ میں ۶۳، ۱۹۶۷ میں ۶۱ اور ۱۹۶۸ میں ۱۱۱ بڑے فسادات یہاں ہوئے جہاں بڑی تعداد میں جان اور مال کی بربادی ہوئی۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان فسادات میں اقلیتی مسلمانوں کو ہی بہت کچھ بھگتنا پڑا۔ ۱۹۶۹ میں گجرات کے

بڑے حصے میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ احمد آباد، بڑودہ اور سورت کے فسادات تو اپنی تباہی کے مدنظر انتہائی قابل مذمت، تکلیف دہ اور خطرناک رہے۔ ۱۹۶۹ گاندھی کی ولادت کا سوواں برس تھا اور حکومتِ ہند کی دعوت پر سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان صد سالہ تقریبات کے مہمان خصوصی کے طور پر ہندستان آئے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کے شہر میں ان کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر مذہب کے نام پر خونی کھیل کا کھیلا جانا اور مسلمانوں کا گجرات کے بڑے حصے میں جینا دشوار ہو جانا، گاندھی جی کے تئیں ہی نہیں ہندستان کے ساتھ شرمناک مذاق تھا۔ حالات کو معمول پر لانے کے لئے بادشاہ خان کو بھوک ہڑتال پر بیٹھنا پڑا تھا۔ گاندھی جی کی صد سالہ برسی کے مدنظر ملک گیر پروگراموں کے سلسلے میں وہ جہاں بھی گئے ہندستان کے حالات پر اپنی گہری تشویش ظاہر کرتے ہوئے لوگوں کو آگاہ کیا کہ ہندستان کی وہ سیکولر ڈیموکریسی خطرہ میں ہے، جس کی جڑوں کو گاندھی جی نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ انہوں نے سرکار اور باثر ہندستانیوں کو آگاہ کرتے ہوئے بہت چوکس رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ بدقسمتی دیکھئے دوسرے برس ہی ۱۹۷۰ میں مہاراشٹر کے بھیونڈی، جلگاؤں اور مہاد میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جہاں سرکار بالکل بے بس نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کی جانی اور مالی نقصان کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندستان کا ''مین چیسٹر'' کہے جانے والے بھیونڈی، جلگاؤں اور مہاد کے ہینڈ لوم اور ہتھ کرگھوں کے کاروبار کو برباد کر دیا گیا اور اس سے جڑے کاریگر، جو زیادہ تر مسلمان ہی تھے، کھانے پینے کو محتاج ہو گئے۔ جو مارے گئے سو مارے گئے، جو بچے اس میں زیادہ تر لوگ معمولی مزدوری کرنے پر مجبور کر دئے گئے۔ ان فسادات کے غیر جانبدارانہ تجزیہ سے جو تلخ حقیقت سامنے آتی ہے، وہ ہے، ''سنگھ پریوار'' کا ایک نپا تلا منصوبہ، جس کے تحت مسلمانوں کو ذہنی اور معاشی طور پر مجبور بنا کر رکھ دینا طے ہے، تاکہ یہ فرقہ اپنی بقا اور باعزت جینے کی کش مکش جھیلتے افراتفری کی زندگی میں ہی ہمیشہ مبتلا رہے۔ یہ ذہنیت نہ ہندستانیوں کے تئیں انصاف ہے اور نہ ہندستان کے تئیں خوش آئند ہی۔

اُن دنوں ہندستان میں فرقہ واریت کی وجہ سے جو حالت بنی تھی اس کی گونج پارلیامنٹ میں بھی پہنچی تھی۔ حالت کی نزاکت پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کانگریس کے سرکردہ لیڈر ڈاکٹر چندر جیت یادو نے ۵ دسمبر ۱۹۶۹ کو پارلیامنٹ میں کہا تھا:

''آج ملک کے اندر جو فرقہ وارانہ فضا ہے، وہ ایک گمبھیر تشویش کی بات بن گئی ہے۔ برسوں سے جس طرح سے فرقہ وارانہ فسادات ملک کے مختلف حصوں میں ہوئے ہیں، ان سے ہندستانی سرکار، ریاستی سرکاریں اور ملک کے سبھی باشعور لوگ آج متفکر ہیں۔...... میں نے احمد آباد کا فساد دیکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی فسادات کے موقعوں پر حالت دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے، لیکن جس طرح سے اتنے بڑے پیمانے پر، بچوں، عورتوں اور بے قصور لوگوں کا بے رحمی سے قتل ہوا ہے، اس کو دیکھ کر آنکھوں سے آنسو نہیں خون بہتا ہے۔ فسادات کے درمیان جو حالت بنتی ہے، اسے پورا سماج، پوری کی پوری آبادی مجبور محض ہو کر دیکھتی رہتی ہے۔ جو چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں، اُن سے ہندستان کے اقلیتی طبقے ڈر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی زندگی، ان کی جائداد یہاں ہندستان میں محفوظ نہیں، یہ ذہنیت بنتی ہے۔''

اپنے خطاب کے دوران انہوں نے سیکڑوں مسجدوں اور مزاروں کو توڑے جانے کا ذکر کرتے ہوئے ان واقعات کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑ رہا ہوگا، تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔ ان کی تقریر کے بیچ جن سنگھ کے بلراج مدھوک وغیرہ نے لگاتار رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر یادو نے صاف گوئی سے کہا تھا کہ فرقہ پرست عناصر کے ذریعہ بار بار مسلمانوں سے ملک کے تئیں وفاداری کا ثبوت مانگنا انتہائی قابل اعتراض ہے۔ اسے ملک سے غداری کا قدم مانا جانا چاہیے۔[۲]

بعد کے دنوں میں بھی یہ فسادات پریشانی کی وجہ بنتی رہی ہیں۔ ایک مطالعہ کے مطابق ۱۹۹۸ سے ۲۰۰۲ کے درمیان مختلف صوبوں میں ہوئے فسادات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مہاراشٹر ۱۱۹۲، اتر پردیش ۱۱۱۲، مدھیہ پردیش ۸۶۰، گجرات ۸۲۳، کرناٹک ۶۵۴، اڑیسہ ۳۵۷، بہار ۵۲۴، مغربی بنگال ۲۰۵، دلّی ۸۳، ہماچل پردیش ۱۱، ۱۹۸۰ کے عشرے میں مرادآباد (یوپی) میں ہوئے فسادات کے بعد فسادات کے کردار میں بڑا تغیر آیا ہے۔ پہلے ہندو مسلم فسادات ہوتے رہے ہے، لیکن اب مسلمان اور سرکاری پولس مشنری آمنے سامنے نظر آتے ہیں۔ پولس اور سرکاری مشنری میں فرقہ پرست عناصر کی دَر اندازی ہو رہی تھی، لیکن اب فسادات کے معاملے میں پولس ہی کٹہرے میں ہے، جس کی انتہا ۱۹۹۲ کے گجرات فسادات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ گجرات ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ذریعہ منعقد جانچ رپورٹوں کے مطابق پولس کے

آئی ۔جی ۔ اور ڈی ۔آئی ۔ جی ۔ فسادیوں کی قطار میں فرضی انکاؤنٹر کو انجام دیتے نظر آتے ہیں اور وزیر اعلیٰ تجربہ کار رنگ ماسٹر کی طرح فسادیوں کی کمان سنبھالے ہوئے ملتے ہیں۔

تقسیم ملک کے وقت جب اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بدقسمت پناہ گزینوں کے قافلے آ اور جا رہے تھے، تب پٹیالہ اسٹیٹ میں مسلمانوں کو بڑی دردناک حالت سے گذرنا پڑا تھا، کیونکہ وہاں کی ریاستی سرکار کی انتظامیہ نے فسادیوں کا کھل کر ساتھ دیا تھا۔ وہ ذہنیت ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد کی شہادت اور گودھرا حادثہ کے بعد گجرات میں وہاں کے وزیر اعلیٰ اور سرکاری مشنری کی دیکھ ریکھ میں ایک گھناؤنی سازش کے تحت جو مسلمانوں کا قتل عام ہوا، اس نے پٹیالہ کی بربریت کو بھی شرمسار کر دیا۔ فی زمانہ .N.D.A سرکار کے بھاجپائی وزیر اعظم اٹل بہاری باجپائی کو اپنی پارٹی کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو ''راجیہ دھرم'' نبھانے کی نصیحت دینی پڑی۔ اب جو حقائق سامنے آ رہے ہیں، اس سے واضح ہو رہا ہے کہ وزیر اعلیٰ نریندر مودی نے اپنے وفادار اعلیٰ عہدوں پر تعینات افسروں کی دیکھ ریکھ میں قتل عام کو انجام دلایا اور کہیں کہیں اسے فرضی انکاؤنٹر ثابت کرنے کی کوشش بھی ہوئی۔

۱۹۶۷ کے بعد کے ہندستان کی سیاست کافی الجھی ہوئی اور دلچسپ رہی ہے۔ سماجوادی مجاہد آزادی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی قیادت میں غیر کانگریس واد کی زوردار مہم چلی اور ۱۹۶۷ کے الیکشن کے نتیجے میں بہار سمیت ۹ صوبوں میں پہلی بار غیر کانگریسی پارٹیوں کی اتحادی سرکاریں برسر اقتدار آ گئیں۔ اس تاریخی اہمیت کے سیاسی واقعہ کا بہار میں بہت دلچسپ پہلو دیکھنے کو ملتا ہے۔ کمیونسٹ، سنگیت سوشلسٹ پارٹی اور جن سنگھ کے لیڈروں نے مل کر مہامایا پرساد کی قیادت میں پہلی غیر کانگریسی سرکار بنائی۔ اس گٹھ جوڑ کا تانا بانا اپنے آپ میں بڑا دلچسپ رہا۔ کہاں ورگ سنگھرش میں یقین رکھنے والے سیکولر مارکسوادی کمیونسٹ، Participatry Democracy اور سیکولرزم کی حمایتی سوشلسٹ پارٹی اور کہاں ورن ووستھا والے نظام اور تنگ نظر قومیت کی حامل آر۔ ایس۔ ایس۔ سے حمایت یافتہ کٹر فرقہ پرست پارٹی جن سنگھ؟ سیاست میں ایک دوسرے کو اچھوت سمجھنے والی پارٹیاں اپنی قدروں، نظریوں اور ذمہ داریوں کو نظر انداز کر اقتدار کی موقع پرست سیاست اور بے جوڑ اتحاد کو اولیت دیتی، اقتدار کی کرسیوں میں جا دھنسیں۔ ایک طرف پیدائشی سیکولرزم کی دعویدار پارٹی کانگریس ہے، تو دوسری طرف اس کو اقتدار کی کرسی

سے ہٹانے کی مہم میں سیکولر کمیونسٹ اور سوشلسٹ کٹر فرقہ پرست تنظیم جن سنگھ سے ہاتھ ملائے میدان میں ہیں۔ اقتدار کے اس دلچسپ کھیل میں سیکولر پارٹیوں میں اپنی بھلائی اور مستقبل ڈھونڈنے والے مسلمانوں کی حالت ٹھگے گئے بدحواس جماعت والی الجھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اب ہندستان کی سیاست ایسے مقام پر پہنچتی نظر آتی ہے، جہاں قدروں اور اصولوں کی جڑوں پر لگاتار حملے ہونے لگتے ہیں۔ کبھی وہی بنیادی محرک منبع مانے جاتے رہے، اب ان کی اولیت کو غیر ضروری مانا جانے لگتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور دلچسپ بات سامنے آتی ہے، فرقہ پرست آر۔ایس۔ایس۔ کو سوشلسٹ اور دوسری پارٹیوں کے نزدیک لانے کی شروعات سوشلسٹ مفکر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے کی، جب آر۔ایس۔ایس۔ کے سرگرم تعاون سے کانگریس کے خلاف الیکشن جیت کر وہ پہلی بار پارلیامنٹ میں پہنچے۔

ایک وہ وقت تھا، جب آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر لوہیا، جے پرکاش نارائن وغیرہ کانگریس کے سرگرم نوجوان لیڈر کی حیثیت سے جواہر لال نہرو کے قریبی ساتھیوں میں مانے جاتے تھے۔ آنند بھون سے ہی ان لوگوں کی سرگرم سیاست کے سفر کی شروعات ہوئی اور کانگریس پارٹی کے مختلف سیل کی ذمہ داری ان لوگوں نے بخوبی سنبھال رکھی تھی۔ کانگریس کے سوشلسٹ لیڈر جواہر لال نہرو ان کے آئیڈیل تھے، لیکن سردار پٹیل، راجاجی، ڈاکٹر راجندر پرساد وغیرہ کے نظریات سے انہیں شدید اختلاف رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۴ میں نوجوان کانگریسیوں کا کانگریس کے اندر ہی دھاردار سماجوادی گروپ قائم ہوا تھا۔ کچھ دنوں تک تو یہ ساتھ ساتھ چلے، لیکن سردار پٹیل کے رخ کو دیکھ کر کانگریس پارٹی سے وہ الگ ہو گئے۔ ۱۹۵۲ میں سوشلسٹوں نے الیکشن کے میدان میں بھی اپنی موجودگی درج کرائی، یعنی دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ بعد کے دنوں میں جے پرکاش جی بھودان سے جڑ گئے اور سرکردہ سوشلسٹ ڈاکٹر لوہیا سب سے زیادہ سرگرمی سے کانگریس کی مخالفت میں سامنے آئے اور اسے شکست دینے کی کوشش میں فرقہ پرست عناصر سے سمجھوتہ کرنے میں بھی انہیں پرہیز نہیں ہوا۔ کانگریس کی مخالفت کا جو سلسلہ چلا، وہ وسیع تر ہوتا گیا اور ۱۹۶۷ کے الیکشن میں اس نے رنگ لایا، جب ۹ صوبوں میں کانگریس کی سرکاریں تو ختم ہوئی ہی، ۱۹۷۷ میں دلّی کی مرکزی سرکار میں بدلاؤ کی زمین بھی تیار ہو گئی۔

۱۹۶۷ کے سیاسی بدلاؤ نے ہندستان کی سیاست میں ایک نئے عہد کی شروعات کی۔

اس کے بعد ستر (۷۰) کا عشرہ اہم سیاسی اتھل پتھل کا ایسا عشرہ ہے، جس نے اس برصغیر کے جغرافیہ اور تاریخ دونوں کو ہی متاثر کیا ہے۔ پاکستان میں الیکشن ہوئے، شیخ مجیب کی پارٹی عوامی لیگ کو اکثریت ملنے کے باوجود انہیں وزیر اعظم نہیں بننے دیا جانا، پاکستان کے حکمرانوں، فوجی کمانڈر ان چیف یحیٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسی، بنگلہ دیش مکتی آندولن اور پھر ۱۹۷۱ میں ہندستان۔ پاکستان جنگ، پاکستان کا ٹکڑے ہونا اور مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بننا، یہ اہم واقعات ہیں، جس نے اس برصغیر کو ہر نظریہ سے متاثر کیا اور آج بھی اس کا گہرا اثر تینوں ملکوں میں دیکھا جا رہا ہے۔ پاکستان کے حکمرانوں کے ساتھ بہت سے پاکستانیوں نے بنگلہ دیش تحریک کو پاکستان کو توڑنے کی ہندستان کی منظم سازش مانا۔ ۱۹۷۱ میں پاکستان کے ٹوٹنے کا جن سنگھ اور سنگھ پریوار کے ساتھ بے شمار لوگوں نے خیر مقدم کیا۔ جب ہندستان پاکستان جنگ میں پاکستان شکست خوردہ ہوکر اپنا ایک حصہ کھو بیٹھا تھا، تو سنگھ پریوار نے یہاں خوشیاں منائیں اور اس جیت کا سہرا وزیر اعظم اندرا گاندھی کے سر باندھتے ہوئے انہیں درگا، کالی اور چنڈی جیسے ناموں سے سرفراز کیا تھا۔ متحدہ ہندستان کا خواب دیکھنے والوں نے ہندستان کو دوسری بار بٹنے کا جشن منایا، کیونکہ وہ اس ''پاکستان'' کا ٹوٹنا تھا، جسے ان کے جیسے ہی ''ہندوؤں'' نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان کی مسلم مخالف ذہنیت کی بھی بڑی تسکین ہوئی اور ادھر پاکستان میں ہندستان کے خلاف ایک اور اہم نیا ایجنڈا مل گیا۔

ستر (۷۰) کے عشرے میں ہی طلبا کی بے اطمینانی ملک گیر تحریک کے روپ میں نظر آتی ہے۔ بہار کی ۱۹۷۴ کی تاریخی سمپورن کرانتی (مکمل انقلاب) اور گجرات کے نونرمان منڈل کے بینر کے تحت وہاں کے طلبا کا چمن بھائی کی کانگریسی سرکار کے خلاف تحریک اہم ہیں۔ گجرات میں چمن بھائی کی بدعنوان کانگریسی سرکار کو برخاست کرنے کی مہم اس وقت انتہائی بلندی پر پہنچ گئی، جب مرارجی دیسائی نے پارلیامنٹ میں ہی تا مرگ بھوک ہڑتال شروع کر دیا۔ حالات سے مجبور ہوکر اندرا گاندھی کو گجرات کی سرکار کو برخاست کرنے کا ناپسندیدہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔ وہاں جو کچھ رونما ہو رہا تھا، اس کا ملک گیر اثر پڑ رہا تھا۔ ایسے غیر کانگریسی نوجوان، جو ملک کے بگڑتے سیاسی حالات سے متفکر تھے اور مناسب متبادل کی تلاش میں تھے، ان کے لئے گجرات کے واقعات محرک ثابت ہو رہے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے طلبا نے اپنے کچھ مسائل کو لے کر

یونیورسٹی انتظامیہ کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی۔ اس تحریک کو اور اثر دار بنانے کے لئے ان کے اور بہار کی دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا کے درمیان آپسی تبادلہ خیال کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اسی دوران ۱۷۔۱۸ فروری ۱۹۷۴ کو پٹنہ میں بہار کی تمام یونیورسٹی کی نمائندگی کرتے طلبا کی ریاست گیر کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ان دنوں فرانس اور کئی یوروپی ملکوں میں بھی اپنی حکومتوں کے خلاف طلبا کی تحریک چل رہی تھی اور یہاں کے طلبا دلچسپی سے وہاں کے حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان تحریکوں کے علاوہ گجرات کی حالت پر بھی پٹنہ میں جمع ہوئے طلبا نے تبادلہ خیال کیا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی اپنی تحریک Youth For Democracy کے دوران جے پرکاش نارائن نے ۲۲ جنوری اور ا فروری ۱۹۷۴ کو پٹنہ یونیورسٹی کے طلبا کو خطاب کیا تھا اور نوجوانوں کو ہندستان کی جمہوریت کو مضبوط بنانے میں ان کی تعمیری پہل کی صلاح دی۔ بنگلہ دیش کی لڑائی کی جیت کے پس منظر میں ہوئے عام الیکشن میں غیر متوقع جیت نے مرکز کی لیڈر شپ کو بے لگام ہو جانے کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ یوتھ کانگریس کے نوجوانوں کے بے لگام طریقہ کار سے لوگوں کے اندر بےچینی پائی جا رہی تھی، خاص کر مخالف پارٹیاں موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے سڑکوں پر اترنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھیں۔ ہندستان کے بڑے حصے میں مخالفت کی لہر چل رہی تھی اور بہار سمیت کئی دوسرے صوبوں میں جہاں نوجوان تحریک چلا رہے تھے، مخالف پارٹیوں کی انہیں حمایت مل رہی تھی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۴ کو سہرسہ کے راگھو پور میں حالات کا جائزہ لیتے ہوئے سرکردہ لیڈر جے پرکاش نارائن نے کہا تھا: ''لگتا ہے، آج ہم ایک دوسرے ۱۹۴۲ کے نزدیک کھڑے ہیں۔ ایک دوسرا انقلاب ہونے جا رہا ہے۔'' ۱۱ فروری کو گجرات کے طلبا کی دعوت پر جے پی احمد آباد بھی گئے تھے اور وہاں کے طلبا کی تحریک کا جائزہ لیا تھا۔ انہیں بہار اور دوسری جگہوں میں طلبا کی ناراضگی اور ان کی تحریک کے نتیجے میں بڑی سماجی تبدیلی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

بہار کی یونیورسٹیوں کی سرگرمیوں کی فضا کے پس منظر میں ۱۷ اور ۱۸ فروری ۱۹۷۴ کو طلبا کی پٹنہ میں کانفرنس ہو چکی تھی۔ اسی کانفرنس میں ۱۸ فروری کو طلبا نے اپنے لائحہ عمل کا خاکہ تیار کیا تھا اور ۸ مطالبات کو اپنی تحریک کا مدعا بنایا۔ ان مدعوں میں مہنگائی، ہر سطح پر بڑھتی ہوئی بدعنوانی، یونیورسٹی کے تعلیمی کلینڈر کی باضابطگی اور یونیورسٹیوں میں طلبا یونین کا الیکشن اور یونین

کی تشکیل اہم تھی۔ اس تحریک کا دلچسپ اور اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، آر۔ایس۔ایس۔، ودیارتھی پریشد، سرودوئی ترون شانتی سینا جیسی مختلف نظریات والی طلبا کی تنظیمیں اپنے مسائل کے حل کے لئے ایک ''چھاتر سنگھرش سمیتی'' کے پلیٹ فارم پر جمع ہوئی تھی اور کانگریس کی سیکولر سرکار ان کے نشانے پر تھی۔ اپنے طے شدہ پروگرام کے تحت طلبا نے ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ کو اسمبلی کا گھیراؤ کیا اور اسمبلی میں گورنر کے خطاب میں رکاوٹ ڈالی۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے طلبا نے اسمبلی کے ڈپٹی سکریٹری کے گھر پر توڑ پھوڑ کی۔ اس میں آگ لگائی، پھر راستے میں پڑ رہے سرچ لائٹ۔ پردیپ اخباروں کے پریس اور دفتر کو بھی آگ کی نذر کر دیا۔ طلبا لیڈروں کا کہنا تھا کہ انہوں نے اس شرمناک حرکت کو انجام نہیں دیا، ان کے ساتھ کچھ غیر سماجی عناصر لوٹ پاٹ کی غرض سے آ لگے ہوں گے اور اس تکلیف دہ واقعہ کو انجام دیا ہوگا۔ سچائی جو بھی رہی ہو، لیکن اس دن یہ ناپسندیدہ واقعہ رونما ہوا، جس نے حساس لوگوں کو پریشان کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سرکار حرکت میں آئی اور بڑے پیمانے پر سرگرم طلبا کی گرفتاری شروع ہوئی۔ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے پٹنہ میں کرفیو لگایا گیا، ملٹری کی فلیگ مارچ ہونے لگی۔ شہر میں خوف کا ماحول بن گیا۔ تعلیمی ادارے بند کر دئے گئے۔ ڈر سے لوگوں نے گھروں سے نہیں نکلنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ پٹنہ کی پُرسکون زندگی لایقینی ہوگئی تھی۔ حالات کے مدنظر ۱۸ مارچ کی شام میں چھاتر سنگھرش سمیتی کے تین چار ممبر جے پرکاش جی سے ملنے قدم کنواں میں ان کی رہائش مہیلا چرخہ سمیتی پہنچے اور ان کے سامنے اپنے مسائل کی تفصیل رکھی، ساتھ ہی ان سے قیادت کی التجا کی تھی۔ وہ طلبا ۱۹ مارچ کو بھی جے پرکاش جی سے ملے تھے۔ جے پی نے ان طلبا لیڈروں سے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ وہ سیاسی جماعتوں سے منسلک تنظیموں کے طلبا سے ہمدردی رکھنے کے باوجود ان کو اپنا تعاون دینے کو تیار نہیں ہیں۔ نشستوں کے کئی دور چلے اور جب طلبا نے خود کو سیاسی جماعتوں سے ''الگ'' کر لینے کا وعدہ کیا، تب پر امن تحریک کی قیادت کا انہوں نے فیصلہ کیا۔ آر۔ایس۔ایس۔ اور ودیارتھی پریشد جیسی فرقہ پرست تنظیموں کی موجودگی پر جے پی سے لوگ اسی وقت سوال کرنے لگے تھے۔ طلبا کی قیادت قبول کر لینے سے پہلے جے پی نے اپنے سرودئی، سماجوادی دوستوں کی دو تین نشستیں مہیلا چرخہ سمیتی میں بلائی تھی۔ ان میں میں بھی شریک ہوا تھا۔ میں نے تحریک کے بارے میں دس سوال ان کے سامنے رکھے تھے، جن میں

آر۔ایس۔ایس۔ کی موجودگی میں مسلمانوں سے تعاون کی کیسی امید کی جاسکتی ہے؟ یہ بھی ایک سوال تھا۔ انہوں نے ہر سوال کا جواب دیا تھا۔ ان سوالوں اور جے پی کے جوابوں پر مبنی ایک کتابچہ بن گیا (جے پرکاش نارائن سے دس سوال)، جسے ج۔ پی تحریک کا ایک اہم دستاویز مانا گیا اوراس کی ہزاروں کاپیاں اردو اور ہندی میں شائع ہوئیں۔ اس وقت جے پی نے لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ سیکولر عناصر کے ساتھ کام کرنے سے آر۔ایس۔ایس۔ اور ودیارتھی پریشد کے اندر موجود فرقہ واریت کا زہر کم ہوگا اور وہ سماج کے اصل دھارے میں آئیں گے۔ لیکن بعد کے دنوں میں ثابت ہوا کہ اپنی کوششوں میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔۱۹۷۴ کے بعد جو سیاسی تال میل ملک میں ہوا، اس سے فرقہ وارانہ فضا زیادہ الجھ گئی اور فرقہ پرست عناصر کو دوسری پارٹیوں اور تنظیموں سے گٹھ جوڑ اور سودابازی کرنے کا سنہرا موقع حاصل ہوگیا۔

طلبا کی بے چینی تحریک کی شکل میں پٹنہ یونیورسٹی سے شروع ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ دوسری یونیورسٹیوں میں پہنچی اور پھر سڑکوں اور محلوں سے ہوتے ہوئے پورے بہار میں پھیل گئی تھی۔ نتیجتاً سرکار سرگرم ہوئی اور پورے صوبہ میں تحریک کو سختی سے کچل ڈالنے کی مہم تیز کر دی۔ بڑے پیمانے پر طالب علموں کی دھر پکڑ ہونے لگی۔ جب تحریک وسیع ہوکر سیاسی اعتبار سے زیادہ اثر دار ہوگئی، تب کمیونسٹ پارٹی سے منسلک طلبا کی تنظیموں نے اپنی پارٹی کی طے کی ہوئی پالیسی کے مدنظر خود کو تحریک سے الگ کرلیا۔ جے پرکاش نارائن کے ذریعہ قیادت قبول کر لئے جانے کے بعد طلبا کی تحریک کا کینوس بہت بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے عوامی تحریک کی شکل لے لی تھی اور سماجی اصلاح اور عام لوگوں کے مسائل کے حل کے مطالبات بھی طلبا کے مطالبات سے جوڑے گئے تھے۔ یہی نہیں جے پی کی اپیل پر ان کے بہت سے پرانے سوشلسٹ اور سرووِدئی ساتھی بھی سماجی انقلاب کی اس مہم میں تعاون کرنے کے لئے سرگرمی سے آگے آگئے تھے۔ ۵ جون ۱۹۷۴ کو گاندھی میدان میں ''مکمل انقلاب'' کی اپیل ہو چکی تھی اور مسلسل انقلاب کے توسط سے ہر نہج سے سماج میں تعمیری تبدیلی اس کی منزل طے ہو چکی تھی۔ تحریک کے دوران کلچرل انقلاب (Cultural Revolution) کی سگبگاہٹ بھی دیکھنے میں آئی جب نوجوان ذات پات، شادی بیاہ اور جہیز کی رسم کے ساتھ رشوت خوری کے خلاف آواز بلند کرنے لگے تھے۔ کمیونسٹ طلبا کے تحریک سے الگ ہو جانے کے بعد تحریک کے کردار میں واضح تبدیلی آگئی تھی، منظم ودیارتھی

پریشد، آر۔ایس۔ایس۔اور جن سنگھ کو اس خالی جگہ کو بھرنے کے ساتھ اپنے کو بڑھانے کے لئے تیار زمین اور تسلیم شدہ بڑا میدان مل گیا۔تحریک میں سماجوادی یووجن سبھا، سرودے اور کھادی سے جڑے لوگ اور ترون شانتی سینا کے کچھ طلبا تھے، لیکن آر۔ایس۔ایس۔اور ودیارتھی پریشد کے مقابلے میں وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔غیر کانگریسی مخالف پارٹیوں سے ان کی ''چھوت'' کے ختم ہونے کا ماحول پہلے ہی بن چکا تھا، اس لئے اس نئی صورت حال کا انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ ایسی حالت بنی کہ اقتدار حصولی کا ان کا وہ خواب آگے چل کر پورا ہوا، جو نارمل سیاسی ماحول میں کبھی ممکن ہی نہیں تھا۔

۲۵ جون ۱۹۷۵ کو تحریک میں شریک اپوزیشن پارٹیوں کی دلّی کے رام لیلا میدان میں غیر متوقع بڑی عام سبھا ہوئی تھی۔لاکھوں لوگ وہاں جمع ہوئے تھے۔اسی سبھا میں جے پرکاش جی نے فوج اور پولس افسروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندستان کا آئین سب سے اہم ہے اور اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی حکم کو انہیں نہیں ماننا چاہئے، وہ حکم وزیر اعظم کا ہی کیوں نہ ہو۔حکمراں طبقہ نے جے۔پی اور ان کے معاون لیڈروں پر فوجیوں اور پولس اہلکاروں کو بغاوت پر اکسانے کا الزام لگایا تھا۔۲۶ جون کو وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر ستیہ گرہ کا سلسلہ اس وقت تک چلنا تھا، جب تک کہ وزیر اعظم استعفی نہیں دے دیتیں، رام لیلا میدان میں اس تیاری کے منصوبے کا جائزہ لیا گیا تھا۔اسی رات پورے ملک میں ایمرجنسی کا اعلان کر دلّی میں موجود جے پی سمیت بیشتر لیڈر رات کے اندھیرے میں گرفتار کر لئے گئے۔پورے ملک میں پولس اور ملٹری کو چوکس کر دیا گیا تھا اور کچھ قانونی ضوابط کی خانہ پوری بھی کی گئی۔لیکن حیرت کی بات تو یہ دیکھنے میں آئی کہ آر۔ایس۔ایس۔اور جن سنگھ کی گڑھ مانی جانے والی دلّی میں ۲۶ جون کے دن احتجاج کے طور پر کچھ بھی نظر نہیں آیا۔۲۶ جون کے ''انڈین ایکسپریس'' اخبار کا اداریاتی کالم خالی تھا، کالا بارڈر چھاپ کر اخبار نے اپنا احتجاج درج کیا تھا۔دلّی میں کسی ایک آدمی نے بھی ایمرجنسی اور آئین کو معطل کئے جانے کے اعلان پر احتجاج کرتے سڑک پر نکلنے کی ہمت نہیں کی۔ایسا لگا دلّی پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔پٹنہ سمیت دوسرے شہروں میں احتجاج میں چھوٹی موٹی میٹنگ ہوئی، جلوس نکالنے کی کوشش ہوئی، لوگ گرفتار ہوئے، لیکن دلّی خاموش رہی۔ہندستانیوں کے سارے بنیادی حقوق ایمرجنسی نے سوخت کر لیا اور پورے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں احتجاجیوں کو

گرفتار کر جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ ہندستان کا یہی وہ دور ہے، جب حزب اقتدار خیمے میں "Indira is India, India is Indira" کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایمرجنسی اس شخص کے ذریعہ ملک میں لگائی گئی جس کی شعوری اور سیاسی تربیت کے طفیل میں دنیا کو "Discovery of India" اور " Glimpses of World History" جیسی مشہور کتابیں ملی اور بین الاقوامی حالات پر جن کی گہری نظر تھی۔[۳]

وزیر اعظم اندرا گاندھی کے الیکشن کے نتیجے کو چیلنج کرتے مقدمہ کا فیصلہ الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس جگموہن لال سنہا نے ۱۲ جون ۱۹۷۵ کو دیا تھا۔ اس فیصلہ کے بعد ہندستان میں جو سیاسی اتھل پتھل کی صورت حال بنی، وہ ۲۵ جون ۱۹۷۵ کی ایمرجنسی کے لگائے جانے پر آ کر ٹھہری۔ اس انتخابی مقدمہ میں راج نارائن کی جیت نے اقتدار کے خیمہ میں بھونچال لا دیا تھا۔ ایمرجنسی کے بعد دلّی کے صاحب اقتدار لوگوں نے آئین کی دھجیاں اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہی وقت ہے، جب دلّی کے ارد گرد علاقوں سے ٹرکوں میں بھر کر بھاڑے کے لوگوں کو دلّی لا کر جن پتھ اور راج پتھ پر دھرنے اور ہلڑ بازی کی غلط روایت شروع ہوئی۔

جے پی سمیت پرانے کانگریسی، سرووَدئی اور سماجوادی لیڈروں نے اپنے جیل کے سفر کو خوشی سے آزاد ہندستان میں اپنے مجاہد آزادی ہونے کے لائسنس کی تجدید مانا تھا۔ لیکن جن سنگھ، آر۔ ایس۔ ایس۔ اور ودیارتھی پریشد کے لیڈروں کے لئے بالکل نئی آزمائشی صورت حال تھی۔ آزادی کی لڑائی میں ان کا کوئی رول نہیں رہا تھا، نہ وہ کبھی جیل گئے، نہ جیل کی صعوبتیں جھیلی تھیں۔ گاندھی جی کے قتل کے الزام میں ان کے کچھ لیڈر ضرور گرفتار ہوئے تھے، لیکن ابھی حالت دوسری تھی۔ شاکھائیں لگانے، کچھ دیر لاٹھی بھانجتے پریڈ کرنا، اقلیتوں، خاص کر مسلمانوں کے خلاف ذہنیت بنانے کے رٹے رٹائے سبق دُہرانے کی ہی ان کی عادت رہی، لیکن ابھی ایک نئی صورت حال ان کے سامنے تھی۔ ایمرجنسی کی صعوبتوں کو جھیلنا اور جیلوں کا سفر ان کے لئے بڑے دشوار مرحلے تھے۔ کچھ دنوں تک ٹھیک ٹھاک چلا۔ گرفتار کئے گئے لوگوں نے سمجھا تھا کہ جلد ہی ان کی رہائی ہو جائے گی، جیسے عام دھرنا، مظاہرہ کے بعد ہوا کرتا ہے۔ لیکن جب ایمرجنسی کا اصلی چہرہ سامنے آنے لگا، تب لوگوں نے مانا کہ اب ان کا جیل کا سفر طویل ہے۔ جن سنگھ، ودیارتھی پریشد اور آر۔ ایس۔ ایس۔ کے خیموں میں سب سے زیادہ بے چینی تھی۔ بہار کے جیلوں

میں بند لوگ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ راتوں میں پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔ یہی نہیں جے پی کو بھی بُرا بھلا کہتے سنے گئے۔ ان کا ماننا تھا کہ جے پی کی وجہ سے تحریک میں شدت آگئی، جو سچائی تھی ہی، اور اندرا گاندھی سب کو جیلوں میں سڑا ہی دے گی۔ ان کی زندگی ہی خراب ہوگئی۔ لہٰذا یہ لوگ معافی مانگ مانگ کر جیلوں سے نکلنے لگے۔ تحریک کے بڑے لیڈروں میں آر۔ ایس۔ ایس۔ کے سَر سنچالک بالا صاحب دیورس پہلے شخص تھے، جنہوں نے اندرا جی کو خط لکھ کر معافی مانگی اور ان کے ۲۰ نکاتی پروگراموں کو پورا کرانے کا وعدہ کر کے جیل سے باہر آگئے تھے۔

ایمرجنسی کے اٹھارہ مہینے جمہوری ہندستان کی تاریخ کا ایک افسوسناک باب ہے۔ اس مدت میں ہندستانی آئین کی کھل کر دھجیاں اڑائی گئیں اور اقتدار کے غلط استعمال کی کہانیاں بڑی تکلیف دہ ہیں۔ یہاں اس کے دُہرانے کی گنجائش نہیں۔ مجاہدین آزادی کی صف میں بچے لوگوں نے بھی بے لگام اقتدار کے اٹھائے قدم کو ٹھیک نہیں مانا اور اس کو چیلنج کیا تھا اور ۱۹۷۷ میں جب پارلیامنٹ کے الیکشن ہوئے، تو اس کے نتیجے نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ہندستان کے ہندی بولنے والے علاقے، جو کانگریس کے گڑھ مانے جاتے رہے تھے، کانگریس کے لئے واٹرلو ثابت ہوگئے۔ آزادی کے بعد سے دلّی کی مرکزی سرکار پر کانگریس کا جو مکمل قبضہ چلا آرہا تھا، وہ ۱۹۷۷ کے الیکشن کے نتیجے میں ختم ہوگیا۔ اس وقت جو تبدیلیاں آئیں، وہ ہندستان کی تاریخ کو متاثر کرتی اہم میل کا پتھر ثابت ہوئیں۔ یہاں دھیان رکھنے کی بات ہے کہ ۱۹۶۹ میں کانگریس پارٹی، ذاتی خودغرضیوں اور تاریخی گردش کا شکار ہوئی اور اس میں بٹوارے کا سلسلہ چلا، جس کے سبب اس کی کل ہند پہچان مدھم ہوتی گئی، اس کے وفادار ممبروں کی تعداد گھٹتی گئی۔ کانگریس (او)، کانگریس (جگجیون)، کانگریس (ای) میں منقسم ہوکر اس نیشنل کانگریس نے اپنا وہ بنیادی وجود ہی کھو دیا، جس کا قیام ۱۸۸۵ میں ہوا تھا۔ منقسم کانگریس کا جو ٹکڑا بڑا تھا، وہی کانگریس (ای) کی شکل میں اصلی کانگریس کی وراثت کی دعویدار بنی اور ابھی وہی کانگریس کی شکل میں اپنی پہچان بنائے ہوئے ہے۔ ۱۹۷۵ کے بعد سیاسی حالات ایسے بنے کہ کانگریس (ای) کو ۱۹۷۷ کے الیکشن کے بعد پارلیامنٹ میں حزب اختلاف میں بیٹھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ۱۹۶۷ میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی قیادت میں چلی غیر کانگریس واد کی لہر کے نتیجے میں ۹ صوبوں میں مختلف پارٹیوں کی

اتحادی سرکاریں بنی تھیں، جن میں جن سنگھ بھی شامل تھی۔ وہ جن سنگھ، جو اپنے پریوار کے ساتھ بہار سمیت کئی دوسری جگہوں پر اقتدار میں حصہ دار بنی تھی، اب جے پرکاش نارائن کی قیادت میں لڑے ۱۹۷۷ کے الیکشن کے نتیجے میں مرکز کی سرکار میں بھی مضبوطی کے ساتھ اقتدار میں حصہ دار بن کر ابھری۔ خالص ''سیکولرزم'' کی بات کرنے والے لوگ ''سیکولرزم'' سے آنکھیں چراتے نظر آنے لگے اور وہ طبقہ جس کا مستقبل ''سیکولرزم'' سے جڑا ہوا ہے، ٹھگا سا محسوس کرنے لگا تھا۔

جے پرکاش نارائن کی پہل پر تحریک میں شامل حزب مخالف کی سب غیر کانگریسی پارٹیوں نے مل کر سوشلسٹ چندر شیکھر جی کی صدارت میں جنتا پارٹی بنائی تھی اور اسی بینر کے تحت ۱۹۷۷ کا الیکشن لڑا گیا تھا۔ الیکشن کے میدان میں، اُدھر کانگریس اور اس کی معاون سی۔ پی۔ آئی۔ تھی اور اِدھر میدان میں پورا حزب مخالف۔ الیکشن کا نتیجہ چونکا دینے والا سامنے آیا۔ مرکز میں کانگریس کو پہلی بار زبردست جھٹکا لگا تھا۔ الیکشن کا نتیجہ اتنا مایوس کن ہوگا، اس کا اندازہ اندرا جی اور ان کے معاونوں کو تو کبھی نہیں تھا، جنتا پارٹی کے لوگوں نے بھی ایسی جیت کی امید نہیں کی تھی۔ گٹھ جوڑ اور اقتدار میں حصہ داری کی پہل کے نتیجے میں مرار جی دیسائی کی قیادت میں بنی جنتا پارٹی کی سرکار میں جن سنگھ (جو اب جنتا پارٹی میں ضم ہوگئی تھی) پریوار سے آئے اٹل بہاری باجپائی کو وزارتِ خارجہ اور لال کرشن اڈوانی کو محکمہ مواصلات جیسے اہم شعبے ملے تھے۔ یہ سرکار ڈھائی برسوں تک ہی چلی، لیکن سنگھ پریوار نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اپنے ماتحت محکموں میں اپنے لوگوں کو محکمہ کی اہم جگہوں پر جمایا، خاص کر میڈیا کے میدان میں سنگھ پریوار نے اچھی خاصی پیٹھ بنا کر وہاں اپنی زمین مضبوط کر لی، جس کا فائدہ آج تک انہیں مل رہا ہے۔

سیکولر سوشلسٹ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے سنگھ پریوار سے ''چھوت'' ہٹانے کی شروعاتی پہل کی تھی اور ان کے سرگرم تعاون سے پارلیامنٹ میں پہنچے تھے۔ ۱۹۶۷ میں غیر کانگریس واد کی ان کی مہم بہت کامیاب ثابت ہوئی اور بہار سمیت نو صوبوں میں غیر کانگریسی اتحادی سرکاریں بنیں، جن میں جن سنگھ اور سنگھ پریوار کو آسانی سے باوقار جگہ مل گئی۔ ۱۹۷۴ میں سیکولر، سوشلسٹ، سرووَدی جے پرکاش نارائن نے سنگھ پریوار کو، ملک کے اہم دھارے میں لانے اور غیر فرقہ پرست بنانے کی کوشش کی لیکن انہیں اس میں کامیابی تو نہیں مل سکی، الٹے غیر سنگھی پارٹیوں سے نزدیکی اور باوقار سیاسی اسپیس (Space) کے ساتھ اقتدار میں اہم محکمے سنگھ پریوار

کو حاصل ہو گئے۔ تحریک کے دوران گٹھ جوڑ اور سب پارٹیوں کی ایک پارٹی میں ضم ہونے کے عمل میں سنگھ پریوار کا دوہرا چہرہ ہمیشہ بحث کا موضوع رہا تھا۔ سوائے سنگھ پریوار کے جنتا پارٹی کی دوسری اتحادی جماعتوں نے گٹھ جوڑ کے اصول پر دیانتداری سے عمل کیا تھا۔ سوشلسٹوں نے نہ صرف اپنی پارٹی کے وجود کو ختم کر دیا تھا، بلکہ اپنے یوتھ سنگھٹن سماجوادی یووجن سبھا کو بھی پوری طرح بند کر دیا۔ لیکن سنگھ پریوار نے ہر سطح پر صرف ڈھونگ رچا۔ جیل میں ودیارتھی پریشد اور آر۔ ایس۔ ایس۔ سے منسلک لڑکوں نے خفیہ طور سے اپنی ممبر سازی کی مہم چلا رکھی تھی۔ جیلوں میں دوسرے لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ اس کی اطلاع جے پی کو بھی دی گئی تھی اور پارٹی ہائی کمان کے اعلیٰ سطح پر اس سوال کو اٹھایا گیا تھا۔ سوشلسٹوں نے جنتا پارٹی میں سنگھ پریوار کے دُہرے کردار کے مدنظر دُہری ممبری کے سوال پر سخت اعتراض کیا تھا اور اختلاف اتنا شدید ہوتا گیا کہ آخرکار جنتا پارٹی ہی ٹوٹ گئی، جس کے نتیجے میں دلّی سے جنتا پارٹی کی سرکار ہی ختم ہو گئی۔ سنگھ پریوار کے دُہرے کردار پر تحریک کے ابتدائی دنوں میں ہی بہار میں سوال اٹھنے لگے تھے۔ آر۔ ایس۔ ایس۔ اور ودیارتھی پریشد نے خود کو پارٹی سے الگ ہو جانے کی جے پرکاش جی کو یقین دہانی کرائی تھی، لیکن وہ اس پر قائم نہیں رہے۔ سنگھ پریوار کا دُہرا کردار جب کھل کر سامنے آیا، تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنی زمین بہت مضبوط بنا لی تھی۔ ۲۸ اگست ۱۹۷۶ کے ''بہار واسیوں کے نام چٹھی'' میں جے پرکاش جی آر۔ ایس۔ ایس۔ کے مسئلہ پر کہتے ہیں:

''جہاں تک آر۔ ایس۔ ایس۔ کی بات ہے، یہ ٹھیک ہے کہ برسوں قبل میں اس تنظیم کا مخالف تھا اور سخت لہجوں میں اعتراض کیا کرتا تھا۔ مگر دنیا میں کوئی چیز غیر تغیر شدہ نہیں ہے۔ تنظیم کے روپ اور اصول بدلتے ہیں اور میں مانتا ہوں کہ تجربوں سے گذر کر آر۔ ایس۔ ایس۔ بھی بدل رہا ہے۔ یہ سنگھٹن پہلے جو بھی رہا ہو، آج بالکل وہی نہیں ہے، جو پہلے تھا۔ آج ان کے سیوم سیوک اپنی پرارتھنا میں جن قابل ذکر ہستیوں کے نام لیتے ہیں، ان میں مہاتما گاندھی بھی ایک ہیں۔ آر۔ ایس۔ ایس۔ اور جن سنگھ پر فرقہ پرست ہونے کا الزام اکثر لگایا جاتا ہے۔ اس لئے اپنی سمپورن کرانتی کی تحریک میں انہیں شامل کر میں نے ان کو ڈی کمیونلائز کرنے، یعنی ان کو غیر فرقہ پرست بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے نوجوانوں نے اس تحریک میں مسلم

طلبا اور نوجوانوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کام کیا ہے اور ایک ساتھ کام کرنے کے دوران ایک دوسرے کی غلط فہمی دور ہوئی ہے اور آپسی اعتماد بڑھا ہے۔ ہر مذہب کا احترام (جسے انگریزی میں سیکولرزم کہتے ہیں) کے اصول کو اس تحریک کی جانب سے یہ ایک بڑا تحفہ ملا ہے، اس کو بھی غیر جانبدار شخص تسلیم کرے گا۔ اس طرح جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس۔ کو سمپورن کرانتی کی سیکولر تحریک میں شریک کر میں نے سیکولرزم کی بنیاد کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ فرقہ پرستی کو مٹانے کی جو کوششیں اب تک ہوئی ہیں، ان سے الگ میری یہ کوشش ہے اور میں مانتا ہوں کہ میری یہ کوشش زیادہ تعمیری ہے۔''[۴]

یہ افسوسناک سچائی ہے کہ جس طرح بیشتر کانگریسیوں نے گاندھی کی صداقت، عدم تشدد اور انسانیت کے ہمہ گیر نظریہ کو نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی، اسی طرح جے پی تحریک کے بیشتر لوگوں نے جے پی کی سمپورن کرانتی کے مقاصد کو نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش ہی کی۔ ایک منصوبہ کے تحت انہیں اپنانے کا وہ ڈھونگ رچتے رہے اور جب اقتدار حاصل ہو گیا، سب کے سب سمپورن کرانتی کے بنیادی مقاصد کو بھول گئے۔ آر۔ ایس۔ ایس۔ اور جن سنگھ پریوار ایک منصوبے کے تحت سمپورن کرانتی سے جڑے رہے اور اپنے مقاصد کی تکمیل ان کا بنیادی خفیہ ایجنڈا ہمیشہ بنا رہا۔ خود جے پی نے جب آر۔ ایس۔ ایس۔ میں مسلمانوں کو بھی شامل کئے جانے کی بات کی، تو سنگھ پریوار کے منصوبہ سازوں نے صاف انکار کر دیا تھا اور جے پی کو کہنا پڑا کہ ''ان کی نیت صاف نہیں ہے، جنتا پھر ٹھگی گئی۔''

۱۹۷۸ میں دوہری ممبری کے سوال پر جنتا پارٹی ٹوٹی تھی۔ اسی واقعہ کے پس منظر میں آر۔ ایس۔ ایس۔ اور سنگھ پریوار کے منصوبوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مشہور سوشلسٹ مفکر مدھو لیمیے نے مئی ۱۹۷۹ کے ''دِنمان'' میں ایک تفصیلی مضمون شائع کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ سوشلسٹوں اور سنگھ پریوار کی قومیت کے نظریات بالکل الگ الگ رہے۔ سوشلسٹ ہندستان کے ہر فرد کو ہندستانی شہری مانتے رہے جب کہ سنگھ پریوار ''ہندتو'' اور ''ہندو قوم'' تک قومیت محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سنگھ پریوار کو جمہوریت میں یقین نہیں، وہ ہٹلر کے طریقہ کو ٹھیک مانتے۔ گرو گول والکر ''ہندو قوم'' اور غیر ہندوؤں کے لئے ''ہندو کرن'' کے حمایتی رہے اور کروڑوں غیر ہندوؤں کو شہری حقوق سے بھی محروم کر دینا چاہتے رہے۔ انہوں نے ہٹلر کی صحیح النسل (Purity of

(Race) کی مہم کو جائز مانا ہے۔ سنگھ پریوار ذات پات اور ذات پات والے نظام کو ٹھیک مانتا ہے، جسے سوشلسٹ کبھی بھی مناسب نہیں مانتے۔ سنگھ پریوار نے ہندستان کے لئے جمہوریت اور اس کے فیڈرل ڈھانچہ (Federal Structure) کو کبھی مناسب نہیں مانا، اس کا ہمیشہ مذاق اڑایا ہے۔ گرو گول والکر نے اپنے Bunch of Thoughts میں ہندستان کے آئین کو پسند نہیں کیا ہے، اسے بدل کر یونیٹری طرز کا آئین بنانے پر زور دیا۔ انہوں نے ہندستان کے قومی جھنڈا ترنگا کو بھی نامنظور کیا ہے۔ یہی وجہ رہی کہ سوشلسٹوں نے ناناجی دیشمکھ اور آر۔ ڈی۔ بھنڈارے جیسے آر۔ ایس۔ ایس۔ کے بڑے لیکن تنگ نظر شدت پسندوں کو جنتا پارٹی سے برخواست کردینے کی پرزور وکالت کی تھی۔ این۔ ڈی۔ اے۔ سرکار کے زمانے میں آئین کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کی ملک گیر بحث چلائی گئی، لیکن ہر جگہ اس پہل کی مخالفت دیکھنے میں آئی اور سنگھ پریوار آئین میں چھیڑ چھاڑ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

۱۹۶۷ سے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کی بابری مسجد کی شہادت تک کا سنگھ پریوار کا سفر بڑا دلچسپ اور ان کے لئے کافی فائدہ مند رہا ہے۔ جذباتی مسائل کو سیاست کی بساط پر کس خوبی سے اور کس وقت رکھا جائے، اسے کیسے استعمال کیا جائے، سنگھی ''تھنک ٹینک'' کی نپی تلی کامیاب پالیسی رہی اور آج بھی ہے۔ ''فرقہ وارانہ فسادات'' ان کی پالیسی کی بساط کا ہمیشہ اہم ''پاسا'' رہا ہے۔ گرو گول ولکر کی زندگی تک تو ایسا دیکھا گیا کہ جس شہر میں وہ گئے، اپنی شاکھا لگائی اور وہاں فرقہ وارانہ فساد ہونا ہی ہونا تھا۔ فساد ہوئے اور ہندوؤں کے درمیان سنگھ پریوار کی مقبولیت کا گراف اوپر اٹھا، ہمیشہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ملک کا بٹوارا تو ان کا اولین ایجنڈا رہا ہی، اس کے علاوہ انہوں نے کبھی گئو بھکتی کا سہارا لیا، تو کبھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اردو، یکساں سول کوڈ، دفعہ ۳۷۰، شیلا پوجن اور مندر مسجد اختلاف کا۔ نتیجتاً دوسرے پارلیامنٹ میں دو ممبروں والی پارٹی دھیرے دھیرے اپنے کو وسیع کرتی گئی اور گٹھ بندھن کی سیاست کے دور میں ۲۲ پارٹیوں کے سہارے مرکز میں اقتدار میں آ گئی۔ اس کے ممبروں کو ہندستان کے وزیر خزانہ، وزیر خارجہ، وزیر اعظم، نائب وزیر اعظم اور نائب صدر بننے کا فخر حاصل ہوا۔ اور آج حزب مخالف کے لیڈر اسی پارٹی کے ہیں۔

پلورل بناوٹ والے سماج میں مختلف فرقوں اور ذات پات والی پہچان کے بیچ تناؤ اور کھٹ پٹ کے کئی مسائل موجود ہوتے ہیں۔ ایسے مسائل میں بلاشبہ فرقہ واریت سب سے خطرناک ہے اور

دلچسپ حقیقت ہے کہ اسی میں سنگھ پریوار کی طاقت کا راز پوشیدہ ہے۔

اس برصغیر کے لئے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ''فرقہ واریت'' نے کافی پریشانیاں پیدا کی ہیں۔ اس کے غلط سیاسی استعمال نے اکثر یہاں کے سماجی تانے بانے کو خطرناک حد تک الجھا کر توڑا مروڑا ہے۔ اسی موضوع کو توجہ کا مرکز بناتے ہوئے ہندستان کے National Academy کے سابق Director General ایس۔سی۔مشرا کی ان کے تجربات پر مبنی ایک اہم کتاب ,Communal Riots in India ۱۹۷۷ میں شائع ہو کر سامنے آئی تھی۔ اس کتاب میں جن حقائق کو انہوں نے اجاگر کیا وہ کسی حالت میں آزاد ہندستان کی صحت کے لئے اچھے اشارے نہیں مانے گئے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں CRPF کے فی زمانہ ڈائرکٹر جنرل این۔سی۔سکسینہ کہتے ہیں:

''ہندستان میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کی متعدد ایسی مثال ملتی ہیں، جو ایک شہر اور اس شہر کے ایک ہی علاقہ میں بار بار ہوئے ہیں۔ وہاں نظم ونسق بنائے رکھنے والوں کی یہ پوری طرح ناکامی ہے، کیونکہ پچھلے فسادات کو سختی سے نہیں دبایا گیا۔ فساد کرنے والوں، انہیں بھڑکانے والے گروہوں کے ساتھ سیاسی تحریکوں کی طرح کا برتاؤ نہیں کیا جانا چاہئے۔ رانچی، میرٹھ اور صدر بازار، دلّی میں بار بار ایک علاقے میں فسادات کی تاریخ ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ فسادات سے نمٹنے والی مشنری نے فرقہ وارانہ فسادات کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔'' [۵]

اسی ضمن میں ہندستان کا کینسر، فرقہ واریت، کی الجھتی صورت حال میں پولس کے رول پر مرکوز ایک اہم تحقیقی کتاب یوپی کے ڈائرکٹر جنرل آف پولس ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے، موجودہ وائس چانسلر مہاتما گاندھی بین الاقوامی ہندی یونیورسٹی، وردھا کی ۱۹۹۸ میں Combating Communal Conflict کے نام سے سامنے آئی۔ اس کتاب کا اردو سمیت کئی دوسری ہندستانی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور لوگوں کے درمیان یہ کافی مقبول ہوئی۔ کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ فسادات میں پولس کے رویے کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں وہ کہتے ہیں:

''موجودہ پس منظر میں حالات پر نظر ڈالنے سے ہندستان جیسے ہمہ جہتی سماج میں فرقہ

واریت سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس سے ہمارے آئین کے بنیادی ڈھانچے کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ ہندستان نے سیکولر جمہوریت کی راہ اپنائی، لیکن گذشتہ کئی عشروں سے سیکولر نظام پر لگاتار حملے ہوتے آرہے ہیں۔ اگر ہندستانی سماج کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کے سوچ کو فسادات کے روپ میں بدلنے کی کوشش مضبوط ہوتی رہی، تو ایک انصاف پسند سیکولر ترقی پذیر ہندستان کی عمارت، جس کا خواب ہمارے رہنماؤں نے دیکھا تھا، وہ چکنا چور ہو جائے گا۔''

۱۲ جون ۲۰۱۱ کو پٹنہ کے گاندھی سنگر ہالیہ میں سالانہ شری رام چرتر سنگھ یادگاری خطبہ دیتے ہوئے ڈاکٹر وبھوتی نارائن نے ''فرقہ واریت کا سوال اور صحت مند انتظامیہ کی چنوتیاں'' پر بولتے ہوئے ہندستان کی پولس انتظامیہ کے فرقہ پرست کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ موجودہ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کی سرکار کے اس بل کا بھی انہوں نے تذکرہ کیا، جو فرقہ واریت پر روک لگانے کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اپنے وسیع انتظامی تجربوں کی بنیاد پر انہوں نے کہا تھا:

''فرقہ وارانہ تشدد کے خلاف بل کے بہانے سب سے پہلے اس کے ذریعہ بڑھے اختیارات کا استعمال کرنے والے ادارے کی اہلیت، قوت ارادی اور قبل میں ان کے ذریعہ قانون سے حاصل اختیارات کے استعمال اور غلط استعمال کی تاریخ کو کھنگالنا ضروری ہے۔ مجھے قبل میں اسی بل کے ڈرافٹ پر غور کرنے کے لئے منعقد ایک کانفرنس کی یاد آرہی ہے، جس میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جے۔ ایس۔ ورما نے بہت اچھا سوال اٹھایا تھا کہ کیا ہندستان کے موجودہ قانون فرقہ وارانہ تشدد سے نمٹنے کے لئے کافی نہیں ہیں؟ وہ امکانی طور پر پوچھنا چاہتے تھے کہ اگر حکومتِ ہند میں موجودہ قوانین کی طرح اس نئے قانون کو لاگو کرنے کے لئے بھی ضروری قوت ارادی کا فقدان رہا، تو اس کا بھی حشر انہیں جیسا تو نہیں ہو جائے گا؟ اب یہ قانون کی شکل لینے جارہا ہے، تو میرے دل میں ایک اور سوال اٹھ رہا ہے۔ کیا ہندستانی حکومت کے جس ادارے کو خاص طور سے ان تجاویز کا استعمال کرنا ہے، وہ اس کے لائق ہے بھی یا نہیں؟ عدالتوں تک پہنچنے کے پہلے پولس اس نئے قانون کا استعمال یا غلط استعمال کرے گی۔ پچھلا تجربہ بتاتا ہے کہ قانون میں موجود تجاویز کا استعمال پولس نے اس طرح کیا ہے کہ فسادات میں متاثرین، خاص طور سے اقلیتوں، کے دل میں ہمیشہ یہ کسک رہی ہے کہ ہندستانی ریاست نے وہ سب نہیں کیا، جو اسے ایسی حالت میں کرنی چاہئے تھی یا اس نے وہ سب کیا، جو اسے نہیں کرنا

چاہئے تھا۔ ۱۹۶۰ کے بعد کے ہر فرقہ وارانہ فساد میں پولس کے اوپر جانبداری کے الزام لگے ہیں۔ الزام لگانے والوں میں صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ انسانی حقوق تنظیم سے جڑے لوگ، آزاد میڈیا اور مختلف جانچ ایجنسیوں کی رپورٹیں شامل ہیں۔ اگر ہم سرکاری اعداد وشمار کا ہی یقین کریں، تب بھی ہم یہی پائیں گے کہ ہر فسادات میں مرنے والوں میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ نہ صرف زیادہ، بلکہ بیشتر معاملوں میں تو تین چوتھائی سے بھی زیادہ۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان میں پولس کارروائی بھی زیادہ تر مسلمانوں کے خلاف ہوئی۔ یعنی جن فسادات میں مرنے والے بیشتر مسلمان تھے ان میں بھی پولس کی گاج ان پر ہی گری۔ مطلب زیادہ مسلمان گرفتار ہوئے، بیشتر تلاشیاں بھی انہیں کے گھروں کی ہوئیں اور ان فسادات میں بھی، جہاں مرنے والے تین چوتھائی سے زیادہ، مسلمان تھے، وہاں بھی اگر پولس نے گولی چلائی، تو ان کے شکار بھی خاص طور سے مسلمان ہی ہوئے۔ مسلمانوں میں پولس کے تئیں عدم اعتمادی اتنی زیادہ ہے کہ اپنے ایک ریسرچ کے دوران جب میں نے فساد متاثرین سے ایک بہت معمولی سا سوال پوچھا کہ اس وقت، جب ان کی جان و مال خطرے میں ہو، تو کیا وہ مدد کے لئے پولس کے پاس جانا چاہیں گے؟ دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں اس طرح کا سوال صرف پاگل ہی پوچھ سکتا ہے، کیونکہ کہیں بھی خطرے میں پڑنے پر لوگ ''حکومت'' کی طرف ہی لازمی طور سے دیکھیں گے۔ ''حکومت'' کا خاص کام عوام کی جان و مال کی حفاظت کرنا ہے اور حکومت کا سب سے اہم حصہ پولس اس کردار کو نبھاتی ہے، مگر آپ اسے کیا کہیں گے کہ میرے سوال کے جواب میں اقلیتی طبقہ کے فساد متاثروں کی اکثریت نے کہا کہ وہ اس وقت بھی، جب ان کی جان مال خطرے میں ہو، پولس کے پاس نہیں جانا چاہیں گے۔ ان کا یہ تذبذب کسی ویکیوم میں نہیں پیدا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے ٹھوس تاریخی وجوہات ہیں۔ انہوں نے مختلف فرقہ وارانہ فسادات میں پولس کے جانبدارانہ رویے کی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ میں نے خود اپنے ریسرچ کے دوران اور ۳۵ برسوں کی ہندستانی پولس سیوا کی مدت میں ایسے بہت سے معاملے دیکھے ہیں، جب فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں لٹا پٹا کوئی مسلمان پولس کے پاس پہنچا، تو کندھوں پر ہمدردی کی تھپتھپاہٹ کے بجائے اپنے گالوں پر ایک جھناٹے دار جھاپڑ پایا۔ ۱۹۸۴ میں سکھوں کے تجربے بھی کچھ ایسے ہی تھے، جب دلّی جیسے شہر میں بھی پولس نے بیشتر معاملوں میں مصیبت زدہ سکھوں کی مدد کرنے کی جگہ بلوائیوں کا ساتھ دیا اور

کئی معاملوں میں تو اگر پولس نہ پہنچی ہوتی، تو سکھ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔"

جبل پور فساد کے بعد ۱۹۶۱ سے ۲۰۰۲ تک بحال کئے گئے حسب ذیل کمیشن: شری واستو کمیشن، ۱۹۶۱، جسٹس دیال کمیشن، ۱۹۶۷، جسٹس ریڈی کمیشن، ۱۹۶۹، جسٹس مدان کمیشن، ۱۹۷۰، جسٹس وتھاتل کمیشن، ۱۹۷۱، جسٹس نارائن اور رضوی کمیشن، ۱۹۷۹، این۔سی۔سکسینہ کمیشن، ۱۹۸۲، جسٹس بی۔این۔شری کرشن کمیشن، ۲۰۰۹، نے پولس اور سرکار کے جانبدارانہ رویے کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے اور صاف طور پر سرکاری مشنریوں کو مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرنے کا مجرم مانا ہے۔ بابری مسجد کے توڑے جانے کے بعد قائم جسٹس لبراہن کمیشن نے ۱۷ برسوں تک کام کیا، اس کی مدت ۴۷ بار بڑھائی گئی اور جو رپورٹ آئی، اس پر ابھی تک عمل درآمد کا انتظار ہے۔ اس کمیشن نے جن مجرموں کی شناخت کی ہے، ان پر سیکولر اسٹیٹ ہاتھ بھی ڈالتی ہے یا نہیں، ابھی دیکھنا باقی ہے۔

غلامی کے دنوں میں ۱۹۲۴ کے بعد ہندستان کے کئی علاقوں میں زبردست ہندو مسلم فساد ہوئے تھے اور یہ سلسلہ مہینوں چلا۔ پہلی عدم تعاون مع تحریک خلافت (۱۹۲۰-۱۹۲۲) کے درمیان جو ہندو مسلم اتحاد کی تاریخ کا سنہرا باب لکھا گیا تھا، وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں بکھر گیا۔ انہیں دنوں ۲۴ مارچ ۱۹۳۱ کو کانپور میں بھی زبردست فساد ہوا تھا، جس کی وجہ سے کئی دنوں تک شہر افراتفری میں مبتلا رہا۔ "پرتاپ" کے ایڈیٹر مشہور صحافی اور یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر گنیش شنکر ودیارتھی اس فساد کو ختم کرانے کی کوشش میں مارے گئے تھے۔ اس فساد کے اسباب کی جانچ کے لئے انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ۱۹۳۱ کے کراچی اجلاس میں بھگوان داس کی صدارت میں ایک جانچ کمیٹی بحال کی تھی۔ اس جانچ کمیٹی کے سکریٹری پنڈت سندر لال تھے اور دوسرے ممبر تھے پرشوتم داس ٹنڈن، منظر علی سوختہ، عبد اللطیف بجنوری اور ظفر الملک۔ اس کمیٹی نے اکتوبر ۱۹۳۱ کو اپنی رپورٹ اس وقت کے کانگریس صدر سردار ولبھ بھائی پٹیل کو سونپی تھی۔ اس کمیٹی نے فرقہ واریت کے سوال اور انگریزوں کے ذریعہ اپنائی گئی پالیسی پر تاریخی پس منظر میں تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دونوں فرقوں کی اکثریت کے درمیان فرقہ واریت کا زہر موجود ہے اور اگر اس سے نجات نہیں پایا گیا، تو ہندستان کا مستقبل روشن نہیں کہا جا سکتا۔ بعد کے دنوں کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ہم نے اپنی روش نہیں بدلی، جس کا انجام بہت دردناک

سامنے آیا۔ ہندستان بٹ گیا اور انگریزوں کو گئے بھی ۶۴ برس ہو گئے، لیکن ہماری ذہنیت میں بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔ جو حالت اس وقت تھی، کچھ تبدیلیوں کے ساتھ وہی حالت آج بھی موجود ہے۔ اس افسوسناک صورت حال کا فائدہ اس وقت بھی سیاسی مفادات کے حصول کے لئے ہوا اور آج بھی وہی ہو رہا ہے۔ جہاں مسلمانوں کو موقع ملا، انہوں نے حالات کا فائدہ اٹھایا اور جہاں ہندوؤں کو موقع ملا، انہوں نے اسے استعمال کیا۔ آبادی کے تناسب میں جب دیکھیں گے، تو واضح ہو گا کہ اقلیتوں کو زیادہ ہی بھگتنا پڑا ہے۔

حالات کے منصفانہ تجزیہ سے پتا چلتا ہے کہ سنگھ پریوار نے اپنے طے کئے ہوئے خفیہ ایجنڈا پر عمل کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ جب جب موقع ملا، اس نے سرکاری محکموں میں قابل اعتماد کیڈر کو اچھی طرح حساس عہدوں پر متعین کیا، تاکہ وہ اپنے ماتحت زیادہ سے زیادہ اپنے لوگوں کو جہاں گنجائش نظر آتی ہو، بھر دیں۔ اور جب سیاسی سطح پر پارٹیوں کی ملی جلی سرکاروں کا وقت آیا، تو اس موقع کا سب سے زیادہ فائدہ سنگھ پریوار کو ہی ملا، کیونکہ اس کے اپنے لوگ اہم جگہوں پر پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے محکماتی رسوخ اور مسلم مخالف ذہنیت کا استعمال کیا اور اپنے مختلف ۷۰۔۷۵ سرگرم تنظیموں کے توسط سے سماجی اور سیاسی طور پر مضبوط متبادل کی حیثیت سے اپنے کو اچھی طرح قائم کر لیا۔ انہوں نے ہر اُس حساس مسئلہ کو اپنی مہموں کا ایجنڈا بنایا، جو اقلیتوں، خاص کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہو، تاکہ اس کا مناسب سیاسی فائدہ مل سکے۔ اپنے اس خطرناک کھیل میں انہوں نے ملک کے مفادات کا بھی قطعی کوئی خیال نہیں رکھا ہے۔ ہاں، قومیت کا نعرہ ضرور لگاتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۷ میں دلی کی مرکزی سرکار میں شریک رہنے کا جو سنہرا موقع انہیں ملا، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے لئے مستقبل کی سیاسی زمین تیار کی۔ بعد میں بڑے پیمانے پر منصوبہ بند شیلا پوجن، ایودھیا میں رام مندر تعمیر کی مہم، کاشی وشوناتھ مندر کا سوال اور مختلف سادھو، سنتوں، سادھویوں اور ایل۔ کے۔ اڈوانی کی رتھ یاترا نے پورے ملک میں جو فرقہ وارانہ ماحول بنایا، وہ سنگھ پریوار کے لئے ''پریمیم'' ادا کرنے جیسا منافع بخش سودا ثابت ہو رہا ہے۔

باوثوق ذرائع کی اطلاع کے مطابق سنگھ پریوار کی مسلم مخالف ذہنیت کا ایک اور اہم واقعہ دھیان دینے لائق ہے۔ جنتا پارٹی کی سرکار میں جب اٹل بہاری باجپائی ہندستان کے وزیر

خارجہ تھے، انہوں نے اس اسرائیل، جسے ہندستانی سرکار نے ابھی تک نہ سیاسی طور پر تسلیم کیا، اور نہ اسرائیل سے کوئی سیاسی تعلق قائم تھا، کے وزیر اعظم موسادیان، جس کی پہچان ایک خطرناک دہشت گرد کی رہی ہے، کو خفیہ طریقے سے ہندستان بلایا۔ اٹل جی نے بہت چاہا کہ وزیر اعظم مرارجی دیسائی ان سے تھوڑی دیر کے لئے بھی مل لیں، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ جس خفیہ طریقے سے موسادیان ہندستان لائے گئے، اسی خفیہ طریقے سے انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ سنگھ پریوار کی یہ کوشش ہندستانی سرکار کو، خاص کر اب تک کی منظور شدہ خارجہ پالیسی کو زبردست جھٹکا دینے کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں اور عرب ملکوں پر بھی اپنی مسلم دشمنی کو واضح کر دینے جیسا قدم تھا۔ ہندستانی سرکار نے اپنے اصولوں کی بنیاد پر اپنائی گئی خارجہ پالیسی کے پس منظر میں راجیو گاندھی کی سرکار تک اسرائیل کو سیاسی منظوری نہیں دی تھی۔ ہندستانی سرکار نے اسرائیل کے بارے میں جو پالیسی اپنائی تھی، اس کے حساس تاریخی اسباب رہے ہیں۔ زایونسٹ (Zionist) یہودیوں کی خطرناک نسل پرست مہم اور فلسطینیوں کے ساتھ ان کی لگاتار ناانصافی اور بُرے سلوک کو ہندستان نے کبھی پسند نہیں کیا، بلکہ اس کی ہر سطح پر مخالفت کی ہے۔

سامراجی یوروپی ملکوں نے اپنے مفادات کے تحفظ اور تسلط کی آپسی رقابت میں دو عالمی جنگوں کی آگ میں دنیا کو جھونکا ہے۔ انہیں یوروپی ملکوں کے ایک جرمن ڈکٹیٹر اڈولف ہٹلر نے وہاں کی کمان سنبھالنے کے بعد یہودیوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ برتاؤ کیا اور کہا جاتا ہے کہ ہزاروں یہودیوں کو گیس چیمبر میں جھونک دیا تھا۔ لیکن ستم ظریفی یہ رہی کہ جرمنی کے کئے ان وحشیانہ کرتوت کی سزا اسے نہ دے کر منصوبہ بند طریقے سے بے قصور فلسطینیوں کو دی جانے لگی۔ یوروپی ملکوں اور امریکی پشت پناہی میں ہزاروں برسوں سے فلسطین میں آباد اصل فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے زبردستی بے گھر کر، ان کی جائداد پر زبردستی ناجائز قبضہ کیا گیا۔ جرمنی سے بھاگے اور بھگائے گئے یہودیوں کے علاوہ دوسری جگہوں سے بھی یہودیوں کو وہاں تھوپ کر بسانے کا سلسلہ چلا۔ اتحادی طاقتوں کی سازشوں کے تحت مڈل ایسٹ میں امریکہ اور اس کے یوروپی حلیفوں کا ایک مضبوط فوجی اڈا ''اسرائیل'' کے روپ میں قائم کر دیا گیا اور سب کے اقتصادی اور فوجی امداد سے اس کی طاقت بڑھتی گئی۔ آج وہ ایک نیوکلیر ملک کی شکل میں مڈل ایسٹ میں سر درد بنا ہوا ہے۔ اسرائیلی ناانصافیوں اور ان کی دہشت گردانہ حرکتوں سے مجبور لاکھوں کی تعداد

میں فلسطینی رفیوجی کیمپوں میں آج بھی غیر انسانی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ فلسطینیوں کے سوال پر پوری دنیا دُہرا کردار اپنائے مگرمچھ کے آنسو بہاتی رہی ہے۔ یو۔این۔او۔ کی متعدد تجاویز کے باوجود ''فلسطین'' ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی شکل نہیں لے سکا ہے۔ امریکی یہودی سرمایہ داروں، میڈیا مالکان اور خطرناک ہتھیاروں کے سامنے کسی دوسرے کی کچھ نہیں چلتی ہے۔ یہاں تک کہ یو۔این۔او۔ اور دوسری بین الاقوامی تنظیمیں بھی امریکی دباؤ میں اسرائیل کی طرفداری میں کھڑی ہو جاتی ہیں اور اسرائیل کی ساری ناانصافیوں کو عالمی برادری نظرانداز کر رہی ہے۔ نتیجتاً جب چاہتا ہے، جہاں چاہتا ہے اسرائیل اپنے راکٹ داغتا رہتا ہے، اپنی کالونی بساتا جا رہا ہے۔

یہ تکلیف دہ مگر تاریخی سچائی ہے کہ اتحادی طاقتوں نے "Zionism" کو اپنا پورا تعاون دیا ہے۔ اپنی پالیسیوں سے ان لوگوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ابھی بھی اسی غیر اخلاقی استحصال پر مبنی ''شاہی لوک ذہنیت'' والے کلچر کے حامل ہیں جہاں ''اقدار'' اور ''انسانیت'' کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ اس تاریکی میں ایک ہی بااثر شخص مہاتما گاندھی روشنی کی کرن کے روپ میں نظر آتے ہیں، انہوں نے اس قابل مذمت نسل پرست (Zionist) نظریہ کی پرزور مخالفت کی۔ اس مخالفت کی وجہ سے انہیں اپنے ایک نہایت قریبی دوست ہرمن کیلن باخ کی دوستی بھی گنوانی پڑی۔ جن دنوں جنوبی افریقہ میں رنگ بھید اور نسل پرستی کے خلاف گاندھی جی عدم تشدد کی بنیاد پر لڑائی لڑ رہے تھے، اسی وقت اجتماعی زندگی کے تجربوں کے لئے انہوں نے ۱۹۱۰ میں ٹرانسوال میں ٹالسٹائی فارم کا قیام کیا تھا۔ اس فارم کے لئے زمین اور شروعاتی اقتصادی تعاون ان کے ایک یہودی آرٹیکٹ دوست ہرمن کیلن باخ (۱۸۷۱۔۱۹۴۵) نے دیا تھا۔ وہ خود بھی ستیہ گرہوں میں شریک ہوئے تھے اور جیل کی سزا بھی کاٹی تھی۔ وہ گاندھی جی کے ساتھ ہندستان آنے کے خواہش مند بھی تھے۔ لیکن یہودی ہونے کے سبب برٹش سرکار نے انہیں ہندستان آنے کی اجازت نہیں دی۔ یہودیوں کے "Zionist" تحریک کے بڑے حامی ہونے کے سبب کیلن باخ چاہتے تھے کہ ان کے دوست گاندھی "Zionism" کو اپنی حمایت دیں۔ مگر گاندھی نے شدید ناانصافی اور تنگ نظر اعتقادات پر مبنی اس تحریک کی نہ صرف تردید کی بلکہ بڑے سخت الفاظ میں اس فکر کی مذمت کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ فلسطینیوں کی مکمل حمایت کرتے ہوئے ان کے ساتھ کی جا رہی ناانصافیوں اور غیر انسانی سلوک کی انہوں نے مذمت کی۔ گاندھی جی کے

کڑے رخ سے کیلن باخ کو کافی تکلیف پہنچی، وہ ناراض ہو گئے، برسوں کی ان کی گاندھی جی سے دوستی میں دراڑ آ گئی۔

۲۶ نومبر ۱۹۳۸ کو گاندھی جی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں فلسطین کے مسئلہ پر اپنا ایک تفصیلی مضمون شائع کیا تھا۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی وہ مضمون آج کے حالات میں بھی مکمل طور پر باا ثر ہے، کیونکہ فلسطین کا مسئلہ جیوں کا تیوں بنا ہوا ہے اور فلسطینی ابھی بھی انصاف کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ گاندھی جی کے نظریہ کو سمجھنے کے لئے اس مضمون کے کچھ حصے کو یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں:

My sympathies are all with the Jews...They have been the untouchables of Christainity. The parallel between their treatment by Christains and the treatment of untouchables by Hindus is very close. Religious sanction has been invoked in both cases for the justification of the inhuman treatment meted out to them...

But my sympathy does not blind to the requirements of justice.The cry of national home for the Jews does not make much appeal to me. The sanction for it is sought in the Bible and the tenacity with which the Jews have hankered after return to Palestine. Why should they not, like other peoples of the earth, make that country their home where they are born and where they earn their livelihood?....

Palestine belongs to the Arabs in the same sense that England belongs to the English or France to the French. It is wrong and inhuman to impose the Jews on the Arabs. What is going on in Palestine today cannot be justified by any moral code of conduct. The mandates have no sanction but that of the last war. Surely it would be a crime against humanity to reduce the proud Arabs so that Palestine can be restored to the Jews partly or wholly as

their national home...

And now a word of the Jews in Palestine. I have no doubt that they are going about in the wrong way. The Palestine of the Biblical conception is not a geographical tract. It is in their hearts. But if they must look to the Palestine of geography as their national home, it is wrong to enter it under the shadow of the British gun...

مغربی سامراجی طاقتوں، خاص کر برٹش اور امریکی دباؤ میں کام کرنے والے یو۔این۔او۔ کی حمایت حاصل، غریب فلسطینیوں کی جبراً قبضہ کی ہوئی زمین، جائداد اور مکانوں پر قائم اسرائیل کے زایونسٹ پروپیگنڈے نے وہاں کے ترقیاتی ماڈل، کوآپریٹو فارمنگ اور کبوز کمیونیٹی رہائش کا اتنا پروپیگنڈا کیا کہ متعدد نئے آزاد ہوئے ملک ان کے فریب کے شکار ہوگئے۔ ہندستان کی تعمیرِ نو کے لئے کوشاں لوگ بھی اس پروپیگنڈا سے نہیں بچ سکے تھے۔ ہندستانی سرکار نے فلسطینیوں کی غصب کی گئی جائداد، چھینے گئے علاقوں پر سامراجی طاقتوں کے تحفظ میں قائم اسرائیل کو منظوری نہیں دی تھی، لیکن یہاں کے سوشلسٹوں نے اپنے بہت سے کارکنوں کو وہاں کچھ سیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہاں کی زمین پر سوشلزم کے اتر آنے کے پروپیگنڈا کے جادو کا اتنا اثر پڑا کہ لوگ بھول گئے کہ اسرائیل کا قیام فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کرنا انصافیوں کی بنیاد پر ہوا ہے اور وہاں کے لیڈروں کے ہاتھ بے قصور غریب فلسطینیوں کے خون سے لت پت ہیں۔ ایسے ملک میں جس کی بنیاد میں ناانصافی ہی ناانصافی درج ہو وہاں سوشلزم کا زمین پر اترنا نہ اترنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

مغربی ملکوں کی پشت پناہی میں وہی اسرائیل آج ہندستان سے سیاسی شناخت حاصل کر اپنے خطرناک خفیہ مشنری ''موساد'' کے لئے یہاں ''جگہ'' حاصل کرانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ امریکی وسائل اور میڈیا پر قبضہ جمائے زایونسٹ یہودی بے شمار دولت اور اشتہاری ذرائع کے سہارے ہندستان کے دور سے دور دیہاتی علاقوں میں بھی پاؤں پھیلانے میں کامیاب ہو رہے ہیں، جو ہندستان کے لئے اچھے اشارے نہیں۔ غریبی، ناخواندگی اور الجھی ہوئی سماجی ساخت نے پہلے سے ہی یہاں کی حالت کو حساس بنا رکھا ہے، اس حالت میں سامراجی اسٹوج کو

جگہ مہیا کرانا کتنا نقصان دہ ثابت ہوگا، ابھی دیکھنا باقی ہے۔ بھاجپائی لیڈر شپ میں این۔ ڈی۔ اے۔ اتحاد نے اسرائیل کو منظوری دے کر آزادی کے بعد قائم سیاسی روایت کو توڑے جانے کی پہل کی ہے، اس کی قیمت تو ہندستان کو آج نہ کل چکانی ہی پڑے گی۔

مغربی ملکوں پر اسرائیل اور یہودیوں کے اثرات کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ فلسطینیوں پر ان کے ذریعہ کئے جا رہے شدید ناانصافیوں پر یو۔این۔او۔ کی تجاویز کے باوجود آج تک اسرائیل پر لگام نہیں لگائی جا سکی ہے، اس کے آگے یو۔این۔او۔ بھی ایک مجبور فورم بن کر رہ گیا ہے اور مغربی ممالک خاموش تماشائی۔ یہودی سرمایہ داروں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے Uni-Polar-World (یک قطبی دنیا) میں کمزور ملکوں کے لئے زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے اور مڈل ایسٹ تو ان کی خطرناک سازشوں کا اڈا بن کر ہی رہ گیا ہے اور اب اس برصغیر کی شاید باری ہو، یہ دیکھنا وقت کی بات ہے۔

سنگھ پریوار کی پہل پر اسرائیل سے سیاسی رشتہ قائم کرنے تک ہی بات محدود نہیں رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ این۔ ڈی۔ اے۔ اتحاد کی بڑی پارٹی کی شکل میں اقتدار میں آتے ہی اس کی پہل پر بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی ''موساد'' اور امریکی ''سی۔ آئی۔ اے۔'' سے ہندستان کے داخلی حفاظتی انتظام کی نگرانی اور مشترکہ حفاظتی بندوبست کے بارے میں سمجھوتہ بھی کر لیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کے معاملوں میں دخل اندازی اور Manipulation کی پوری چھوٹ انہیں مہیا کرا دی گئی، یہاں کی رازداریوں کی کنجی انہیں سونپ کر ان کے "Leaked" عیاں ہو جانے کا پورا انتظام کر دیا گیا۔ این۔ ڈی۔ اے۔ سرکار نے مسلم دشمنی میں ہندستان ہی نہیں پورے برصغیر کی گردن میں زہریلے سانپ لپیٹ دئے ہیں۔ وہ سانپ جب مسلمانوں کو ڈسیگا، تو ہندوؤں کی طرف انگلی اٹھے گی اور یہی کیفیت ہوگی جب وہ ہندوؤں کو ڈسے گا، تو مسلمان مجرموں کی طرح کٹہرے میں ہوں گے۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے آپسی رشتوں کا بھی یہی حال ہوتا رہے گا۔ چونکہ ایک دوسرے کے تئیں شبہات اور عدم اعتمادی ہمارے دلوں میں گھر کی ہوئی ہے، اس برصغیر میں بسنے والوں کی بڑی تعداد چھوئی۔ موئی ذہنیت کی شکار ہے۔ ایک دوسرے کے تئیں یہی عدم اعتمادی ''موساد'' اور ''سی۔ آئی۔ اے۔'' جیسی خطرناک تنظیموں کو اپنے ایجنڈے پر عمل کرنے کا لگاتار موقع دیتے رہیں گے۔ حالات واضح

کرتے ہیں کہ اب ہندستان امریکی دباؤ میں پوری طرح آ گیا ہے اور ہندستان کی خارجہ پالیسی ''بلیک میلنگ'' کا دباؤ جھیل رہی ہے۔ اس حالت میں اس برصغیر کے ٹارگیٹ گروپ ''اقلیتوں'' کو زیادہ بھگتنا پڑے گا اور وہ بھگت بھی رہے ہیں۔

جب ہندستان میں کوئی تکلیف دہ واقعہ رونما ہوتا ہے، تو پولس مشنری کے ساتھ مقامی میڈیا چندر رٹے رٹائے مسلم تنظیموں کے نام دُہرانے لگتی ہے اور اکثر بے قصور لوگوں کو بغیر وارنٹ، بغیر کوئی پختہ ثبوت مہیا کرائے، جیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ میڈیا میں واردات کی تفصیل ایسے وثوق سے نشر کی جاتی ہے کہ گویا ان وارادت کو انجام دینے والوں نے انہیں قبل اطلاع دے کر وہ قدم اٹھایا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کو اور اسلام کو بدنام کرنا خاص مقصد ہوتا ہے کچھ حقیقی اور بیشتر فرضی مسلم نہیں، ''اسلامی دہشت گرد'' تنظیموں کا بڑے پیمانے پر پروپیگنڈا ہونے لگتا ہے۔ سمجھوتہ ایکسپریس، بمبئی سنٹرل ریلوے اسٹیشن پر خونی ڈراما، ایس۔ پی۔ کرکرے کا قتل، اجمیر درگاہ، حیدرآباد کی مکہ مسجد اور مالیگاؤں کے دھماکوں کے پس منظر میں سادھوی پرگیہ، سوامی اسیمانند، کرنل پروہت جیسے ذمہ دار لوگوں کے نام دہشت گردوں کے روپ میں جب سامنے آئے تو پورا ملک اچنبھے میں پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ ویدوں کے اشلوکوں کے بجائے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے والی سادھوی رتمبھرا اور اوما بھارتی کے علاوہ بھی بم اور پستول چلانے والی سرگرم سادھوی سنگھ پریوار میں موجود ہیں۔ اور ناندیر، جہاں بم بناتے ہوئے آر۔ ایس۔ ایس۔ کے کچھ لوگ مارے گئے تھے، نے تو یہ بھی ثابت کر دیا کہ سنگھ پریوار کے اسلحہ خانوں میں نقلی داڑھی، بالوں کے وِگ اور ٹوپیوں کی بھی کافی تعداد موجود رہتی ہے، تاکہ اپنے سیوم سیوکوں کو مسلمانوں کے لبادہ میں میڈیا کے سامنے مجرموں کے روپ میں پیش کر دینا ان کے لئے آسان ہو جائے اور لوگ شک میں مبتلا ہوتے رہیں کہ ناپسندیدہ واقعہ کے پیچھے مسلمانوں کا ہی ہاتھ رہتا ہے۔

۱۹۸۱ میں تامل ناڈو کے میناکشی پورم میں کچھ دلتوں نے اپنا دھرم تبدیل کر اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو گئے تھے۔ اس مذہب تبدیلی پر پورے ملک میں ہندوؤں کا تلخ ردعمل ہوا تھا۔ اس کی آڑ میں شدت پسند ہندوؤں نے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے خلاف ماحول بنانے کی کوشش کی۔ اس واقعہ کو بنیاد بنا کر اکتوبر ۱۹۸۱ میں ڈاکٹر کرن سنگھ کی صدارت میں عظیم ہندو سماج

سمیلن کا انعقاد ہوا تھا۔ اس سمیلن کے لئے دئے اپنے پیغام میں جگجیون رام نے بڑی تفصیل سے ہندو دھرم اور ہندستان کے دلتوں اور مسلمانوں کے ساتھ کئے جا رہے نا مناسب برتاؤ پر روشنی ڈالی تھی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اس مذہب تبدیلی پر شور تو مچایا جا رہا ہے، لیکن کوئی نہ ان اچھوتوں سے صورت حال کی جانکاری لینا چاہتا ہے اور نہ مسلمانوں سے ہی۔ چونکہ اچھوتوں کا وجود تو بڑی ذات کے ہندوؤں کے لئے نہیں کے برابر ہے، اس لئے ان سے پوچھنے کا سوال ہی نہیں اور مسلمانوں تو مجرم ہی مان لئے گئے ہیں، پھر ان سے کیا پوچھنا؟ وہ کہتے ہیں:

''اس معاملے میں اچھوتوں سے کچھ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ بڑے بڑے لیڈروں کے مشترکہ بیان مذہب تبدیلی کے بارے میں نکالے جاتے ہیں، نکلتے ہیں، مگر وہ اچھوتوں سے، مسلمانوں سے کیوں پوچھنے جائیں؟ وہ آج تک اچھوتوں کو نہیں کے برابر مانتے رہے ہیں۔ رہی بات مسلمانوں کی، تو ان کو تو مجرم مان ہی لیا گیا ہے۔ مجرم مان کر ہی مطمئن نہیں، اب تو انہیں ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ مانا جا رہا ہے۔ کتنی زہریلی ذہنیت کو ابھارا جا رہا ہے؟ دیش بھکت صرف اعلی ہندو ہیں؟ ملک کے تئیں مسلمانوں کی وفاداری پر کھلے عام شک کیا جا رہا ہے، ان پر حملہ کیا جا رہا ہے، جو مناسب نہیں ہیں۔ اچھوتوں کو بدنام کیا جا رہا ہے، انہیں بکنے والا کہا جا رہا ہے۔''[6]

پلورل سماجی بناوٹ والے ہندستان کی دوسری بڑی اکائی ''مسلمان'' کے بارے میں ہندوؤں کے دلوں میں بیٹھی ''گانٹھ'' کا اظہار آئے دن ان کے قول اور فعل سے ہوتا رہتا ہے۔ لاکھوں ہندو بودھ ہو گئے، یا جین، سکھ دھرم کو اپنا لیا، ہندوؤں کے درمیان کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ لیکن اگر کوئی ہندو، مسلمان، ہو جائے، تو طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہمارے سوچنے کا یہ انداز دلچسپ اور غور طلب ہے۔

جگجیون رام نے اپنے ۷۷ویں یوم ولادت کے موقع پر منعقد جلسہ میں، جہاں فاروق عبداللہ بھی موجود تھے، مسلمانوں کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ۵ اپریل ۱۹۸۴ کو کہا تھا:

''میں ان کو (فاروق عبداللہ) اتنا اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ ہندستان کی انتظامی مشنری ان کے بارے میں چاہے جو سوچتی ہو، یا پروپیگنڈا کرتی ہو، مگر ہندستان کا ہر ایک باشندہ ان کو سچا ہندستانی مانتا ہے۔ میں اس بات کو دُہراؤں گا، جو میں ہندستان کے مسلمانوں سے اکثر

کہا کرتا ہوں کہ خدا کے لئے ہندستان سے وفاداری کی صفائی تم مت دیا کرو۔ کس کو یہ حق ہے کہ تم سے وفاداری کا مطالبہ کرے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ملک سے غداری مسلمانوں نے نہیں کی ہے۔ میں ایک بات کا ذکر کیا کرتا ہوں۔ جب میں ہندستان کا وزیر دفاع تھا، پاکستان سے لڑائی ہوئی۔ جب شنکر گڑھ کی طرف ہماری فوج بڑھی، تو ہم کو بہت سے لوگوں نے صلاح دی تھی کہ آگے کے مورچے پر مسلمانوں کو مت بھیجنا اور میں نے ٹھیک اس کا برعکس کیا۔ سب سے آگے ایک مسلم بٹالین رکھا، کیونکہ مجھ کو بھروسہ تھا کہ ہندستان کا مسلمان ہندستان کے لئے لڑتا ہے اور یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا کیونکہ اس مسلم بٹالین نے پاکستان کی فوج کو مار بھگایا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی مسلمان سے صفائی مانگے، میں کہتا ہوں اس کا دماغ صحیح نہیں ہے۔''

ہندستان کے بٹوارے کے نتیجے میں آزادی کے بعد ہندستانی مسلمان شبہات کے گھیرے میں نظر آتے ہیں۔ ''مسلم لیگ'' اور ''پاکستان مخالف مسلمان'' یہاں تک کہ بڑے کانگریسی مسلم لیڈر بھی عدم اعتمادی کے تھپیڑے محسوس کر رہے تھے۔ پہلی صف کے مجاہد آزادی، بہار سرکار کے وزیر ڈاکٹر سید محمود کا اپنے وزیر اعلی ڈاکٹر شری کرشن سنگھ کو ۱۹۴۸ میں لکھے خط سے اس وقت کے ہندستان کے گمبھیر حالات کی شدت کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

جناب شری بابو،

اِدھر کچھ ہفتوں سے میں ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوں، لیکن آپ کے جشن یوم ولادت کے مدنظر آپ کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

جس طرح مسلمانوں کے گھروں اور راستہ چلتے مسلمان راہگیروں کی تلاشی لی جا رہی ہے اس سے صوبے کے مسلمانوں میں کافی بے چینی پائی جا رہی ہے۔ اس رویے سے بہت سارے ہندو بھی خوش نہیں ہیں۔ عزت دار گھروں کی عورتوں اور برقع پوش عورتوں کی سرِ عام تلاشی لی جاتی ہے۔ اخباروں میں مسلمانوں کے یہاں ہتھیار کی برآمدگی کی جھوٹی خبریں بڑھا چڑھا کر شائع کی جا رہی ہیں۔ بڑے مسلم سرکاری افسر بھی اس بے عزتی سے نہیں بچ رہے ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ آپ کے آئی۔ جی۔، پولس، آبکاری محکمہ کے کمشنر اور افسران بھی نہیں بخشے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں کی اور ان کی تلاشی اس طرح لی جا رہی ہے، جیسے سارے مسلمان مجرم ہوں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں، جو آپ کے وزارتی کونسل کا ایک ممبر ہوں، کی گاڑی کے ڈرائیور کی مخالفت کے باوجود پولس کے ذریعہ تلاشی لی گئی۔ پولس والے ہماری رہائش پر یہ تحقیق کرنے آئے کہ ہمارے گھر میں کتنے ہتھیار جمع ہیں۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔ یہ میری نہیں، پوری وزارتی کونسل کی بے عزتی ہے۔ جب تک میں آپ کی وزارتی کونسل کا ممبر ہوں مجھے کچھ خاص اختیار اور سہولتیں حاصل ہیں۔ ایک کانگریسی ہونے کے ناطے آدھی زندگی انگریزی سرکار کے ہاتھوں بے عزتی جھیلتا رہا۔ اب کچھ دنوں کی بچی زندگی کانگریسی سرکار کے ذریعہ ذلیل ہوتا رہوں گا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

کرب میں مبتلا

آپ کا

سید محمود [۸]

ہندو اور مسلمان، ہندستان کی یہ دو بڑی اکائیاں سیکڑوں برسوں سے ساتھ رہ رہی ہیں، یہ تاریخی سچائی ہے۔ ان کے بیچ کے رشتوں میں مختلف پہلوؤں پر آج بھی ہمیں سنجیدگی سے دھیان دینا ضروری ہے، کیونکہ ان کے آپسی رشتوں پر ہماری گنگا جمنی ثقافت کی خوبصورتی منحصر تو کرتی ہی رہی ہے، اکیسویں صدی کے تقاضوں کو بھی ان کے دوستانہ رشتے ہی پورا کرنے والے ہیں۔

اس باب کو کملیشور کے لفظوں سے ختم کرنا مناسب لگتا ہے:

عدالت میں جب بابر حاضر ہوا، تو بہت تھکا ہوا اور ناراض تھا۔ قبر سے نکل کر آنے میں اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ مر جانے کے بعد بھی اس کے چین میں خلل ڈالا گیا تھا۔ وہ کابل سے چل کر آیا تھا۔ جیسے ہی وہ عدالت میں حاضر ہوا، عدالت نے مُردوں سے پوچھا:

اسے پہچانتے ہو؟

نہیں...... نہی...... ہم نہیں پہچانتے! سارے مُردے بول پڑے تھے۔

یہ بابر ہے! عدالت نے بتایا۔

ایک بھیانک سناٹا وہاں چھا گیا۔

عدالت نے اردلی سے کہا: انہیں ایک کرسی دو!

بیٹھنے کے لئے مجھے اپنا شاہی تخت چاہئے...... آخر میں شہنشاہ ہوں...... ہندستان کا بادشاہ! بابر گرجا۔

تاج و تخت ختم ہو گئے ہیں۔ اب راجا اور بادشاہ بھی نہیں ہیں۔ اب نیتا لوگ اپنی جنتا کے کندھوں یا گردنوں پر بیٹھتے ہیں۔ تم ان کی گردنوں پر بیٹھنا چاہو گے؟ عدالت نے سوال کیا۔

میں تو آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ اب بلایا ہے، تو کہیں بھی بیٹھا دیجئے! بابر بولا۔

ٹھیک ہے، جہاں مرضی ہو بیٹھ جاؤ اور میرے سوالوں کے جواب دو! عدالت نے کہا۔

جی!

تم نے ہندستان پر حملہ کیوں کیا تھا؟

حملہ! تو ایک بادشاہ اور کیا کرتا؟ جب فرغنہ اور بخارا کی میری سلطنت چھن گئی، تو مجھے دوسری سلطنت تو بنانی ہی تھی...... میں نے ہندستان پر کئی حملے کئے، لیکن جیت نہیں پایا۔ آخری بار جب میں جیتا، تو سچائی یہ ہے کہ ہند پر حملہ کرنے اور اسے جیتنے کے لئے مجھے سلطان ابراہیم لودی کے چاچا، پنجاب کے صوبیدار دولت خان اور رنتھن بھور کے ہندو راجپوت رانا سانگا نے بلایا تھا! بابر بولا۔

یہ جھوٹ بات ہے! رانا سانگا کبھی بھی ملک کے خلاف غداری نہیں کر سکتے تھے! ترشول دھاری بولا۔

چپ! عدالت نے اسے جھڑکا۔

اردلی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ترشول چھین لیا۔ یہاں مُردے کی طرح ادب سے بیٹھو! سمجھا! نہیں تو ابھی نیچے بھیج دیا جائے گا...... وہاں پھر مارے جاؤ گے!

ترشول والے کا چہرا خوف زدہ ہو گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

نہیں، میں پھر وہی موت نہیں مرنا چاہتا!

کیوں؟ مرنے سے پہلے تو تم کہا کرتے تھے کہ دس بار نہیں، ہزار بار مرنا پڑے، تو بھی تم رام جنم بھومی کے لئے مرو گے...... اب کیوں ڈر رہے ہو؟ اردلی نے اسے پھٹکارا۔

اس لئے کہ اب میں انسان ہوں...... مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے!

تو جب مرے تھے، اس وقت تم کیا تھے؟

تب میں ہندو تھا!

ہندو کیا انسان نہیں ہوتے؟

ہوتے ہیں، لیکن جب نفرت کا زہر میری نسوں میں دوڑتا ہے، تب میں انسان کا چولا اتار کر ہندو بن جاتا ہوں!

یہ نفرت کا زہر کہاں سے آیا!

اسی سنہ سینتالیس والی فصل سے یہ زہر پیدا ہوا ہے حضور! جو ہندو کو زیادہ بڑا ہندو اور مسلمان کو زیادہ بڑا مسلمان بناتا ہے۔ اردلی بولا۔

میرا وقت برباد نہ کیجئے...... اپنے جھگڑے آپ نپٹایئے۔ بابر نے عاجزی سے کہا۔

لیکن سارے جھگڑوں کی جڑ تو تم ہو۔ نہ تم رام مندر مسمار کرتے، نہ یہ جھگڑے ہوتے! ترشول والا اس بار سنجیدگی سے بولا۔

میرا اللہ اور تاریخ گواہ ہے...... میں نے کوئی مندر مسمار نہیں کیا اور نہ ہندستان میں کوئی مسجد اپنے نام سے کبھی بنوائی۔ اسلام تو ہندستان میں میرے پہنچنے سے پہلے موجود تھا...... کیا ابراہیم لودی خود مسلمان نہیں تھا، جو آگرہ کی گدی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس مسلمان ابراہیم لودی کو ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ کے دن پانی پت میں ہرا کر اس کی سلطنت جیتی تھی۔ اس کا سر کاٹ کر میرے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ میں نے ہمایوں کو تب دلی بھیجا تھا اور میں خود آرام کرنے کے لئے آگرہ چلا گیا تھا۔ آگرہ ہی ابراہیم لودی کی راجدھانی تھی۔[9]

حواشی

۱۔ آسٹین گرین وائل، دی انڈین کنچوشن، کارنر اسٹون آف اے نیشن، کلارنڈن پریس، آکسفورڈ، لندن، ۱۹۶۶، ص ۳۹

۲۔ ڈی۔پی۔یادو، سنسد میں چندر جیت یادو، ایس۔ چاند اینڈ کمپنی، نئی دلی، ۲۰۱۲، ص ۱۴۹۔۱۵۴

۳۔ ۲۱ جولائی ۱۹۷۵ کو چنڈی گڑھ جیل سے جے پرکاش جی نے وزیر اعظم کو لکھے اپنے خط میں بہار تحریک کی تفصیل لکھتے ہوئے ان سے اپیل کی تھی کہ ہندستان کی جمہوریت کو برباد نہ کریں، پریزن ڈائری، ص ا، پوپولر پرکاشن، بمبئی، ۱۹۷۷، ص ۱۰۱۔۱۰۹

۴۔ جے پرکاش نارائن، بہار واسیوں کے نام چٹھی، بہار سروودے منڈل، پٹنہ، ۱۹۷۶، ص ۲۲۔۲۳

۵۔ ایس۔سی۔مشرا، کمیونل رائٹس اِن انڈیا، ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل ریزرو فورس، نئی دلی، ۱۹۷۷، ص XIII

۶۔ ای۔راجندر پرساد، مکتی کے اگردوت، بابو جگجیون رام، جگجیون آشرم ٹرسٹ، نئی دلی، ۲۰۰۶، ص ۴۷

۷۔ ای۔راجندر پرساد، مکتی کے اگردوت، بابو جگجیون رام، جگجیون آشرم ٹرسٹ، نئی دلی، ۲۰۰۶، ص ۴۷

۸۔ وی۔این۔دتا، بی۔ای۔کلیگرون، اے نیشنلسٹ مسلم اینڈ انڈین پولیٹکس، میک ملن، ۱۹۷۴، ص ۲۷۳۔۲۷۴

۹۔ کملیشور، کتنے پاکستان، راجپال اینڈ سنس، دلی، ۲۰۰۲، ص ۶۸۔۶۹

جن دنوں ۱۹۴۷ میں گاندھی جی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہار کی قومی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور دوستانہ ماحول بنانے کی مہم میں بہار میں موجود تھے، مسلم لیگ کے سردار عبد الرب نشتر اور فیروز خان نون بھی پٹنہ میں تھے۔ جے پرکاش نارائن، رینو، گنگا شرن سنگھ اور رام ورکچھ بینی پوری کے ساتھی سوشلسٹوں کے اخبار 'جنتا' سے جڑے احد فاطمی نے سردار نشتر اور فیروز خان نون کی ایک پریس کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ بڑے نپے تلے انداز میں ہندو مسلم فسادات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا " Now we have achieved Pakistan"۔ پریس والوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے واضح کیا تھا کہ مسلم لیگ تو برٹش سرکار اور دنیا کو یہی بتانا چاہتی رہی ہے کہ انگریزوں

کے جانے کے بعد یہ اکثریتی ہندو اقلیتی مسلمانوں کو ان کا جائز حق دینا تو دور انہیں چین سے جینے بھی نہیں دیں گے۔

دو پاٹوں کے بیچ......

ہمیں بھی اقتدار میں حصہ داری چاہئے......

سنا آپ نے، ہمیں بھی اختیار اور وقار کے ساتھ جینے کے مواقع ملنے چاہئے......

ہمیں وہ سہولتیں اور ایسا ماحول بھی چاہئے جہاں ہم مطمئن اور بے خوف ہو کر ملک کی تعمیر میں اپنا سرگرم رول ادا کر سکیں......

ارے! اپنا حق اور حصہ داری مانگتے یہ کون لوگ ہیں......؟

جی، یہ وہی ہندستانی مسلمان ہیں، جن کے اسلاف نے ہندستان کو سونے کی چڑیا ہی نہیں، جنت نشان بنانے میں اپنی پوری زندگی اور صلاحتیں لگا دی ہیں۔......سنہرے حرفوں میں لکھی اپنی تاریخ کے صفحات کے ساتھ ان کے پاس قطب مینار، لال قلعہ، تاج محل اور ہندستان کے سیکڑوں شہروں کے شاندار تاریخی وراثتی آثار کے اوریجنل ماسٹر پلان کے بلو پرنٹ کے ساتھ عظیم آباد کے پیر علی سمیت ان سترہ ہزار شہیدوں کے ناموں کی فہرست بھی ہے، جنہیں ۱۸۵۷ میں میرٹھ سے دلّی تک سڑکوں کے دونوں کناروں کے درختوں پر لٹکا دیا گیا تھا......دلّی اور اودھ کی بیگمات کے آنسوؤں اور بیگم حضرت محل اور زینت محل کے خون سے لت پت اوڑھنیوں میں بندھی بہادر شاہ ظفر کی قبر کی مٹی بھی ہے جو رنگون سے لائی گئی ہے۔ شہید اشفاق اللہ خان، مقبول شروانی اور حولدار عبدالحمید کی شہادت کے سرٹیفکٹ کے ساتھ آزاد ہندستان کا ہمہ جہت خوبصورت آئین بھی ان کے پاس ہے، جو ان کے حقوق کی انہیں ضمانت مہیا کرا رہا ہے۔ ساتھ ہی یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس، ۱۹۴۸، ہندستانی حقوق انسانی اور اقلیتی کمیشن کے دستاویز بھی یہ لائے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ آزاد ہند فوج کے جنرل شاہنواز خان، کرنل اسحاق، کرنل محبوب اور بریگیڈیر عبدالرحمٰن بھی آئے ہیں۔

ہوں......اچھا......اچھا......

''ہمیں بھی اقتدار میں حصہ داری چاہئے''، یہی وہ مانگ رہی ہے، جس نے ملک کے

اقتدار اور وسائل پر اپنا ہی حق ماننے والوں کو کبھی اچھا نہیں لگا ہے (مہابھارت اور کروچھیتر کا المیہ اسی طرح کی کش مکش کی کہانی ہے)۔ جس کسی نے اس سوال کو اٹھانے کی جرأت کی ہے، اسے طرح طرح کی پریشانیاں جھیلنی پڑی ہیں اور اگر وہ ''اقلیت'' رہے ہوں، تو انہیں ملک کا غدار اور فرقہ پرست مان کر اذیت دینا اور بھی آسان ہوا ہے۔ ہندستانیوں کی وہ دوسری بڑی آبادی جو ''مسلمان'' ہے، اس نے جب اپنا حق مانگا، اس سوال پر خود کو منظم کیا، آئینی حقوق کے حصول کے لئے جمہوری طریقے سے یکجا ہوئے، اسے مناسب نہیں مانا گیا، ان پر طرح طرح کے الزام لگائے گئے ہیں۔ آزادی کی لڑائی کے دوران بھی ان کی ایک بڑی تعداد کو "Separatist" (علیحدگی پسند) کہا گیا اور ملک کی تقسیم کا سارا الزام انہیں کے سر تھوپ انہیں مجرموں کی طرح کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں کے ایسے اکثریتی ہندو، جن کے لئے مذہب اور کلچرل قومیت کا لبادہ اوڑھنا ہمیشہ آسان رہا، اس نے اپنے جرموں کو چھپایا اور بڑی ہوشیاری سے اپنے سے بہت کم تعداد والوں کو سوالوں کے گھیرے میں ہمیشہ لاکر کھڑا کیا ہے، کیونکہ اقتدار میں انہیں ان کی جائز حصہ داری دینے کی ان کی ذہنیت ہی نہیں رہی ہے۔

آزادی کے ۶۴ برسوں کے بعد ہندوؤں کے بعد ہندستان کی دوسری اکثریت اور سب سے بڑی ''اقلیتی'' آبادی ''ہندستانی مسلمان'' کو انصاف ملنے کا ابھی بھی انتظار ہو، یہ اپنے آپ ایک افسوسناک المیہ ہے۔ ایسا سلوک ان کے ساتھ کیوں ہوتا آرہا ہے؟ ایک حساس غیر جانبدار شخص اکثر یہ سوال کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اُن مسلم لیگی مسلمانوں کے کئے جرموں کی سزا تو انہیں نہیں دی جا رہی ہے، جنہوں نے اقتدار میں مناسب حصہ داری کے سوال پر پاکستان کا مطالبہ کیا، اور حالات نے انہیں کامیاب بھی بنا دیا، ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اگر اس اندیشے میں کچھ بھی وزن ہے، تو یہ بھی افسوس کی بات ہے...... کرے کون، بھرے کون...... ۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش نے الجھنیں پیدا کی اور ہندستان اور اقتدار کی کش مکش میں سرگرم دونوں پارٹیوں کے کامن دشمن، انگریزوں نے اپنی خطرناک سازش کے تحت ایک چکرویوہ رچا اور ہندستان کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے والے اپنے سیاسی کھیل میں کامیاب ہو گئے اور مخالفت کرنے والے مسلمان اور ہندو دونوں پوری طرح مات کھا گئے، یہ سچائی ہے۔ کیا مات کھائے ہندو یہاں کے

مات کھائے مسلمانوں کو پاکستانیوں کے عوض میں سبق سکھا دینے پر آمادہ ہیں، پچھلے ۶۴ برسوں سے چل رہے کھیل سے یہ شک پیدا ہوتا ہے...... برٹش ماہر سماجیات ایس۔ ہارمین نے ہندستانی مسلمانوں کی بدحالی کے کئی وجوہات میں ایک اہم وجہ ہندوؤں کی اس ذہنیت کو مانا ہے، جس نے صدیوں پہلے ہندوؤں کا مذہب تبدیل کرا اسلام قبول کر لینے اور مسلمان ہو جانے کو صحیح نہیں مانا ہے۔ مذہب تبدیل کرنے والے ان لوگوں کو اور ان کی اولاد کو ہندوؤں نے اب تک معاف نہیں کیا ہے، وہی غصہ بیچ بیچ میں مسلمانوں کے خلاف پھوٹ پڑتا ہے۔[1] وجہ جو بھی رہی ہو، مسلمانوں کی حالت کے مدنظر ہندستان کے حقائق پر نظر رکھنے والے انصاف پسند آدمی کو یہ احساس ضرور ہوتا کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ انگریزوں کے آنے اور یہاں مستحکم ہو جانے کے بعد ان پر پڑی آفتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ ان کے جانے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں اب تک چل ہی رہا ہے۔ ۱۹۳۷ کے بعد حالات کچھ ایسے بنتے گئے، جب مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اقتدار میں مناسب حصہ داری کا سوال حل نہیں ہو سکا اور ملک کے بٹوارے کو ٹالا جانا ناممکن ہو گیا۔ لیکن اس المیہ کو بھی ۶۴ برس ہو گئے۔ تقسیم کے بعد ہندستانی مسلمانوں کی نئی نسل کی دوسری تیسری نسل بھی اس جرم کی سزا جھیلے، جو ان کے باپ دادوں کے سر غلط بنیادوں پر ڈالا جاتا رہا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ناانصافی ہوگی؟ آج بھی جب ایک مسلمان اپنے آئینی حقوق کے لئے سرگرمی سے آواز اٹھاتا ہے، جمہوری طریقے سے منظم ہو کر کوئی پہل کرتا ہے، تو اس پر ''فرقہ پرستی'' اور ''پاکستانی ایجنٹ'' ہونے کا الزام لگتا ہے، طرح طرح کے صحیح اور فرضی ملک مخالف تنظیموں کے ممبر ہونے کے جرم میں انہیں اذیتیں جھیلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ ان متاثروں کی بلبلاہٹ سن کر جب کوئی غیر مسلم مدد کے لئے آگے آتا ہے، تو اس پر ''بے جا پشت پناہی'' (Appeasement) کا الزام لگتا ہے۔ اسی ''بے جا پشت پناہی'' کے الزام میں گاندھی جی مارے جا چکے ہیں۔ اب ''فرقہ واریت'' اور ''بے جا پشت پناہی'' کے ''دو پاٹوں کے بیچ'' میں پس رہے یہ لوگ کیا کریں؟

۶۴-۶۵ برسوں کے آزاد ہندستان میں قابل تعریف حصولیابیوں کے باوجود عام ہندستانیوں کی حالت اچھی نہیں کہی جا سکتی ہے۔ جسٹس سین گپتا کے اندازے کے مطابق یہاں ۱۲۵ کروڑ کی آبادی میں ۷۸ کروڑ لوگوں کی روزانہ کی آمدنی محض بیس روپے ہے۔ ۲۰ کروڑ گھر

ایسے ہیں، جہاں رات میں چولہے نہیں جلتے اور لگ بھگ ۲۵ کروڑ صحت مند پڑھے لکھے نوجوان بیکاری کا عذاب جھیل رہے ہیں۔ عالمی پیمانے کے مطابق بھی ہم تعلیم اور صحت عامہ کے معاملوں میں نچلی پائیدان پر ہی ہیں۔ عوامی شعبوں میں بدعنوانیت کا ملک گیر بول بالا ہے اور غیر اخلاقیات کی باڑھ میں تو ہماری روایتیں اور حصولیابیاں بربادی کے دہانے پر ہیں۔ اس نازک صورت حال کے شکار سب ہندستانی ہیں، اکثریت بھی اور اقلیت بھی۔ لیکن کچھ دنوں پہلے جب اقلیتوں کی حالت کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے تجزیہ کیا گیا، تو ان کی حالت نہایت ہی خستہ نظر آئی ہے۔ گوپال سنگھ، رنگناتھ مشرا اور سچر کمیٹی کی رپورٹوں نے حساس لوگوں کے ہوش اڑا دیے ہیں۔ لوگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نہ سرکار نے مناسب طریقے سے ان کی مدد کی اور نہ سماج نے انہیں ساتھ لے کر آگے بڑھنے میں انہیں سہارا دیا ہے۔ نہ سیکولر حکومت نے اپنی آئینی ذمہ داری نبھائی ہے اور نہ عالمی اخوت کا دعوی کرنے والے ہندستانی سماج نے حساسیت دکھلائی ہے۔

کروڑوں ہندستانیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں نے بھی آزاد ہندستان کا سنہرا خواب دیکھا تھا۔ ملک آزاد ہوگا اور وہ بھی آزاد ہندستان کے خوددار شہری کی طرح بلا خوف جینے کی جدوجہد کرتے آگے کے سفر کو طے کریں گے، اپنے وطن کو سنوارنے اور بنانے میں پہلے کی طرح ہی اپنا رول ادا کریں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ آزادی کے پہلے اور فوراً بعد کے فرقہ وارانہ فسادات اور انتظامیہ کے جانبدارانہ رویوں نے مسلمانوں کے اندر پست ہمتی اور خوف کی ذہنیت پیدا کر دی، وہ اپنی جان مال اور باعزت جینے کی فکر میں چوبیس گھنٹے ڈرے سہمے مبتلا نظر آنے لگے۔ ہندستان کی اس اکائی کو مایوسیوں نے چاروں طرف سے دبوچ لیا ہے جو ملک کے حق میں قطعی نہیں ہے۔

آزادی کی لڑائی کی تاریخ ہندستانیوں کی طویل منظم جدّ وجہد کی تاریخ ہے۔ اس طویل عرصے میں جدّ وجہد کے ساتھ آزاد ہندستان کا سیاسی اور اقتصادی خاکہ بھی تیار ہوتا رہا۔ اسی دوران آزاد ہندستان کے لئے مناسب آئین تیار کرنے کے لئے ۱۹۴۶ میں ہی مجلس دستور ساز کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ملک بھر کے چنندہ بیرسٹر، ماہر تعلیم اور اپنے اپنے شعبوں کے نامی گرامی دانشور آزاد ہندستان کا آئین تیار کرنے میں مستعدی سے لگے تھے۔ آزادی کی لڑائی کے دوران ۱۹۱۶ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے بیچ ہوئے لکھنؤ پیکٹ، مان ٹیگو چیمس فورڈ ریفارمس،

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ اور نہرو رپورٹ ۱۹۲۸ کے تجربوں کے ساتھ دنیا کے اچھے آئینوں کی نظیر سامنے رکھ کر ہندستان کی پلورل سماجی بناوٹ کے مدنظر ایک متوازن آئین تیار کیا گیا اور یہ زمین تیار ہوئی کہ آزادی کے بعد ہندستان ایک سیکولر جمہوری ملک ہوگا۔ یہاں کی پیچیدہ سماجی بناوٹ اور تنوعات کے مدنظر جمہوریت کی کئی شکلوں میں برطانیہ کا ویسٹ منسٹر ماڈل، یعنی بالغان حق رائے دہندگی (Adult Franchise) کی بنیاد پر بنی جمہوریت، ہندستان کے لئے مناسب اور عمدہ متبادل مانی گئی۔ لہٰذا اپنے آئین کے تحت ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو ہندستان ایک سیکولر جمہوری ملک کی شکل میں عالمی برادری میں شامل ہوا۔ ہندستان کی تاریخ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی طرح یہ دوسرا دن بھی تاریخی اہمیت کا دن ہے۔ ۱۵ اگست کو پہلی بار سب ہندستانی غلامی کے بندھنوں سے آزاد ہوئے تھے اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو بلا تفریق مذہب و ملت سب ہندستانیوں کو اپنی تقدیر سنوارنے کے ساتھ اپنی منزل کے طے کرنے کا موقع اور حق ملا۔

ہندستان کے تاریخی حقائق کے پس منظر میں یہاں کے نئے آئین میں ''اقلیتوں'' کے لئے خاص سہولتوں کی رعایت کی گئی۔ ''اقلیتوں'' میں مسلمان، عیسائی، بودھ، جین، سکھ، پارسی، آریہ سماجی، برہم سماجی وغیرہ سب گروپ کے لوگ آتے ہیں۔ لیکن جب ''اقلیتوں'' کی بات ہوتی ہے، تو ہمیشہ وہ ''مسلمانوں'' کی بات ہی ہوتی ہے، کیونکہ عیسائیوں اور پارسیوں کو چھوڑ کر دوسرے گروپ ''ہندو'' سماجی بناوٹ کے ہی ایک حصہ ہیں۔ ''مسلمان'' تعداد کے اعتبار اور تاریخی وجوہات سے اکثریتی ہندوؤں کے مقابلے میں ہمیشہ آمنے سامنے رہے ہیں۔ اقتدار میں حصہ داری کے یہی مضبوط دعویدار بھی رہے، اس لئے ان کے اور اکثریتی ہندوؤں کے درمیان کھینچ تان چلتی رہی ہے۔ تاریخی حقائق کو انگریزوں نے ہمیشہ توڑ مروڑ کر سامنے لایا اور اس کی غلط تعبیر سے دونوں کے رشتوں کو اور الجھا کر فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں نے اپنی پالیسی سے دھیرے دھیرے ایسی حالت بنادی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ساتھ رہنے کو تیار نہیں دکھی اور آخر کار ملک ہی دو حصوں میں بٹ گیا۔ نتیجتاً منقسم آزاد ہندستان میں ''مسلمان'' شک و شبہات کے گھنے گھیرے میں الجھ گئے اور تقسیم کے اسباب سے لاعلم بہت سے ہندوؤں کی ٹیڑھی نظروں نے آج بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ لیکن ہر فیصلہ کن موڑ پر ہندستان کی روایت جلی حروف کی شکل میں ہمیشہ موجود نظر آئی ہے۔ کچھ لوگوں کی تنگ نظر ذہنیت کے باوجود ہندستانی

آئین میں ''اقلیتوں'' کے لئے جو رعایتیں دی گئیں، وہ اپنے آپ وسیع النظری کی لاجواب مثال ہے۔ آزادی کی لڑائی کے دوران گاندھی جی کی لیڈر شپ میں جو ہماری روادار قومی پہچان بنی تھی، ملک کے بٹوارے کے سخت جھٹکے کے باوجود وہ برقرار رہی۔ آزادی ملنے کے بعد ہمارے رہنماؤں کے ہاتھوں میں تعمیرِ ملک کی جب چیلنج بھری ذمہ داری آئی، اس وقت ان میں ایسے لوگوں کی اکثریت رہی، جنہوں نے بٹوارے کے زخموں کے باوجود ہندستان میں ایک مضبوط سول سوسائٹی کے فروغ دینے اور قائم کرنے کے قابل تعریف قدم اٹھائے۔ آج کا سیکولر جمہوری ہندستان ان لوگوں کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔ قانونی نظریے سے بلا کسی تفریق کے ہر ہندستانی کو وقار کے ساتھ جینے اور اپنے مستقبل کے بارے میں منصوبہ بنانے کے ساتھ جدوجہد کرنے کا آئین ضمانت مہیا کراتا ہے۔ آئین پر عمل کرنے کے سلسلے میں کچھ عملی دقتیں ضرور پیش آتی ہیں، لیکن آخر کار دیر یا سویر Rule of Law کو ہی جیت حاصل ہوتی رہی ہے۔

۱۹۲۰ کے بعد کی آزادی کی لڑائی کی تاریخ کو ''گاندھی عہد'' کی تاریخ مانی جاتی ہے۔ گاندھی عہد شروعات ہے اس سنہرے عہد کی، جب پڑھے لکھوں کے ساتھ بلا کسی تفریق کے عام ہندستانیوں کی آزادی کی لڑائی میں شمولیت درج ہوئی ہے۔ یہ وہ دور ہے، جب خلافت کے سوال پر ہندستانی مسلمانوں کے درمیان ملک گیر انگریز مخالف تحریک اپنی بلندی پر ہے اور ہندستان کی سیاست میں گاندھی جی کے سرگرم ہونے کی فضا بن رہی ہے۔ وہ جنوبی افریقہ سے ۱۹۱۵ میں ہندستان لوٹے ہیں اور ۱۹۱۷ میں ہندستان کی سرزمین پر چمپارن میں ان کی پہلی ستیہ گرہ کامیاب ہوئی۔ ۱۹۱۸ میں احمد آباد کے مل ورکرس اور کھیڑا میں ان کے طریقہ کار کے کامیاب تجربے ہو چکے تھے۔ لیکن ہندستان کی سیاست میں ابھی ان کی پہچان نہیں بنی تھی۔ تحریک خلافت کے بڑے رہنماؤں میں مولانا محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ مختلف جیلوں میں بند تھے اور مولانا آزاد رانچی میں نظر بندی کی زندگی گذار رہے تھے۔ اسی سیاسی ماحول میں ہندستان لوٹے مہاتما گاندھی اپنے جنوبی افریقہ کے تجربوں کی روشنی میں مسلمانوں کی شدید بے چینی اور ہندستان کے حالات کا تجزیہ کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی ملک گیر شدت پسند تحریک کو تعمیری رخ دے کر آزادی کی لڑائی کی بنیاد کو وسیع بنانے کی کوشش میں ایک مثبت پالیسی انہوں نے تیار کی۔ ہندو مسلم اتحاد اور آپسی یکجہتی کی طاقت کی بنیاد پر کامیاب ہوئے جنوبی افریقہ کے ستیہ گرہ کا دور رس

تجربہ ان کو تھا۔ اس لئے اسی پالیسی کے تحت یہاں ہندستان میں بھی اپنی مہموں کے لئے سرگرم لوگوں کو ساتھ لینا ہر نظریہ سے مناسب اور کارگر سمجھا۔ مسلمانوں کی ملک گیر بے چینی نے انہیں مسلمانوں کے رضا کاروں پر بنا بنایا ماحول مہیا کرادیا۔ اسی پس منظر میں کانگریس کے خصوصی کلکتہ اجلاس (۱۹۲۰) میں ''خلافت'' کے سوال کو کانگریس پارٹی کا ایجنڈا بنانے کی کوشش کی اور بڑی مشکلوں سے وہاں وہ کامیاب ہوئے تھے۔ تجویز تو منظور ہوگئی، لیکن اس وقت کے بڑے کانگریسی لیڈروں کا جو ردعمل ہوا تھا، وہ کافی دلچسپ ہے۔ ابھی کے فیصلہ کے مطابق کانگریس ایک ایسا قدم اٹھانے جارہی تھی، جس کا بین الاقوامی کردار تھا اور اس کا اثر ہندستان کی سرحدوں سے باہر بھی پڑنے والا تھا۔ اس طرح کے بین الاقوامی ایجنڈے پر کانگریس کے قبل کے اجلاسوں میں کبھی تذکرہ بھی نہیں ہوا تھا، کیونکہ اس کا کینواس ابھی محدود تھا، عوامی مسائل ابھی کانگریس کا ایجنڈا نہیں بنے تھے۔ مشہور مؤرخ اسٹینلی آلپرٹ اس دور کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کلکتہ کانگریس میں گاندھی جی (۱۸۶۹ـ۱۹۴۸) کی جیت ان کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ بنگال کے سرکردہ لیڈر سی۔ آر۔ داس۔ (چترنجن داس ۱۸۷۰ـ۱۹۲۵)، بی۔ سی۔ پال (بپن چندرپال، ۱۸۵۸ـ۱۹۳۲)، مسٹر جناح (۱۸۷۶ـ۱۹۴۸) اور اینی بسنٹ (۱۸۴۷ـ۱۹۳۳) نے تجویز کی شدید مخالفت کی تھی، لیکن مہاتما گاندھی نے علی برادران اور موتی لال نہرو کے تعاون سے اکثریت سے تجویز کو پاس کرالیا۔ خلافتی وفد سے پنڈال بھر گیا تھا اور اس کامیاب انتظام کے پیچھے بمبئی کے مشہور تاجر میاں محمد چھوٹانی کا بڑا اہم رول تھا۔ بھاری اکثریت سے تجویز کے پاس ہوجانے کے بعد کانگریس کے ساختی کردار پر بھی اثر پڑا۔ اب کانگریس ایک مقبول عام پارٹی میں بدلتی نظر آنے لگی۔ کانگریس مارواڑیوں کے ذریعہ حمایت یافتہ متوسط درجے کے ایسے لوگوں کی پارٹی ہوگئی، جس پر ہندو مسلم صنعت کاروں، تاجروں اور ان سے جڑے لوگوں کی گرفت صاف طور پر دِکھنے لگی۔ گاندھی جی نے ۱ اگست ۱۹۲۰ سے ستیہ گرہ کی شروعات کی۔ عجیب اتفاق، اس شروعات سے ایک دن پہلے لوکمانیہ تِلک کا انتقال ہوگیا۔ ایک مذہبی ہندو ہونے کے ناطے تِلک نے ''خلافت'' کو کانگریس کا ایجنڈا بنانے کو نہیں پسند کیا تھا، پہلے ہی حمایت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اینی بسنٹ گاندھی جی پر بھروسہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ مانتی تھی کہ اس تحریک سے لوگوں کے درمیان نفرت بڑھے گی۔ اس لئے گاندھی جی کی پہل کی انہوں نے مذمت کی۔ گوپال کرشن

گوکھلے کے ذریعہ قائم (Servants of Indian Society) میں ان کے جانشیں وی۔ایس۔شری نواس شاستری نے اسے گاندھی جی کا محض ''خواب'' مانا تھا۔فیروز شاہ مہتہ کے شاگرد دین شا واچا گاندھی جی کو ایک متکبر اور سر پھرا شخص مانتے تھے۔ مان ٹیگو چیمس فورڈ نے زندگی بھر گاندھی جی کی ''مہاتمائی سیاست'' کو نہ سمجھا اور نہ پسند ہی کیا، اسے وہ بول شیوک سازش کی کڑی ہی مانتے رہے۔ کلکتہ میں گاندھی جی کی کامیابی کے بعد چیمس فورڈ کے سکریٹری نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کی ناراضگی کی آڑ میں یہ بول شیوک (کمیونسٹ) برسر اقتدار مقامی سرکاروں کے خلاف سازش رچ رہے ہیں اور مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں مسلمانوں کی پان اسلامزم تشدد کا راستہ نہ اپنا لے۔[۲]

یہ انسانی تاریخ کی سچائی ہے کہ سرگرم باحوصلہ شخص اپنے عزائم اور مضبوط قوت ارادی کے بل پر حالات کے رخ ہی نہیں موڑ دیتا ہے، بلکہ نئی تاریخ بھی رچ دیتا ہے۔ کچھ دنوں کے اندر ہی اس ''سر پھرا'' اور ''خیالی سپنا'' دیکھنے والے شخص مہاتما گاندھی نے اسے صحیح ثابت کیا اور اپنی حصولیابیوں سے ہندستان کی تاریخ کا رخ تو بدل ہی دیا، عالمی تاریخ پر بھی اپنی زبردست چھاپ چھوڑی۔ "Game of Scoundrels" مانے گئے اقتدار کی سیاست کو اخلاقی قدروں پر مبنی عوامی خدمت کرتی تنظیم میں بدلا اور ہندستان کی آزادی کی لڑائی کو صداقت، محبت اور عدم تشدد پر مبنی ''ستیہ گرہ'' کے روپ میں ایک بہترین طریقہ کار دیا، جو دنیا کے لئے ایک بے مثال نظیر بنی۔ ''بقائے باہمی'' اور ''جیو'' اور ''جینے دو'' کی بنیاد پر مستحکم طرز زندگی اپنایا اور انہیں اصولوں کو اپنائے ان کی قیادت میں ہندستان آزاد ہوا۔ شکر گذار قوم نے انہیں ''بابائے قوم'' مانا۔ ٹالسٹائی اور ان کے ہمعصر دنیا کے متعدد سرکردہ مفکر گاندھیائی نظریہ اور ان کی شخصیت کی عظمت کے قائل ہوئے اور عظیم سائنسداں آئنسٹائن کو کہنا پڑا کہ '' آنے والی نسلیں بڑی مشکل سے یقین کریں گی کہ گوشت پوست کا بنا کوئی ایسا شخص دنیا میں پیدا ہوا تھا۔'' لیکن عجیب ستم ظریفی رہی کہ برٹش سامراجیہ کو مات دینے والا وہ شخص خود غرضیوں میں ملوث اپنے قریبی پیروکاروں سے ہی مات کھا گیا۔ جس ''سوراجیہ'' رُوپی ہندستان کا خواب انہوں نے دیکھا تھا، وہ تو خواب ہی رہ گیا، ہندستان بھی ایک نہیں رہ سکا، وہ دو حصوں میں بٹ گیا اور ان کے ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کی راہ میں نفرت کے سیلاب نے دقتیں ہی دقتیں پیدا کی۔ ہندستان کی قدیم

تہذیب اور ثقافتی حصولیابیوں پر بے اعتمادی کی پڑی موٹی تہوں سے پیدا ہوئے حالات اور یہاں پنپی تنگ نظری نے ہر قدم پر ان کے لئے رکاوٹیں کھڑی کی اور اپنی زندگی کے آخری پڑاؤ پر وہ اپنے نظریات کی صلیب اٹھائے اکیلے نظر آتے ہیں۔ مایوسی کے اسی ماحول میں المیوں کی اذیتیں جھیلتے دلّی کے لٹے پٹے مسلمانوں کا ایک وفد مولانا حفظ الرحمٰن کی قیادت میں گاندھی جی سے ملا تھا اور مسلمانوں کی دردناک حالت کی تفصیل بتاتے ہوئے ان سے کہا تھا:

باپو! ہم آپ کے سہارے یہاں رہے، لیکن اب تو یہاں کی زمین ہمارے لئے تنگ ہوگئی ہے! ہم پاکستان جانے سے رہے، کیونکہ ہم نے شروع سے ہی اس نظریہ کی مخالفت کی اور انگلینڈ بھی نہیں جائیں گے، کیونکہ ہم نے آپ کی رہنمائی میں اس سے آزادی کی لڑائی لڑی ہے، آپ بتائیں ہم کیا کریں، کہاں جائیں؟

غیر منقسم آزاد ہندستان کے لئے جدوجہد کرتے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنے کو وقف کئے اس شخص کے دل پر اس روداد کو سن کر کیا گذری ہوگی، اس درد کا ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

۱۹۱۶ میں کانگریس اور مسلم لیگ نے لکھنؤ میں Separate Electorate کو بنیاد مان کر ساتھ ساتھ آزادی کی لڑائی لڑنے کا سمجھوتہ کیا تھا۔ بال گنگا دھر تلک (۱۸۵۶۔۱۹۲۰)، گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶۔۱۹۱۵)، مدن موہن مالویہ (۱۸۶۱۔۱۹۴۶) اور محمد علی جناح (۱۸۷۶۔۱۹۴۸) نے اس سمجھوتہ کو آخری شکل دینے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ میں مسٹر جناح نے بمبئی علاقائی کانفرنس کے احمد آباد اجلاس کی صدارت کی تھی۔ اپنے صدارتی خطبہ میں انھوں نے کہا تھا:

''میں سمجھتا ہوں صحیح سوچ رکھنے والے سب لوگ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ہماری ترقی کا راز ہندستان کے دونوں خاص فرقوں کے آپسی دوستانہ رشتوں اور اتحاد میں پوشیدہ ہے۔ دونوں کے اتحاد کی اولیت پر ہمیں توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس مسئلہ کا حل زیادہ مشکل نہیں ہے۔

''میں اپنے اکثریتی ہندو دوستوں سے اپیل کرونگا کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں کھلے دل سے روادارو رویہ اپنائیں اور Separate Electorate کے سوال پر اپنے مخلصانہ اور ہمدردانہ رخ کا ثبوت دیں۔ سوال اقتدار کی منتقلی کا ہے، ہمیں بیوروکریسی سے ڈیموکریسی کی

طرف بڑھنا ہے۔ ہمیں سر دست اسی مسئلہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد بنائے رکھتے ہوئے ہمیں آئینی متبادلوں کو اپنا کر آگے بڑھنا ہے، تاکہ جلد سے جلد اقتدار کی منتقلی ممکن ہو سکے۔ ہم صحیح اور سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور مراد مانگی منزل سامنے ہے۔ آگے بڑھے چلیں، نیا ہندستان ہماری منزل ہے۔''[۳]

''ہندو'' اور ''مسلمان'' پشتہا پشت سے ایک ساتھ رہے ہیں، ہر سرد اور گرم کو ساتھ ساتھ جھیلا ہے۔ آزادی کی لڑائی میں ساتھ ساتھ اپنا فرض نبھایا ہے، لیکن اقتدار میں حصہ داری کے سوال نے حالات کو الجھا دیا، کیونکہ ہم نے رواداری کی جگہ اپنی انا اور خود غرضیوں کو ترجیح دے دی۔ نتیجتاً یہاں کی دو اہم اکائیاں ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنتی گئی۔ حالت ایسی بن گئی کہ کچھ لوگوں کو ان کا ساتھ رہنا بھی گوارا نہیں ہوا اور ملک تقسیم ہو گیا۔ ہندستان میں ہندستانی مسلمان اور پاکستان میں پاکستانی ہندو، سکھ اور دوسری چھوٹی مذہبی اکائیاں اپنے ملکوں میں ''اقلیت'' ہو گئی اور ان کی آزمائشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہندستان نے اپنی پلورل سماجی بناوٹ کے مدنظر بین الاقوامی سطح کا اپنا آئین بنایا اور یہاں کے ہر باشندہ کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی۔ ''اقلیتوں'' کی حساس اور کمزور حالت کے مدنظر آئین میں انہیں کچھ خاص رعایتیں بھی دی گئیں۔ لیکن جب ان رعایتوں پر عمل درآمد کی پیش قدمی ہوئی، تب بات الجھی ہے۔ ''اقلیتوں'' کو ان کی جائز سہولتوں کو مہیا کرانے کی پہل کے دوران جرم کی حد تک ان کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ سرکاری مشنری، جسے آئینی رعایتوں کا فائدہ ''کمزور طبقہ'' اور ''اقلیتوں'' تک پہنچانے کا نظم کرنا ہے، عام طور پر اپنی ذمہ داریوں کے تئیں اس میں نہ احساس ذمہ داری ہے اور نہ ''اقلیتوں'' کے تئیں حساسیت اور ہمدردی۔ اب تک کے تجربے واضح کرتے ہیں کہ الٹے وہ جرم کی حد تک کوشش کرتے رہے ہیں کہ ''اقلیتوں'' تک آئینی سہولتوں کے فائدہ پہنچ ہی نہیں سکے۔ اس افسوسناک امتیازی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ آہستہ آہستہ مسلمان حاشیے پر آ گئے ہیں اور انہیں سماج کے لئے "Unwanted Element" (ناپسندیدہ عنصر) بنایا جا رہا ہے۔ کٹر ذہنیت سے متاثر عناصر بھول جاتے ہیں کہ ہماری جمہوریت چھ عشروں کی دھوپ چھاؤں کے تجربے حاصل کر اکیسویں صدی کے چیلنج سے روبرو ہے۔ ہم گلوبلائزیشن کے دور سے گذر رہے ہیں اور دنیا کی نظریں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی جانب، یعنی

ہماری جانب، لگی ہوئی ہے۔ ہم پختگی کے جس مقام پر پہنچ گئے ہیں، وہاں اب سماج کے کسی طبقہ کو اس کے قانونی حقوق اور سہولتوں سے محروم رکھنا نہ مناسب ہے اور نہ ہی ممکن۔ لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ آج بھی لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ اپنے ساتھ کی جا رہی ناانصافیوں کے خلاف جب یہ ''اقلیت'' آواز اٹھاتی ہے، اپنے مطالبات کو لے کر جمہوری پہل کرتی ہے، سڑکوں پر اترتی ہے، تو ''فرقہ واریت'' کا الزام لگتا ہے اور اگر غیر مسلموں نے ہمدردی دکھائی تو ''بے جا پشت پناہی'' (Appeasement) ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی ہے۔ ''اکثریتی'' ہندوؤں کے وہ فرقہ پرست عناصر، جو انسانیت مخالف ذہنیت، 'فاشزم' سے متاثر ہے، اس کا مسلمانوں کے بارے میں سوچ ہمیشہ غیر مناسب رہی ہے، وہ چاہتے رہے ہیں کہ یہاں کے مسلمان بے آسرا، محتاج اور دو نمبر کے شہری بن کر رہیں۔ یہ سوچ ہندستان کی اپنی ثقافتی روایتوں اور قانونی اور انسانی ترجیحات کے خلاف ہونے کے ساتھ اکیسویں صدی کے تقاضوں کی بھی نفی کرتی ہے۔

۱۹۳۷ میں آزادی کی پہلی قسط ملی اور اقتدار کی لذت حاصل کرنے کے مواقع کی شروعات بھی ہوئی تھی۔ اسی وقت سے مختلف فرقوں کے درمیان اقتدار میں حصہ داری کی کش مکش تیز ہوئی۔ آزادی کے بعد تو وہ مستقل مسئلہ بن گیا، کیونکہ اقتدار کی سیاست ووٹ کی سیاست بن کر ایک شخص ایک ووٹ کے ارد گرد گھومنے لگی۔ ''اقلیتوں'' کے ساتھ کیا سلوک ہو، اس سوال پر لوگ شروع سے محتاط نظر آتے ہیں، کیونکہ اس بڑی آبادی کو نظر انداز کرتے کوئی نظام کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ ۱۹۳۷ کے الیکشن کے نتیجے میں جب کانگریس ۱۱ صوبوں میں سرکار بنانے کی پوزیشن میں تھی، تو لوگ سمجھ رہے تھے کہ حالات کے مد نظر ایک یا دو صوبوں میں وزیر اعلیٰ ''اقلیتوں'' میں سے بھی ضرور ہوگا، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ اس وقت بمبئی پریسیڈنسی اور بہار دو صوبے ایسے تھے، جہاں کانگریسی ''اقلیتوں'' کا رول بڑا اہم تھا۔ وزیر اعلیٰ (جو اس وقت وزیر اعظم / پریمیر کہلاتے تھے) کے الیکشن میں کانگریس نے وہاں بھی ''اقلیتوں'' کو وہ موقع نہیں دیا۔ اس کا رد عمل اچھا نہیں ہوا۔ لوگوں نے اسے کانگریسیوں کی فرقہ وارانہ ذہنیت مانا۔ کانگریس کے اہم لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد اور کئی سرکردہ دانشوروں نے کانگریس کے رویے پر شدید اعتراض کیا تھا۔ بمبئی میں کے۔ ایف۔ نریمن کی ہمہ جہتی شخصیت بڑی مقبول تھی، پارسیوں کے بڑے لیڈر تو تھے ہی، وہاں وہ کانگریس کی جان مانے جاتے تھے۔ لیکن انہیں پریمیر نہ بنا کر بی۔ جی۔ کھیر کو پریمیر بنایا گیا۔

اور بہار میں سنئیر لیڈر، جواہر لال نہرو کے انگلینڈ کے ساتھی رہے ڈاکٹر سید محمود کو موقع نہ دے کر ڈاکٹر شری کرشن سنگھ، جو سنٹرل اسمبلی کے ممبر چنے گئے تھے، کو پریمیر بنایا گیا۔ اس موضوع پر مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "India Wins Freedom" میں کہتے ہیں:

''کے۔ ایف۔ نریمن بمبئی میں کانگریس کے سب سے مقبول لیڈر تھے اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ انہیں ہی پریمیر بنایا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک پارسی وزیر اعلی ہوتا اور باقی ہندو ان کے معاون۔ سردار پٹیل کو یہ بات پسند نہیں آئی، انہوں نے کہا کہ یہ ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس لئے بی۔ جی۔ کھیر کو وزیر اعلی بنایا گیا۔ نریمن نے اس ناانصافی کے خلاف جواہر لال نہرو اور گاندھی جی سے بھی اپیل کی تھی، لیکن انہیں وہاں بھی انصاف نہیں مل سکا۔ نتیجتاً ان کی سیاسی زندگی ہی ناانصافی اور مایوسیوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ٹھیک اسی طرح کا واقعہ بہار میں بھی دیکھنے میں آیا۔ جب الیکشن ہوا تھا، تو ڈاکٹر سید محمود بہار کانگریس کے معزز لیڈر تھے۔ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ الیکشن میں کانگریس نے اکثریت حاصل کی تھی اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ ڈاکٹر سید محمود وزیر اعلی ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر شری کرشن سنگھ اور ڈاکٹر انوگرہ نارائن سنگھ جو سنٹرل اسمبلی کے ممبر تھے، انہیں واپس بہار بلایا گیا اور ڈاکٹر شری کرشن سنگھ کو وزیر اعلی کے لئے تیار کیا گیا۔ بمبئی میں سردار پٹیل نے جو رول ادا کیا تھا، بہار میں ڈاکٹر راجندر پرساد نے وہی کیا۔ بمبئی اور بہار میں ایک فرق یہ رہا کہ ڈاکٹر شری کرشن سنگھ کی بنی حکومت میں سید محمود کو وزارتی کونسل کا ایک ممبر بنایا گیا، لیکن بمبئی میں نریمن حاشیے پر ڈال دیے گئے۔

''ان دونوں واقعات کا قومی زمانہ اچھا اثر نہیں پڑا۔ بڑے دکھ اور افسوس سے ماننا پڑتا ہے کہ کانگریس کی قومیت ابھی تک پختہ اور غیر جانبدار نہیں ہو سکی تھی۔ وہ فرقہ وارانہ جذبات سے بھی اوپر نہیں اٹھ سکی تھی۔ ''اکثریت'' اور ''اقلیت'' ہونے کی بنیاد پر فیصلے لئے جاتے تھے، اہلیت اور صلاحیت فیصلے کی بنیاد نہیں۔''[۴]

۱۹۳۷ کے الیکشن میں جیت کے بعد جب کانگریس نے کچھ اعتراضات کے مدنظر بہار میں سرکار بنانے سے انکار کر دیا تھا، تو اس وقت بہار میں ایک دلچسپ سرگرم سیاسی نظارہ دیکھنے میں آیا۔ گورنر نے سرکار بنانے کا متبادل راستہ ڈھونڈتے ہوئے بہار اسمبلی میں دوسری بڑی پارٹی

مسلم اینڈ پینڈنٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر محمد یونس کو سرکار بنانے کی دعوت دے دی۔ مسٹر یونس نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ بہار کے پہلے پریمیر کے روپ میں ۲۴ مارچ ۱۹۳۷ کو حلف لیا۔ ان کی وزارتی کونسل کے ممبر تھے گرو سہائے لال، کمار اجیت پرساد سنگھ دیو اور عبدالوہاب خان۔ اس غیر متوقع سیاسی پہل کی کانگریس نے زبردست مخالفت کی۔ جے پرکاش نارائن کی قیادت میں ایک مشتعل بھیڑ نے پریمیر رہائش کے سامنے اپنا زبردست احتجاج درج کرایا۔ اس موقع پر جے پرکاش نارائن سمیت بہت سے لوگ گرفتار ہوئے تھے۔ حلف لینے کے بعد مسٹر یونس کی سرکار نے جو پہلا فیصلہ لیا، وہ تھا، گرفتار کئے گئے لوگوں کی باعزت رہائی۔ لگ بھگ ساڑھے تین مہینے کے بعد جب کانگریس سرکار بنانے کو راضی ہوگئی تو محمد یونس نے استعفیٰ دے دیا اور ڈاکٹر شری کرشن سنگھ کو کانگریسی پریمیر کے طور پر ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ کو حلف دلایا گیا۔ نئی کانگریسی سرکار نے سابق پریمیر محمد یونس کے بارے میں کچھ ایسے مخاصمانہ قدم اٹھائے، جن کا بہت غلط سگنل بہار ہی نہیں پورے ملک میں چلا گیا۔ محمد یونس کی اپنی ملکیت فتوحہ۔ اسلام پور لائٹ ریلوے کو کئی سنگین الزام لگاتے ہوئے سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ ان کے کمرشیل بینک اور انشورنس کمپنی پر بھی کئی طرح کے مقدمے دائر کئے گئے، نتیجتاً انہیں بھی بند کردینا پڑا۔ مسٹر یونس کو گھر میں نظر بند سا کر دیا گیا اور ان کی پارٹی کے ممبروں کو بھی مختلف طریقوں سے پریشان کیا گیا، جسے مسلمان تو الگ انصاف پسند ہندوؤں نے بھی پسند نہیں کیا تھا۔[5] اس واقعہ نے تو بہار کی سیاست کی تصویر ہی بدل دی۔ اس وقت بہار کانگریس نے جو رویہ اپنایا (ہوسکتا ہے مرکزی تنظیم کی تائید بھی اسے حاصل ہو) اس سے وہ ذہنیت اجاگر ہوتی ہے کہ ''اقتدار'' کی حقدار صرف اور صرف ''کانگریس'' ہی ہے، کوئی اور نہیں۔ مسٹر محمد یونس کی پارٹی کا سرکار بنانا کانگریسیوں کو کسی حال میں نہیں پسند آیا۔ بعد کے دنوں میں اس جرأت کی سزا طرح طرح سے انہیں دی جانے لگی، جس کا برا نتیجہ کانگریس کو بہت جلد بھگتنا پڑا۔

۱۹۳۷ میں بہار میں مسلم لیگ ایک پارٹی کی حیثیت سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی تھی۔ لیکن ۱۹۳۷ کے یوپی اور بہار کے واقعات نے مسلمانوں کے درمیان اس کی پہنچ کی فضا بنادی اور ۱۹۴۶ تک آتے آتے وہ کانگریس کے سامنے مضبوطی کے ساتھ آکر کھڑی ہوگئی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت ۱۹۳۷ میں Separate Electorate کی بنیاد پر ہوئے الیکشن

میں بہار میں مسلمانوں کے لئے محفوظ ۴۰ سیٹوں میں ایک سیٹ پر بھی مسلم لیگ نہیں آئی تھی، کیونکہ یہاں اس کی عوامی بنیاد ہی نہیں تھی۔ کانگریس اقتدار میں آئی، لیکن اس نے مسلمانوں کی اقتدار میں حصہ داری کے سوال پر مسلمانوں کو بہت مایوس کیا۔ اس منفی عمل کا مسلم لیگ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کو بہار میں منظم اور مضبوط کیا۔ نتیجتاً ۱۹۴۶ کے الیکشن میں ۴۰ میں سے ۳۶ سیٹوں پر مسلم لیگ کو کامیابی ملی اور پاکستان کا مطالبہ کرنے والی پارٹی بہار میں مضبوطی سے ابھری اور سرگرم ہوئی۔ ۱۹۳۷ کے الیکشن کے نتیجے میں مختلف صوبوں میں کانگریس کی بنی سرکاروں کی کارکردگی حزب مخالف مسلم لیگ کے اعتراضات کے نشانے پر رہی۔ اقتدار سے محروم رہنے کی کسک نے لیگی لیڈروں کو کانگریس سرکار کے خلاف سرگرم کر دیا۔ اسی ماحول میں ۱۹۳۸ میں پٹنہ میں مسٹر جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تھا۔ جناح صاحب کی مدلل باتوں نے اقتدار سے محروم مسلمانوں کے اندر اپنے جائز حقوق کے حصول کے لئے چاہت پیدا کر دی اور جب ۱۹۴۶ میں الیکشن ہوئے، اس کا چونکا دینے والا نتیجہ سامنے آیا، مسلم لیگ کافی مضبوط ہو کر سامنے آئی۔ اسمبلی میں ۴۰ میں سے ۳۶ سیٹیں تو مسلم لیگ کو ملی ہی، پورے صوبے میں مسلمانوں کے درمیان مسلم لیگ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس نئی صورت حال کا اثر کانگریس کے نیشنلسٹ مسلمانوں پر پڑا تھا اور کانگریس کو الگ سے مسلم رابطہ کمیٹی بنانے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس سرور علی نے مجھے بتایا تھا کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۳۸ کے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں وہ موجود تھے، جسے مسٹر جناح نے مخاطب کیا تھا۔ جناح صاحب نے وہاں بڑے پرسکون انداز میں کہا تھا:

''ابھی ابھی آزادی کی پہلی قسط ہمیں مل چکی ہے۔ اب ہندستان آزاد ہو کر رہے گا، دنیا کی کوئی طاقت اب آزادی کو روک نہیں سکے گی۔ ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی آزاد ہوں گے۔ آگے انہوں نے ڈرامائی انداز میں مجمع سے پوچھا:

امریکہ آزاد ہے، لیکن سب حقوق سے محروم وہاں کے کالے نیگرو کیا آزاد ہیں......؟

جلسے میں موجود لوگوں نے ایک سُر میں کہا نہیں، وہ آزاد نہیں ہے۔ جناح صاحب نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا...... آپ سب کی بھی وہی حالت ہوگی۔ یہ کانگریسی ہندو آپ کے مالک ہوں گے اور آپ ان کے ماتحت...... تیر نشانے پر لگ چکا تھا، مسلم لیگ زندہ آباد، قائد

اعظم زندہ آباد، کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کس طرح ۱۹۳۵ کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ میں ہوئے الیکشن کے نتیجے ہندستان کے لئے فیصلہ کن موڑ(Turning Point) ثابت ہوئے۔ ۱۹۱۶ کے لکھنؤ پیکٹ کے بعد کانگریس اور لیگ کا اتحاد چلتا رہا تھا۔ مسلم لیگ نے اس ایڈجسمنٹ (Adjustment) کے تحت اپنی زمین پھیلانے اور اپنے کو مضبوط بنانے پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ مسلمانوں کے لئے ''محفوظ سیٹ''(Reserve Seat) کو ہی مسلمانوں نے اپنے لئے مناسب متبادل سمجھا تھا۔ ۱۹۳۷ کے الیکشن کے نتیجے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے محفوظ سیٹوں پر لیگ کے ممبر نہیں، کانگریس اور اس کی معاون تنظیموں کے لوگ بھی کامیاب ہوئے تھے۔ مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلم لیگ کی حالت اور بھی خراب رہی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے، پنجاب اور بنگال میں سرکاریں مسلم لیگ کی نہیں، دوسری پارٹیوں کی بنی تھی۔ پنجاب میں سکندر حیات خان کی یونینسٹ پارٹی، بنگال میں فضل حق کی کرشک پرجا پارٹی اور سرحدی صوبوں میں ڈاکٹر خان صاحب اور عبد الغفار خان کی خدائی خدمتگار کا بول بالا رہا۔ الیکشن کے نتیجے نے جواہر لال نہرو کی ''انا''(Ego) کو اور بڑھا دیا تھا، مسلم لیگ کے سلسلے میں وہ زیادہ ہی بے لچک اور حسابی نظر آنے لگے۔ اب مسلم لیگ اور اس کے لیڈر مسٹر جناح کی حیثیت ان کی نظروں میں کچھ رہی ہی نہیں۔ اتر پردیش میں کانگریس اور لیگ نے ایک سمجھوتہ کے تحت الیکشن لڑا، لیکن جیت کے بعد وزارتی کونسل میں مسلم لیگ کے دو وزیروں کے مطالبہ کی جگہ ایک لیگی وزیر پر جواہر لال راضی ہوئے اور حالات الجھ گئے۔ حالات کو سلجھانے کے لئے مسٹر جناح نے بی۔ جی۔ کھیر کو گاندھی جی کے پاس بھیجا تھا، لیکن وہ بھی کچھ نہیں کر سکے، خاموش رہ گئے۔ اس الجھے سوال پر گاندھی جی کے پوتے مشہور مصنف راج موہن گاندھی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: گاندھی جی کے سکریٹری کے مطابق نہرو اور پٹیل، جناح سے نمٹنے کو مشکل مسئلہ مان رہے تھے۔ اس لئے ان سے دوری بنائے رکھنا ہی ٹھیک سمجھا۔ پیارے لال نے اس پالیسی کو کانگریسی پالیسی کی بھیانک غلطی مانی ہے۔[۶] اس وقت اقتدار میں مسلمانوں کی مناسب حصہ داری کے انکار سے جو حالت بنی، وہ الجھتی ہی گئی اور ملک کے بٹوارے پر آکر تھمی۔

دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک ہندستان میں سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے، ایسے دعووں میں وزن نہیں ہے۔ موجودہ حالات واضح کرتے ہیں کہ آزادی کے بعد اپنائی گئی اقتصادی ترقیاتی پالیسی بہت سی حصولیابیوں کے باوجود ہندستان کو مناسب فائدہ نہیں پہنچا سکی ہے۔ اچھی نیت سے مغربی طرز پر ترقی کے منصوبے بنے اور ان پر عمل بھی کیا گیا، لیکن من چاہی مراد حاصل نہیں ہو سکی۔ ایک رپورٹ کے مطابق آج ہر ایک ہندستانی ۳۳ ہزار روپیوں کا قرض دار ہے اور ۷۸ کروڑ لوگوں کی روزانہ آمدنی محض بیس روپے یومیہ ہے۔ یہاں ۲۰ کروڑ گھروں میں رات میں چولہے نہیں جلتے اور لگ بھگ ۲۵ کروڑ پڑھے لکھے تندرست نوجوان بیکار ہیں۔ ان میں اکثریت بھی ہیں اور اقلیت بھی، ہندو بھی ہیں، مسلمان اور دوسرے مذہبی پہچان والے بھی۔ دنیا کے غریب ترین ملکوں میں ہندستان بھی ایک ہے اور بھوک، ناخواندگی اور صحت کے معاملے میں بھی آخری سیڑھی پر ہی اس کی جگہ ہے۔ ایسا نہیں کہ ہم نے ترقی نہیں کی ہے، لیکن ان حصولیابیوں سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کی تعداد محدود ہے۔ ہمارے ترقیاتی ماڈل کا فائدہ بیشتر اوپری پندرہ بیس فیصد لوگوں تک ہی سمٹا ہوا ہے، جس کی وجہ سے سماجی تانا بانا کافی الجھ رہا ہے۔ منفی حالات کو تو سب ہندستانی جھیل رہے ہیں، لیکن محروم طبقہ کو کچھ زیادہ ہی بھگتنا پڑ تا رہا ہے۔ چونکہ ہندستانی مسلمان اقتصادی اور تعلیمی نہج سے بہت کمزور ہیں، اس لئے انہیں یہاں کے حالات کچھ زیادہ ہی رُلا رہے ہیں۔

آزادی کی لڑائی کے دوران ایک آزاد، خوددار، خود کفیل، ترقی یافتہ ملک ہندستان کا خواب دیکھا گیا تھا۔ آزادی ملنے سے پہلے ہی اس کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ ایک اچھے آئین کے خاکہ کی تیاری ہوئی، جو آزادی کے بعد ۱۹۵۰ میں اپنایا گیا۔ ہندستان کی پلورل سماجی بناوٹ کے مدنظر یہاں کا آئین تیار ہوا اور مغربی روادار قدروں پر مبنی سیکولر اسٹیٹ ہمارے لئے مناسب سمجھا گیا، لیکن ہندستانیوں کے مذہبی اعتقادات کو ایک دم خارج نہیں کیا گیا۔ تمام مذاہب کا احترام ہی یہاں کی سیکولرزم کی بنیاد مانی گئی۔ اسٹیٹ کا کوئی مذہب نہیں ہوگا، اسے واضح کیا گیا۔ ہندو اکثریت والے ملک میں سیکولر آئین کو اپنانا اپنے آپ میں ایک قابل تعریف انقلابی قدم تھا۔ یہی نہیں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب کی نشر واشاعت کا حق بھی دیا گیا۔ آئین کی رعایتوں کے مدنظر ''اقلیتوں'' کے لئے فراخ دلی دکھائی گئی اور اتنا کچھ دینے کی ضمانت

دی گئی کہ کسی طرح کی تفریق اور بدحالی کے شک کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ لیکن، جب ان رعایتوں پر عمل درآمد کی بات آئی، تو عمل درآمد کرنے والی مشنری اور اسے لاگو کرنے والے افسران کی تنگ نظری بڑے لطیف طریقے سے کام کرنے لگی۔ یہی حالت رہی سیکولرزم کو حقیقی شکل میں پیش کرنے کی بھی۔ اسے بدقسمتی ہی کہیں گے کہ براہ راست ''سیکولرزم'' پر چوٹ پڑنے کی شروعات راشٹرپتی بھون سے ہوئی۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی مرضی کے خلاف فی زمانہ صدر ڈاکٹر راجندر پرساد نے سومناتھ مندر کی تجدید کاری میں نہ صرف پوری دلچسپی لی تھی، بلکہ اس کا افتتاح بھی خود انہوں نے ہی کیا۔ سر سے پانی اس وقت اوپر ہو گیا، جب عالی جناب صدر نے بنارس کے پنڈوں کے پاؤں دھوئے۔[۸] سرکاری تقریبات کی شروعات بھی عام طور پر ہندو مذہبی طریقوں کے مطابق ہی ہونے لگی اور اکثر ہمارا ''سیکولرزم'' آئین کے دفعات میں ہی سمٹا رہا، اس کی زینت ہی بڑھایا۔ ڈرے سہمے مسلمانوں کے اندر اتنی ہمت کہاں تھی کہ اپنے لئے بُرے دنوں کی آمد کے ان اشاروں پر کچھ آواز اٹھا سکیں۔ لیکن ان قدموں کو ''سیکولرزم'' میں یقین رکھنے والوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ مجاہد آزادی سوشلسٹ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، ڈاکٹر امبیڈکر اور دوسری ترقی پسند افراد نے ان قدموں کی سخت مخالفت کی۔ صدر جمہوریہ کے ذریعہ اٹھائے گئے قدموں کو انہوں نے سیکولر ہندستان کے لئے بہت ہی شرمناک قدم مانا۔ ان دنوں سے ہی ''اکثریت'' اکثریت ہیں اور ''اقلیت'' اقلیت، یہ اشارے لوگوں کو ملتے رہے ہیں۔

اپنے وقت کے مشہور وکیل، بیرسٹر، سماج سیوی، ماہر اقتصادیات اور قانونی نکتوں پر گرفت رکھنے والے تجربہ کار لوگ مجلس دستور ساز کے ممبر تھے۔ انہوں نے "Full Proof" آئین بنانے کی کوشش کی تاکہ آزاد ہندستان کا ہر فرد قانونی حیثیت سے خود کو محفوظ محسوس کرے۔ ایک ایسے قانون داں کو ڈرافٹنگ کمیٹی کا صدر بنایا گیا تھا، جسے ہندستانی سماج کی پیچیدگیوں کی پوری جانکاری تو تھی ہی، اسے امتیازی سلوک کرنے والی سماجی دقیانوسیوں کو بھی ذلیل کئے جانے کی حد تک جھیلنا پڑا تھا۔ لہٰذا آئین میں ''کمزور طبقوں'' اور ''اقلیتوں'' کے تحفظ اور ان کے حقوق کی ضمانت دئے جانے پر بڑی مستعدی دکھلائی گئی تھی۔ آئین Broadbased اور ہندستانی سماج کے ہر طبقہ اور فرقہ کی آرزؤں کا ترجمان بھی ہو، اس کی بھی پوری کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں لبرل (روادار) سوشلسٹ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا بھی اہم رول رہا۔ ہندستان

میں اس وقت کے امریکی سفیر چیسٹر باؤلس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا مسلمانوں کے بارے میں سب سے اہم قدم ہندستان کو ایک سیکولر اسٹیٹ بنانا تھا، تاکہ پاکستان نہیں جانے والے ۴۵ ملین مسلمان امن چین کی زندگی یہاں جی سکیں، یہ ضمانت انہیں ملی۔''[۹۹]

گاندھی جی کی زندگی میں مجلس دستور ساز اسمبلی کا قیام ہو چکا تھا۔ ان کی رضامندی کی مہر لگ چکی تھی کہ آزاد ہندستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہوگا اور یہاں ایک آدمی، ایک ووٹ کی بنیاد پر جمہوریت قائم ہوگی، تاکہ ہر ہندستانی اپنے حقوق کے بارے میں مطمئن رہے۔ ''سوراجیہ'' آزادی کی لڑائی کی منزل رہی اور اس منزل پر پہنچنے کے لئے'' جمہوریت'' پہلی سیڑھی مانی گئی تھی۔ لیکن آئین بنے اور وہ نافذ ہو، اس سے پہلے ہی گاندھی جی مار ڈالے گئے۔ جواہر لال نہرو نے ان کے اسی سوچ کو اپنے نظریات کے مطابق آگے بڑھایا، خلا (ویکیوم) نہیں پیدا ہوا۔

''فرقہ واریت'' کی سیاست نے ہندستان کو بٹوارے کی حدوں تک پہنچایا تھا۔ بٹوارے کے زخموں سے چور ہندستان اپنی تعمیر کے تانے بانے کو درست بنانے کی چنوتیوں کو جھیلتے اسی'' فرقہ وارانہ مسائل کے حل کرنے کو اولیت دے رہا تھا۔''فرقہ واریت'' نے ماحول کو کچھ اس طرح بگاڑ دیا تھا کہ کچھ لوگ اس خیال کے ہو گئے تھے کہ ہندو مسلم آبادی کو پوری طرح تبادلہ (Exchange of Population) کر لیا جائے، تاکہ یہ سوال ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اس خیال پر جواہر لال نہرو کا بڑا تلخ ردعمل ہوا تھا۔ انہوں نے ۱۹۵۰ میں پارلیامنٹ میں بڑی وضاحت سے کہا تھا:

''اس طرح کے مشورے عالمی برادری کے سامنے ہمیں شرمندہ کرنے والے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم تنگ نظر ذہنیت سے متاثر ایسے دقیانوسی پونگا پنتھی لوگ ہیں، جو جمہوریت کی باتیں تو کرتے ہیں، لیکن دنیا اور اس عظیم ملک کے بارے میں مثبت انداز میں سوچنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ ایسی سوچ کے مطابق ہمیں اپنے اہل وطن سے کہنا ہوگا کہ ہم تمہیں اس لئے ملک سے نکال باہر کر رہے ہیں کہ تمہارے مذہبی عقائد ہم سے الگ ہیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے، تو اس کا مطلب ہوگا اپنے قدروں کی خلاف ورزی۔ ہندستان کا آئین ہمیں دقیانوسی ذہنیت اختیار کرنے اور پونگا پنتھی رویہ اپنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''[۱۰۰]

اس میں شک نہیں کہ ہمارے معماران قوم نے خلوص کے ساتھ ہندستان کی تعمیر نو کی پہل کی اور ''اقلیتوں'' کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت کو برقرار رکھنا چاہا۔ اس عمل میں کچھ لوگوں پر ''مسلم پشت پناہی'' (Appeasement) کا الزام بھی لگایا جاتا رہا ہے۔ لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان سب قواعد اور اعلانات کے باوجود آزادی کے بعد مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں پچھڑتے ہی چلے گئے اور خود سرکاری رپورٹ کے مطابق وہ دلتوں سے بھی بُری حالت میں پہنچ چکے ہیں۔ حالات کی نزاکت سے حساس لوگ کافی پریشان ہیں۔ حالات کے تھپیڑوں نے مسلمانوں کو بہت حد تک ناانصافیوں کو جھیلنے کا عادی ضرور بنا دیا ہے، لیکن وہ پست ہمت نہیں ہوئے ہیں۔ ہندستان کے بٹوارے کے سلسلے میں مستند دستاویزی ثبوتوں کی روشنی میں ان کے ''واحد'' ذمہ دار مجرم ہونے کے الزام سے بری ہونے کی ملی راحت نے ان کے اندر باعزت جینے کی جستجو اور ہمت پیدا کر دی ہے۔ بنگلہ دیش کے بن جانے کے بعد ان کی ہجرت کے رجحان پر روک لگی اور یہیں جینے مرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ وہ اپنے حقوق کے بارے میں بیدار ہوئے ہیں اور احساس کمتری کے گھیرے کو توڑ کر انہیں حاصل کرنے کی جدوجہد میں آگے آئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی ابھی آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔ اپنے حقوق کے لئے ان کی جدوجہد پر کسی نہ کسی گوشے سے ''فرقہ واریت'' کا الزام لگتا ہے اور ان کی مدد کے لئے آگے آنے والوں کو ''بے جا پشت پناہی'' کی بوچھار سہنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ''فرقہ واریت'' اور ''بے جا پشت پناہی'' (Appeasement) کے دو پاٹوں کے بیچ پستے لوگوں کا مسئلہ مہذب ہندستانی سماج، جسے سیکولر جمہوریت میں یقین ہے، کے لئے بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔

بہت سے سنجیدہ لوگوں کا ماننا ہے کہ "مسلمان ہندستان کے اصلی دھارے میں سرگرم نہیں، انہیں سرگرمی سے اپنا رول نبھانا چاہئے۔ اس قول میں کچھ حد تک سچائی بھی ہے۔ آزادی کے بعد ان کے خلاف جو متعصبانہ ماحول بنایا گیا، ہر جگہ تعصب (Prejudice) سے ہی انہیں واسطہ پڑتا رہا۔ فرقہ پرست ہندو تنظیموں کے ذریعہ دیش بھگتی کے سرٹیفکٹ کے لگاتار مطالبے نے ان کے اندر منفی سوچ کو مضبوط بنایا اور وہ اپنے خول میں سمٹتے گئے ہیں۔ جب کوئی سیاسی پارٹی مسلمانوں کو سرگرم ہونے کا مشورہ دیتی ہے، تو اس کا مطلب صاف ہوتا ہے، مسلمان اپنے ووٹوں کے ساتھ ان کے ساتھ آ جائے، ان پر ہی منحصر ہو جائے۔ ووٹ بینک کی سیاست کا یہ کھیل عرصے

سے یہاں کھیلا جاتا رہا ہے اور مسلمان اس کا محض ایک مہرہ بنے رہے ہیں، یہ سچائی ہے۔ یہ بھی سچائی ہے کہ مسلمان متحد ہو کر جدھر ووٹ ڈالتا ہے، اقتدار اسی کے حق میں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن سوال صرف ووٹ بینک کا نہیں ہے۔ سوال ہے مسلمانوں کی باعزت ہندستانیوں کی طرح زندگی جینے اور آئینی حقوق کو پورا کرتے اقتدار میں ان کی مناسب حصہ داری کا۔ یہی وہ اہم مسئلہ ہے، جہاں مسلمان اپنے کو ٹھگا سا محسوس کرتے ہیں۔ یہی احساسِ مایوسی ان کی گمراہی کی اکثر وجہ بھی بن جاتی ہے اور عمل کے ردعمل پر روک لگانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ دو پاٹوں کے بیچ پستے یہ ہندستانی، کہاں اپنے درد کی دوا ڈھونڈیں؟ انہیں تو سبز باغ سب نے دکھلایا ہے، مگر ان کی آرزوؤں کی بھرپائی کم ہی کی گئی ہے۔ سنگھ پریوار کی کٹر فرقہ واریت اور نام نہاد سیکولر پارٹیوں کی ہندو ووٹوں پر لگی نظر کے سبب چھپی لطیف فرقہ واریت کے چکرویوہ سے نکلنے میں ہم انہیں تعاون تو دیں۔ انہیں کھلے دل سے اپنا رول ادا کرنے کا موقع تو دیانتدارانہ سنجیدگی سے دیجئے۔

آزادی کے بعد پہلا زبردست فساد جبل پور میں ہوا تھا۔ بٹوارے کے بعد پست ہمت مسلمانوں کے لئے یہ پہلا بڑا جھٹکا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر فریدی، مولانا حفظ الرحمٰن جیسے کچھ قدآور مجاہدین آزادی مسلم رہنما ابھی زندہ تھے۔ مسلمان خود کو بالکل بے یار و مددگار نہ محسوس کریں، اس کے لئے ڈاکٹر سید محمود نے پہل کی تھی اور کئی مسلم تنظیموں کی لکھنؤ میں کانفرنس منعقد ہوئی، جہاں ''مجلس مشاورت'' وجود میں آئی تھی۔ ۱۰ جون ۱۹۶۱ کو سید محمود نے اپنے صدارتی خطبہ میں ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت اور مسلمانوں کی بدحالی پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کو ہمت بنائے رکھنے اور تحمل برقرار رکھنے کی صلاح دی۔ صوبائی اور مرکزی سرکاروں اور ان کے افسروں کو مسلمانوں کے ساتھ تعصبانہ رویہ نہ اپنانے کی اپیل کی، تاکہ آزاد ہندستان میں مسلمان بھی آزاد ہندستانی کا رول ادا کر سکیں۔ انہوں نے اپنے خطاب کو حسب ذیل الفاظ کے ساتھ ختم کیا تھا:

" Our asking for a rightful place in India is not communalism, it is an indication of our love for our motherland. It is our duty as the citizen of our country to make the government and the majority community realize that discrimination in any shape or form will sound the

death of Indian secularism and all the high ideas associated with it."[11]

آگے چل کر مسلم پرسنل لا بورڈ بھی بنا۔ لیکن سیاسی سطح پر کارآمد پہل نہیں ہوسکی۔ مسلمان آبادی کے لحاظ سے اپنے لئے مناسب جگہ نہیں حاصل کر سکے۔

ایسی بات نہیں کہ آزادی کے بعد جمہوری تقاضوں کو پورا کرتے آئینی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا موقع مسلمانوں کو نہیں ملا ہے۔ آزادی کی لڑائی میں اپنی چھاپ چھوڑنے والی نسل کے ختم ہونے کے بعد بھی آبادی کے تناسب میں نہ سہی، لیکن ہندستان میں متعدد چھوٹے بڑے مسلم افسر، ممبر پارلیامنٹ، ایم۔ایل۔اے۔، ایم۔ایل۔سی۔، وزیر، گورنر، صدر اور نائب صدر ہوئے ہیں۔ عزت و وقار اور عہدوں اور خطابوں نے انہیں بھی اسی ۱۵ فیصد خوشحال اعلیٰ طبقہ کے ہندستانیوں کے گھیرے میں قید کر رکھا۔ ان کا رہنا، نہ رہنا، عام مسلمانوں کے لئے اشتہاری حیثیت کے علاوہ کوئی معنی نہیں رکھتا رہا ہے۔ آزادی کے بعد مسلمان لگاتار آزمائشوں سے دوچار رہے ہیں، لیکن مسلم کاز کے لئے ناانصافیوں کے خلاف سکھ کاز میں ایکشن بلو اسٹار کے سوال پر احتجاج کرتے سردار خشونت سنگھ کی طرح کا ایک بھی مسلم لیڈر سامنے نہیں آسکا، یہ مسلمانوں کا المیہ ہے۔ باوقار کرسیوں پر بیٹھے مسلمان عام طور پر احساس کمتری کے شکار ہیں یا اپنی خودغرضیوں کے۔ انہیں لوگ ''فرقہ پرست'' نہ کہہ دیں، ان کی ''سیکولرزم'' پر انگلی نہ اٹھے، اسی فکر میں مسلمانوں پر ہو رہی ناانصافیوں کو وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، لیکن اس کے حل کے لئے پہل کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔ مسلمانوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ایس۔ہارمین کہتے ہیں:

''ہندستانی مسلمان کی حالت شمالی آئرلینڈ کے کیتھلکس سے بھی بُری ہے، کیونکہ ان کیتھلکس کو امید ہے کہ آج نہ کل ان کے مسائل کا سیاسی حل نکلے گا۔ لیکن ہندستانی مسلمان تو آگے کی سوچ ہی نہیں سکتے، کیونکہ انہیں سارے آئینی حقوق پہلے سے حاصل ہیں۔ فلسطینیوں سے بھی بُری حالت ہندستانی مسلمانوں کی ہے، کیونکہ فلسطین میں واضح حل موجود ہے، لیکن ہندستانی مسلمانوں کی وہ حالت نہیں ہے۔ امریکہ اور امریکہ کے نیگرو اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی اقلیتوں کے مقابلے میں بھی یہاں کی حالت ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ ہندستان کے عجیب وغریب

سماجی تانے بانے دوسری جگہوں کی طرح سیدھے سپاٹ نہیں۔''[۱۲]

اقتدار کی سیاست کا مزاج کبھی تولہ، کبھی ماشہ ہوا کرتا ہے۔ ہندستان میں سیاسی ہلچل کے ابتدائی دور سے ۱۹۴۰ تک آتے آتے اقتدار میں حصہ داری کے سوال کے مزاج میں آسمان زمین کا فرق آ گیا تھا۔ جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۰ میں ہندو مہا سبھا کو کوئی اہم تنظیم نہیں مانا اور نہ ہی اس کے منصوبوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا۔ مسلم لیگ کو تو وہ رجعت پسند لوگوں کی پارٹی ہی مانتے رہے۔ اسے کانگریس مخالف اور بے مقصد جذباتی مسئلہ اٹھانے والی پارٹی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔[۱۳] وقت بیتنے کے ساتھ جواہر لال نہرو کی باتیں بے وزن ہوتی نظر آتی ہیں، کیونکہ ''ہندو مہا سبھا'' اور ''مسلم لیگ'' دو اہم تنظیموں کی حیثیت سے ہندستان میں مستحکم ہوئیں اور ہندستان کی تقدیر کو طے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ جواہر لال نہرو نے کچھ چیزوں کو بڑی غیر سنجیدگی سے لیا، اپنے نظریات کو اپنی انا (Ego) کا مسئلہ بنا لیا، جس کا نتیجہ بھی آگے چل کر ملک کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ ہندستان کی سماجی بناوٹ الجھی ہوئی رہی ہے۔ ہزاروں سال کی اپنی روایت، دنیا کی دوسری قدیم تہذیبوں سے زندہ رشتہ اور مختلف قوموں اور ثقافتوں کے میل جول سے پنپنے اور فروغ پائے نظریات کے مدنظر یہاں کی حالت کا تجزیہ کرنے میں اکثر محققین کو پریشانی ہوئی ہے۔ مشہور مؤرخ ڈاکٹر ول پرساد نے اپنی کتاب "Pathway to India's Partition" میں اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ۱۹۲۴ کے بعد کے واقعات نے جس فرقہ وارانہ ذہنیت کو مضبوط کیا، اس کے نتیجے میں کانگریس اور مسلم لیگ کی دوری بڑھتی گئی اور وقت گذرنے کے ساتھ جو حالت بنی وہ المیوں سے بھری رہی۔[۱۴] تنگ نظر خیالات میں یقین رکھنے والے ایسے لوگ، جنہوں نے مسلمانوں کے وجود کو ہندستان کے لئے نقصان دہ مانا ہے، وہ کھل کر بولیں یا نہ بولیں حالات کے مدنظر وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کی اس بڑی آبادی سے ''جان چھڑانا'' ممکن نہیں۔ ان لوگوں کے اندر کا ''انسان'' یہ ماننے لگا ہے کہ ہندستانیوں کے ''اس طبقہ'' کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، ناانصافیوں کا سلسلہ رک بھی نہیں رہا ہے اور جب تک یہ سلسلہ رکتا نہیں ملک کی متوازن ترقی ممکن نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک لوگوں کو ''انصاف'' نہیں ملتا، سماج میں بے چینی موجود رہے گی اور ایسی حالت میں تخریب کاری عناصر کو سر اٹھانے کا موقع ملتا ہی رہے گا۔ اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے

لئے سماجی اور اقتصادی ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو ان کا جائز حق اور باعزت جینے کی سہولتیں مہیا کرانی ہی ہوگی، یہ وقت کا تقاضا ہے۔ گلوبلائزیشن کے دور میں ہم جی رہے ہیں۔ اسی بنیاد پر کسی ملک کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالت کا درجہ طے ہوتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی رشتے کیسے ہیں، اس نظریہ سے بھی ہندستان کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ ہندستان کی ان دو خاص اکائیوں کے دوستانہ رشتوں پر ہی ہندستان کے روشن مستقبل کا دارومدار ہے۔ ہندستانی مسلمان بھی ہندستان کی شاندار وراثت اور روایتوں کے ویسے ہی وارث ہیں، جیسے ہندو، اس سوچ کو اور مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سروپلّی رادھا کرشنن کہتے ہیں: ہندستان کی ہزاروں برس کی ثقافتی تاریخ اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ یہاں کی رنگارنگیاں اتحاد کے دھاگوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ مضبوط جڑاؤ کسی طاقت کے استعمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہمارے فلسفیوں، شاعروں اور کلاکاروں کے تصورات کی بے مثال پرواز کی طاقت نے یہاں کے اتحاد کے بندھنوں کو زیادہ مضبوط اور دیرپا بنایا ہے۔[15]

ہم نے بڑی قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کی ہے۔ آج کا اچھا یا بُرا ہندستان ہماری مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے اور اس کا اتحاد اور خوشحالی ہماری مشترکہ سوچ پر منحصر کرتی ہے۔ سب ہندستانیوں کا فرض بنتا ہے، یہاں ایک ایسا ماحول بنائیں جہاں مسلمانوں کو ''فرقہ واریت'' اور ''بے جا پشت پناہی'' (Appeasement) کے دو پاٹوں سے باہر نکل کر ملک کی تعمیر میں اپنا جائز رول ادا کرنے کا موقع مل سکے۔ مشہور ماہر تعلیم مجاہد آزادی ڈاکٹر عابد حسین کا ماننا ہے کہ تنوعات میں یکجہتی ہندستانی ثقافت کی بے مثال پہچان رہی ہے۔ ایک نئی ہندستانی ثقافت بنے اور فروغ ہو، ہماری مشترکہ کوشش ہونی چاہئے۔ اگر ہم اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو عالمی مسائل کا حل ڈھونڈنے میں بھی ہم مددگار ہو سکتے ہیں۔''[16] ''دو پاٹوں کے بیچ'' سے نکلنے کی کوششوں میں لگے لوگوں کی ذہنیت کو ہمیں نئے حقائق کی روشنی میں گذرے کل کے کچھ ایسے مسائل پر سنجیدگی سے پھر غور کرنا ہوگا جو اختلافات کی اب تک جڑیں مانی جاتی رہیں ہیں۔ ان میں "Separatism" بھی ایک ہے، اس کے بارے میں بھی ہمیں کھلے دل سے سوچنا چاہئے۔ اس ضمن میں سرسید احمد خاں کی ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ کو پٹنہ میں ہوئی ایک تقریر بہت اہمیت رکھتی ہے، آج گہرائی سے اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے، تاکہ اسے حدوں میں رکھ کر بنی ذہنیت

میں لچک کی گنجائش بن سکے اور صرف مسلمانوں کو ہی "Separatism" کے لئے کٹہرے میں نہیں رکھا جائے۔ ان غیر مسلموں پر بھی ہماری نظر جائے جو ہندو اور مسلمانوں کو الگ الگ مان کر سیاست کر رہے تھے۔ سر سید احمد خان نے کہا تھا:

I have always said that our land of India is like a newly wedded bride whose two beautiful and luscious eyes are the Hindus and the Musalmans. If the two exist in mutual concord the bride will remain forever resplendent and becoming, while if they make up their mind to see in different directions the bride is bound to become squinted and even partingly blind.[17]

انڈین ایڈمنسٹریشن سروس کے ریٹائرڈ ممبر، بہار اور جھارکھنڈ کے سابق چیف سکریٹری لکشمیشور دیال نے اس حساس مسئلہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ سر سید اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تنظیمی کردار کے بارے میں ان کے خیالات بھی قابل غور ہیں:

''سر سید احمد خان بحیثیت ایک ہندستانی بڑے سیکولر اور صاف ذہن کے انسان تھے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں سے ان کے رشتے بہت ہی اچھے رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں غیر مسلموں سے تفریق نہیں کیا جاتا تھا۔ سنسکرت زبان وہاں کے نصاب میں تھی اور متعدد ہندو، عیسائی اور پارسی وہاں کے طالب علم تھے۔ پروفیسر ایشوری پرساد وہاں کے پہلے گریجویٹ تھے۔ ۱۸۸۷ میں انتظامی کمیٹی میں تین ہندو ممبر تھے اور ۱۸۹۴ میں سات استادوں میں دو ہندو تھے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مدنظر وہاں گائے نہیں ذبح ہوتی تھی۔ وہاں کے روزمرہ کے معاملوں میں مذہب کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ نتیجتاً دیوبندی اور وہابی علما ان سے خوش نہیں تھے۔''[۱۸]

فرقہ واریت کی سیاست کرنے والوں کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہت فائدے کا ایجنڈا رہا ہے۔ مسلمانوں سے الرجی رکھنے والے لوگ ہندوؤں کو گمراہ کرنے کے لئے اس کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے ووٹرس کو یہ نہیں بتلاتے کہ وہاں پڑھنے اور پڑھانے والے غیر مسلم ۴۵ سے ۶۰ فیصد ہیں، وہاں صرف مسلمان ہی نہیں پڑھتے۔ وہ ایک سنٹرل یونیورسٹی ہے اور سب کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے۔

مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر امرتیہ سین نے قومی ترقی کے سوال کے ساتھ شمولیت (inclusion) اور اخراج (Exclusion) کے مسئلے کو جوڑنا ضروری مانا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ایک کثیر لسانی یا کثیر ثقافتی بناوٹ والے ملک میں ترقی کے عمل میں سبھی گروپوں یا فرقوں کی شمولیت یکساں نہیں ہو پاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر ترقی سے ہونے والے فائدے بھی سماج کے مختلف فرقوں کو یکساں حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ترقیاتی عمل سماجی، اقتصادی دوری کو گھٹانے کے بجائے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ اس مسئلہ کے دو مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر امرتیہ سین کہتے ہیں کہ عام طور پر کثیر ثقافتی گروپوں میں ''اقلیتوں'' کو اپنی زبان، تیوہار، لباس کے استعمال کرنے کی پوری چھوٹ یا آزادی نہیں ہوتی ہے، کیونکہ ''اکثریت'' کی طرز زندگی ''اقلیتوں'' پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ ایسی حالت میں ترقیاتی عمل میں ''اقلیتوں'' کی شرکت نہیں ہو پاتی...... اس لئے ''اقلیت'' ملک کے اصل دھارے سے کٹ جاتی ہے اور ترقیاتی عمل میں یہ نہ تو شامل ہو پاتے ہیں اور نہ ہی ترقیاتی پروگرام کا فائدہ ہی وہ لے پاتے ہیں۔ سماج کی بہتری کے پروگراموں کو کامیاب بنانے کے لئے ''اقلیتی'' گروپوں کو خاص کر ان میں شامل کرنے کی کوشش نہایت ضروری ہے۔ ''اقلیتوں'' کی ثقافت، زبان، طرز زندگی، مذہب اور تیوہار کو اگر جائز مقام نہیں دیا جائے گا، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود کو پورے سماج کے ساتھ جوڑ نہیں پائیں گے۔[19] آج ہندستان بہت الجھے حالات سے دوچار ہے۔ اسے ضرورت ہے سماجی یکجہتی اور ہم آہنگی کی۔ اس کی حصولیابی کے لئے ہمیں اپنی سوچ میں وقت کے مطابق مناسب تبدیلی لانی ضروری ہے، تاکہ ''دو پاٹوں کے بیچ'' پھنسے پستے لوگوں کے لئے باوقار زندگی گذارنے کی مناسب جگہ ملے اور وہ تعمیرِ ملک میں اپنی واضح شرکت درج کراسکیں۔

کش مکشِ حیات لوگوں کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ ہم ہندستانیوں نے بھی حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے ''غیر جانبداری'' کی پالیسی اپنانے کی مضبوطی بھی دکھائی ہے، ہمارا آئین اس کا گواہ ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ''غیر جانبداری'' کے سارے دعوؤں کے باوجود مسلمان اکثر تفریق اور تعصب (Prejudice) کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ سرکاری نوکریاں ہوں یا نجی شعبہ کی ملازمتیں، مسلمانوں کو اکثر ایسی ہی صورت حال سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی حالت کو دیکھ کر صورت حال کی

سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سرکاری دعووں اور وعدوں کی روشنی میں نوکریوں اور پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی کتنی نمائندگی ہے، اس سے ہی اقتدار میں حصہ داری کو جانچنا ممکن ہے۔ ابھی ہم صرف ایڈمنسٹریٹو سروسیز کا جائزہ لیتے ہیں، تو پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت قابل رحم ہے۔ نتیجتاً مسلمانوں کے لئے جو ریزرویشن کے ساتھ آئین کی دفعہ ۳۴۱ میں ترمیم کا جو مطالبہ ہو رہا ہے، اسے غیر مناسب نہیں کہہ سکتے:

سروسیز	کل	مسلمان
آئی۔ اے۔ ایس، آئی۔ پی۔ ایس، آئی۔ ایف۔ ایس۔	۸۸۲۷	۲۸۵
کمپیٹیشن کے بعد	۶۴۶۶	۱۵۵
اسٹیٹ سروسیز	۲۳۶۷	۱۳۰
انڈین ایڈمنسٹریٹو	۴۷۹۰	۱۴۲
ڈائرکٹ سروسیز	۳۵۴۲	۸۰
کمپیٹیشن اسٹیٹ سروسیز	۱۲۴۸	۶۲
کمپیٹیشن فورن سروسیز	۸۲۸	۱۵
سیدھی بحالی	۶۲۱	۱۳
آئی۔ ایس۔ ایل۔ گریڈ	۲۰۷	۰
آئی۔ پی۔ ایس۔	۳۲۰۹	۱۲۸
کمپیٹیشن ڈائرکٹ	۲۲۹۷	۶۳
اسٹیٹ سروسیز	۹۱۲	۶۵[۲۰]

بھارت سرکار کے ذریعہ وقت بوقت بحال جانچ کمیشن اور نیشنل انٹیگریشن کونسل کی سفارشوں کی روشنی میں فرقہ وارانہ یکجہتی قائم کرنے اور ہندو مسلم فسادات پر قابو پانے کے لئے پولس فورس میں آبادی کے تناسب کے مطابق لازمی طور سے مسلمانوں کی بحالی ہونی چاہئے، لیکن اب تک اس جانب دھیان نہیں دیا گیا۔ ۱۹۸۳ میں قائم ڈاکٹر گوپال سنگھ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۹ تک صرف دو فیصد مسلمان ہی پولس فورس میں بحال ہوئے۔ ۲۳ برسوں

کے بعد بحال ہوئے سچر کمیشن نے جو رپورٹ ۲۰۰۶ میں دی، وہ تو تکلیف دہ حد تک اور مایوس کن ہے۔ مرکزی سرکاری نوکریوں میں اعلی ذات کے ہندو لوگ ۴۲ فیصد ہیں۔ او۔ بی۔ سی۔ (ہندو) اور شیڈول کاسٹ ۲۳ فیصد، جب کہ مسلمان ۶ فیصد ہی ہیں۔ ڈیفنس سروسیز میں صرف ۴ فیصد مسلمان ہیں، جب کہ او۔ بی۔ سی۔ (ہندو) ۲۳ فیصد، اے۔ اے۔ سی ۱۲ فیصد، اعلی ذات کے ۵۲ فیصد۔ مذکورہ بالا اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ ہر شعبہ میں مسلمانوں کو محروم رکھنے کی ہی سازش چل رہی ہے۔

شروع سے بہار ہندستان کا ایک بیدار صوبہ رہا ہے۔ اس کی تاریخ ہی ہندستان کی قابل فخر تاریخ کہلاتی ہے۔ بدھ، مہاویر، گرونانک سنگھ، اشوک، چندر گپت، شیر شاہ، کے ساتھ یہ گاندھی جی کا میدان عمل بھی ہے۔ افغانوں اور مغلوں کے وقت میں تو بہار کی راجدھانی عظیم آباد کا خاص مقام رہا، اورنگ زیب کے پوتے عظیم الشان کی تاج پوشی یہیں ہوئی تھی۔ ثقافتی طور پر یہ دلّی، بنارس اور لکھنؤ سے کسی طرح کمتر نہیں رہا۔ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے بھی یہاں اپنے کامیاب پروگرام چلائے ہیں، لوگوں کی ذہنیت کو تعمیری سمت دی ہے۔ آج مسلمانوں کی یہاں بھی کیا حالت ہے، حسب ذیل اعداد و شمار سے واضح ہو جاتا ہے:

۱۔ مسلمانوں کی ۵۱ فیصد آبادی بے زمین کسان مزدور ہے۔

۲۔ کل خواندگی ۴۲ فیصد

۳۔ نسواں خواندگی ۳۱ فیصد

۴۔ سرکاری نوکری میں مسلم ملازمین 7.6 فیصد

۵۔ شعبہ تعلیم 12.3 فیصد

۶۔ صحت اور نسواں زچگی فلاح 2.6 فیصد

۷۔ ہوم ڈپارٹمنٹ 6.9 فیصد

۸۔ ٹرانسپورٹ 10.9 فیصد، اعلی عہدہ 8.6 فیصد، نچلے پوسٹ 6.4 فیصد

۹۔ دوسرے شعبے 7.6 فیصد

بہار کی کل آبادی میں مسلمانوں کا فیصد 16.5 ہے اور ودھان سبھا میں ان کی نمائندگی آٹھ سے نو فیصد ہے۔ ۲۰۰۵ کے الیکشن میں صرف ۱۶ مسلمان ہی ایم۔ ایل۔ اے بنے تھے،

آزادی کے بعد بہار میں مسلمانوں کی یہ سب سے کم نمائندگی کا ریکارڈ ہے۔ ۲۰۱۰ کے بہار ودھان سبھا الیکشن میں کل ۱۹ مسلم امیدوار جیتے۔

بہار کی سیاست میں بابری مسجد کو توڑنے سے لے کر گودھرا کے ہیروز اور ویلن کے نام پر سیاست چل رہی ہے اور اس سیاست کے مرکز میں مسلمان ہی ہیں۔ دراصل پارٹیوں کو ووٹ بینک کی تو کافی فکر رہتی ہے، لیکن ٹکٹ دیتے وقت ان کا حساب بدل جاتا ہے۔ ہر الیکشن میں مسلمانوں کی نمائندگی کا سوال ناقابل توجہ ہو جاتا ہے۔

بہار کی ۴۰ سیٹوں پر بھی پارٹیوں کو ملا کر چار پانچ مسلمان ہی لوک سبھا الیکشن میں جیتتے رہے ہیں۔ کوئی بھی پارٹی مسلمانوں کو آبادی کے مطابق ٹکٹ نہیں دیتی۔ ۱۹۵۲ سے ۲۰۰۹ تک بہار میں صرف ۵۴ مسلمان لوک سبھا پہنچ سکے، ان میں ۱۴ پچھڑے مسلمان تھے۔ ۲۰۰۹ میں صرف اسرار الحق، مناظر حسن اور سید شاہنواز حسین جیتے، جب کہ آبادی کی بنیاد پر کم سے کم بہار سے سات مسلمانوں کو لوک سبھا میں ہونا چاہئے تھا۔

بہار ودھان سبھا میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کا یہی حال ہے۔ ۱۹۵۲ سے ۲۰۱۰ کے درمیان بہار ودھان سبھا میں مسلمانوں کے پہنچنے کا اوسط سات سے بیس فیصد کے درمیان ہی رہا۔ جھارکھنڈ جب بہار میں شامل تھا، تب صوبہ میں ودھان سبھا کی ۳۲۳ سیٹیں تھیں، لیکن بٹوارے کے بعد بہار ودھان سبھا میں سیٹوں کی تعداد ۲۴۳ ہو گئی ہے۔ صرف ۱۹۸۵ میں بہار ودھان سبھا میں مسلمان ایم۔ ایل۔ اے۔ کی تعداد ۳۱ تھی۔ بہار ودھان سبھا ۲۰۱۰ کے الیکشن میں کل ۱۹ جیتنے والے مسلمان ایم۔ ایل۔ اے۔ میں ۷ جدیو، ۱ بھاجپا، ۶ راجد، ۲ لوجپا اور کانگریس کے ۳ نمائندے شامل ہیں۔ مسلم ایم۔ ایل۔ اے۔ کی نمائندگی کا یہ اعداد و شمار لالو پرساد کی مسلم بنیادوں کی گراوٹ کا نمونہ ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ لالو پرساد کا ''مائی'' (مسلمان اور یادو) کا اتحاد ٹوٹ گیا۔

ودھان سبھا کے فروری اور اکتوبر نومبر ۲۰۰۵ کے الیکشن میں راجد کی مسلم بنیادوں میں گراوٹ کے سبب مسلم ایم۔ ایل اے۔ کی تعداد گھٹ کر ۱۶ سے ۱۱ ہو گئی تھی۔ جدیو کے پانچ میں سے چار امیدوار جیتنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ فروری کے الیکشن میں ۲۴ فیصد ایم۔ ایل۔ اے۔ جیتے تھے، لیکن اکتوبر نومبر کے الیکشن میں مسلمانوں کی تعداد گھٹ کر ۱۶ پہنچ گئی۔

بہار ودھان سبھا میں مسلمانوں کی نمائندگی

سال	سیٹ	فیصد
1952	24	7.27
1957	25	7.84
1962	21	6.60
1967	18	5.66
1969	19	5.97
1972	25	7.85
1977	25	7.72
1980	28	8.64
1985	34	10.50
1990	20	6.19
1995	19	5.88
2000	20	9.87
2005	16	6.58
2010	19	7.80

(کل سیٹ ۳۲۴، ۳۲۳ اور ۲۴۳ کی بنیاد پر)

لوک سبھا میں مسلمان

سال	جیتے
۲۰۰۹	۳
۲۰۰۴	۵
۱۹۹۹	۳
۱۹۹۸	۲
۱۹۹۶	۴

۱۹۹۱	۶
۱۹۸۹	۳
۱۹۸۴	۶
۱۹۸۰	۴
۱۹۷۷	۲
۱۹۷۱	۳
۱۹۶۷	۲
۱۹۶۲	۲
۱۹۵۷	۳
۱۹۵۲	۳[۲۱]

(کل سیٹ ۵۴ اور ۴۰)

گلوبلائزیشن کے تقاضوں کے مدنظر مسلمان بھی جینے کی جدوجہد میں پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔ نتیجتاً جہاں انہیں موقع ملتا ہے، وہ اپنی صلاحت کی چھاپ ہر شعبے میں چھوڑ رہے ہیں۔ ''دو پاٹوں کے بیچ'' پستے ہندستانیوں کو موقع دیجئے، انہیں Prejudice (تعصب) کا شکار مت بنائیں، وہ ہندستان کا قیمتی سرمایہ ہیں، انہیں اپنا مناسب رول ادا کرنے دیجئے...... پڑھے لکھے سرکردہ دانشور ہی نہیں، عام مسلمانوں کو بھی اسکول، کالج میں داخلہ کے ساتھ اہلیت کے مطابق نوکریوں اور پوش علاقوں میں مکان (کرایہ یا خریدا ہوا) ملنے میں دقت نہیں ہو یہ فضا بنی چاہئے۔ جب تک مسلمانوں کی ہر شعبے میں مناسب نمائندگی نہیں ہوگی، ان کے تئیں رواداری نہیں دکھلائی جاتی، یہ ماحول نہیں بنے گا۔ ''دو پاٹوں کے بیچ'' پستے لوگ ہندستان کے لئے ''پونجی'' ثابت ہوں، ایسا ماحول بنانا ضروری ہے۔ ہم سب ہندستانی ہیں، اس ذہنیت کو مضبوط بنانے کی ہماری مستعدی ضروری ہے تاکہ مسلمان یہ سمجھیں کہ وہ ہندستان کے دوسرے نمبر کے شہری نہیں ہیں اور ہمارے اکثریتی ہندو بھائی ان کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔

It is for majority community to uphold the nations unity. It must never bargain by the minorities about how

much of rights should it have and to how much others have to share. Every minority all the world over worries about being submerged or it's indentities being effaced. This is not a political issue and it is only when the majority community wins and retains the confidence of the minorities in a country that it make it possible for the nation to endure.

Rabindra Nath Tagore

حواشی

۱۔ ایس۔ ہارمین، پلائٹ آف مسلم اِن انڈیا، لندن، ۱۹۷۷، ص ۵۵

۲۔ جوڈتھ براؤن، گاندھی رائز ٹو پاور، اِن انڈین پالیٹکس 1915۔۱۹۲۲، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۲، ص ۲۷۳ بحوالہ اسٹینلی آلپرٹ، جناح آف پاکستان، آکسفورڈ پریس، ۲۰۱۰، ص ۶۷

۳۔ اسٹینلی آلپرٹ، ص ۴۵

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد، انڈیا وِنس فریڈم، اورینٹ لونگ مین، ۱۹۹۵، ص ۱۶۔۱۸

۵۔ جناب تقی رحیم کی کتاب ''ذکر یونس''، پٹنہ، ۱۹۵۸ میں مسٹر یونس کے ایک دوست شاہ عثمانی کے مضمون میں ص ۱۹ پر پوری تفصیل دی گئی ہے۔

۶۔ راج موہن گاندھی، انڈر اسٹینڈنگ مسلم مائنڈ، پینگوئن، نئی دلی، ۱۹۸۷، ص ۶۹

۷۔ ڈونالڈ ایس۔ اسمتھ، انڈیا ازاے سیکولر اسٹیٹ، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۳، ص ۶۔۷

۸۔ ایم۔ او۔ متھائی، ریمینی سنسز آف دی نہرو ایج، وکاس پبلشنگ ہاؤس، نئی دلی، ۱۹۷۸، ص ۷۱

۹۔ چیسٹر باؤلس، این ایمبسڈرس رپورٹ، ہارپر اینڈ برادرس، نیویارک، ۱۹۵۴، ص ۱۰۴ بحوالہ ڈونالڈ ایس۔ اسمتھ، انڈیا ازاے سیکولر اسٹیٹ، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۳، ص ۴۱۱

۱۰۔ جواہر لال نہرو، اسپیچیز، ۱۹۴۹۔۱۹۵۳، پبلیکیشن ڈویژن، بھارت سرکار، ۱۹۵۴، ص ۳۰۹۔۳۱۰

۱۱۔ وی۔ این دتا، بی۔ای۔ کلیگر ون، اے نیشنلسٹ مسلم اینڈ انڈین پولیٹکس، میک ملن، ۱۹۷۴، ص ۳۲۸۔۳۲۹

۱۲۔ ایس۔ ہارمین، ص ۱۵۵۔۱۵۶

۱۳۔ شوگر وازما، مسلم نیشنلزم اینڈ دی پارٹیشن، منوہر، ۱۹۸۸، ص ۱۳۲

۱۴۔ ڈاکٹر وِلی پرساد، پاتھ وے ٹو انڈیاز پارٹیشن، منوہر، ۱۹۹۹، ص ۴۰۔۴۱

۱۵۔ ڈاکٹر عابد حسین، نیشنل کلچر آف انڈیا، نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۹۴، ص ۱۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۱۷۔ کے۔اے۔ نظامی، سرسید احمد خان، ۱۹۶۶، ص ۱۴۴

۱۸۔ لکشمیشور دیال، دی ٹرتھ اباؤٹ اسلام، انامیکا پبلی کیشن، دلّی، ۲۰۱۰، ص ۱۴۹۔۱۵۰

۱۹۔ سہہ یاتری، رانچی، دسمبر، ۲۰۱۱، ص ۷

۲۰۔ راشٹریہ سہارا، اردو، پٹنہ رانچی، ۳۱ مئی ۲۰۱۲

۲۱۔ شری کانت، راجیہ اور سماج، وانی پرکاشن، ۲۰۱۱، ص ۱۴۹۔۱۵۱

ریفرنس

کتب

۱۔ آر۔ کے۔ پربھو، مائنڈ آف مہاتما، آکسفورڈ پریس، ۱۹۴۵

۲۔ آسٹین گرین وائل، دی انڈین کنسٹی ٹیوشن، آکسفورڈ، لندن، ۱۹۶۶

۳۔ ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم، اورینٹ لونگ مین، کلکتہ، ۱۹۶۱

۴۔ ابوالکلام آزاد، خطبات آزاد، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، دلی، ۱۹۸۱

۵۔ اسٹینلی آلپرٹ، جناح آف پاکستان، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک، ۱۹۸۴

۶۔ اشوک مہتا، اچوت پٹوردھن، دی کمیونل ٹرینگل ان انڈیا، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۴۲

۷۔ املیند وڈے، اسلام ان ماڈرن انڈیا، مایاپرکاشن، کلکتہ، ۱۹۸۲

۸۔ ای۔ راجندر پرساد، مکتی کے اگردوت، بابو جگجیون رام، جگجیون ٹرسٹ، نئی دلی، ۲۰۰۶

۹۔ اے۔ آر۔ دیسائی، سوشل بیک گراؤنڈ آف انڈین نیشنلزم، پوپلر بک ڈپو، بمبئی، ۱۹۵۴

۱۰۔ اے۔ ترپاٹھی، دی اکسٹری مسٹ چیلنج، انڈیا بٹوِن ۱۸۹۰۔۱۹۱۰، اورینٹ لونگ مین، کلکتہ، ۱۹۶۷

۱۱۔ اے۔ جی۔ نورانی، جناح اینڈ تِلک، کامریڈ ان فریڈم اسٹریگل، آکسفورڈ پریس، کراچی، ۲۰۱۰

۱۲۔ اے۔ سی۔ بنرجی، ٹوینشنس، کنسپٹ پبلی کیشن، دلی، ۱۹۸۱

۱۳۔ ایچ۔ ڈبلیو۔ ہڈسن، دی گریٹ ڈیوائیڈ ہچیسن، لندن، ۱۹۶۹

۱۴۔ ایس۔ سی۔ مشرا، کمیونل رائٹس ان انڈیا، سی۔ آر۔ پی۔ ایف۔ نئی دلی، ۱۹۷۷

۱۵۔ ایس۔ ہارمین، پلائٹ آف مسلم ان انڈیا، لندن، ۱۹۷۷

۱۶۔ ایل۔ دیال، مِتھ اباؤٹ اسلام، انامیکا پبلی کیشن، نئی دلی، ۲۰۱۰

۱۷۔ ایم۔ او۔ متھائی، ریمینی سنسیز آف نہرو ایج، وکاس پبلی کیشن ہاؤس، دلی، ۱۹۷۸

۱۸۔ ایم۔ ایچ۔ سعید، دی ساؤنڈ آف فیوری، اے پولیٹیکل اسٹڈی آف ایم۔ اے۔ جناح،

ڈ کومنٹ پریس، نئی دلّی، 1981
۱۹۔ ایم۔این۔رائے، دی ہسٹوریکل رول آف اسلام، وورا اینڈ کمپنی، بمبئی، ۱۹۳۷، ترمیم شدہ ایڈیشن
۲۰۔ بی۔آر۔امبیدکر، لیکھ اور بھاشن، شکچھا وبھاگ، مہاراشٹر سرکار، ۱۹۹۰
۲۱۔ بی۔آر۔پروہت، ہندو ریواولزم اینڈ نیشنلزم، شکتی پرکاشن، ساگر، ۱۹۶۵
۲۲۔ بی۔آر۔نندا، ایسیز ان ماڈرن انڈین ہسٹری، آکسفورڈ، ۱۹۸۰
۲۳۔ بنی پرساد، انڈیاز ہندو مسلم کوئسچن، جارج ایلن اینڈ انیون، لندن، ۱۹۴۶
۲۴۔ پٹا بھی سیتا رمیا، دی ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگریس، پدما پبلی کیشن، بمبئی ۱۹۴۶
۲۵۔ پنڈرمون، ڈیوائڈ اینڈ کووِٹ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۷
۲۶۔ پی۔سی۔گھوش، دی ڈیولپمنٹ آف انڈین نیشنل کانگریس، ۱۸۹۲۔۱۹۰۹، فرما کے۔ایل۔مکھوپادھیائے، کلکتہ، ۱۹۶۰
۲۷۔ پی۔ہارڈی، دی مسلمس آف برٹش انڈیا، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۲
۲۸۔ پیارے لال، لاسٹ فیز ۲، نوجیون، احمد آباد، ۱۹۵۰
۲۹۔ تقی رحیم، ذکر یونس، پٹنہ، ۱۹۵۸
۳۰۔ جنگ دھاری پرساد، کچھ اپنی کچھ دیش کی، جانکی پرکاشن، پٹنہ، ۲۰۰۹
۳۱۔ جواہر لال نہرو، ڈسکوری آف انڈیا، آکسفورڈ پریس، ۱۹۸۱
۳۲۔ جواہر لال نہرو، ریسنٹ ایسیز اینڈ رائٹنگس، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۳۴
۳۳۔ جی۔ایم۔براؤن، گاندھیز رائز ٹو پاور، انڈین پولیٹیکس ۱۹۱۵۔۱۹۲۲، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۲
۳۴۔ جے۔بی۔کرپلانی، مائی ٹائمس ان آٹو بایوگرافی، روپا اینڈ کمپنی، ۲۰۰۴
۳۵۔ جے پرکاش نارائن، ان دی لاہور فورٹ، ساہتیالیہ، پٹنہ، ۱۹۴۷
۳۶۔ جے پرکاش نارائن، نیشن بلڈنگ ان انڈیا، نو چیتنا پرکاشن، بنارس، سال ندارد
۳۷۔ جے پرکاش نارائن، پرزن ڈائری، پوپولر پرکاشن، بمبئی، ۱۹۷۷
۳۸۔ جے پرکاش نارائن، بہار واسیوں کے نام چٹھی، بہار سرودے منڈل، پٹنہ، ۱۹۷۶

۳۹۔ جی۔ڈی۔کھوسلا، دی ایسٹرن ریکانس، بھونانی اینڈ سنس، نئی دلی، سال ندارد
۴۰۔ جی۔ڈی۔کھوسلا، دی مڈر آف مہاتما، شیٹو اینڈ ونڈرس، لندن، ۲۹۶۳
۴۱۔ جے۔سی۔گھوش، بنگالی لٹریچر، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۸
۴۲۔ چودھری خلیق الزماں، پاتھ وے ٹو پاکستان، اورینٹ لونگ مین، ۱۹۶۱
۴۳۔ چیسٹر باؤلس، ایز امبیڈرس رپورٹ، ہارپر اینڈ بردرس، نیویارک، ۱۹۵۴
۴۴۔ درگا داس، انڈیا فریڈم فرام کرزن ٹو نہرو اینڈ آفٹر، ہارپر کولنس، ۲۰۰۰
۴۵۔ دلیپ کمار وشواس، دی لائف اینڈ لیٹرس آف راجا رام موہن رائے، سادھارن برہمو سماج، کلکتہ، ۱۹۶۲
۴۶۔ ڈاکٹر تارا چند، فریڈم مومنٹ آف انڈیا، پرکاشن وبھاگ، بھارت سرکار، نئی دلی، ۹۹۹
۴۷۔ ڈاکٹر جسونت سنگھ، جناح، انڈیا، پارٹیشن انڈیپنڈنس، روپا اینڈ کمپنی، ۲۰۰۹
۴۸۔ ڈاکٹر جی۔تیندولکر، مہاتما، وٹھل بھائی جھویری، بمبئی، ۱۹۵۱
۴۹۔ ڈاکٹر ڈی۔پی۔یادو، سنسد میں چرنجیت یادو، ایس۔چاند اینڈ کمپنی، نئی دلی، ۲۰۱۲
۵۰۔ ڈاکٹر رام گوپال، انڈین مسلمس، پولیٹیکل ہسٹری، ۱۸۵۸۔۱۹۴۷، ایشیا پبلی کیشن ہاؤس، ۱۹۵۹
۵۱۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، گلٹی مین آف انڈیاز پارٹیشن، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۶۰
۵۲۔ ڈاکٹر سچید انند سنہا، جناح، جیسا انہیں میں نے جانا، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۳
۵۳۔ ڈاکٹر عابد حسین، دی ڈسٹینی آف انڈین مسلمس، ایشیا پبلی کیشن ہاؤس، ۱۹۶۵
۵۴۔ ڈاکٹر عابد حسین، گاندھی اینڈ کمیونل یونیٹی، اورینٹل لونگ مین، ۱۹۶۹
۵۵۔ ڈاکٹر گراہم پول، انڈیا ان ٹرانزیشن، لیونارڈ اینڈ ورجینیا وولف، لندن، ۱۹۳۲
۵۶۔ ڈاکٹر مشیر الحسن، دی پارٹیشن آمنی بس، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲
۵۷۔ ڈاکٹر مشیر الحسن، نیشنلزم اینڈ کمیونل پولیٹیکس ان انڈیا، منوہر پبلی کیشن، نئی دلی، ۱۹۷۹
۵۸۔ ڈاکٹر مشیر الحسن، محمد علی، آئیڈیالوجی اینڈ پولیٹیکس، پرنٹ انڈیا، نئی دلی، ۱۹۸۱
۵۹۔ ڈاکٹر وِمل پرساد، پاتھ ٹو انڈیاز پارٹیشن، منوہر، ۱۹۹۹

۶۰۔ ڈبلیو۔سی۔اسمتھ، ماڈرن اسلام ان انڈیا، وکٹر گلیس، لندن، ۱۹۴۶
۶۱۔ ڈیوڈ پیج، پری لوڈ ٹو پارٹیشن، آکسفورڈ، نیویارک ۱۹۸۲
۶۲۔ راج گوپال آچاریہ، گاندھی ٹیچنگس اینڈ فلاسفی، وِدیا بھون، بمبئی ۱۹۷۴
۶۳۔ راج موہن گاندھی، انڈراسٹینڈنگ مسلم مائنڈ، پینگوئن، نئی دلی، ۱۹۸۷
۶۴۔ راجندر پرساد، اپنی کہانی، گوپی ناتھ امن، ساہتیہ اکادمی، نئی دلی، ۱۹۶۱
۶۵۔ راجندر پرساد، ہندستان کا مستقبل، حالی پبلشنگ ہاؤس، دلی، ۱۹۴۶
۶۶۔ رام دھاری سنگھ دنکر، سنسکرتی کے چار ادھیائے، راجپال اینڈ سنس، دلی، ۱۹۵۶
۶۷۔ رام ورکچھ بنی پوری، کچھ میں کچھ وے، انا میکا پبلی کیشن، دلی، ۲۰۱۲
۶۸۔ راؤ دار خاں دی امریکن پیپرس، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۹
۶۹۔ رجنی پام دت، انڈیا ٹوڈے، پیپلس پبلی کیشن ہاؤس، بمبئی ۱۹۴۹
۷۰۔ زیڈ۔اے۔احمد، میرے جیون کی کچھ یادیں، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دلی، ۲۰۰۹
۷۱۔ سدھ ساچی بھٹا چاریہ، ٹوارڈس فریڈم، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۷
۷۲۔ سی۔اے۔نعیم، اقبال، جناح اینڈ پاکستان، جناح پبلی کیشن ہاؤس، دلی، ۱۹۸۲
۷۳۔ شری پرکاش، پاکستان: استھاپنا اور شروعاتی حالت، مکتبہ، نئی دلی، ۱۹۶۸
۷۴۔ شری کانت، راج اور سماج، وانی پرکاشن، نئی دلی، ۲۰۱۱
۷۵۔ شریف المجاہد، قائد اعظم، اسٹڈیز اینڈ انٹرپریٹیشن، جناح اکادمی، کراچی، ۱۹۸۱
۷۶۔ شوکوازما، مسلم نیشنلزم اینڈ دی پارٹیشن، منوہر، ۱۹۹۸
۷۷۔ شیوسوامی ایر، انڈین کنسٹی ٹیوشنل پرابلم، بی۔ڈی۔تاراپوروالا، بمبئی، ۱۹۲۸
۷۸۔ طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مکتبہ جامعہ، دلی، ۱۹۴۵
۷۹۔ عائشہ جلال، دی سول اسپوکس مین جناح، دی مسلم لیگ اینڈ ڈیمانڈ آف پاکستان، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۵
۸۰۔ قاضی محمد عدیل عباسی تحریک خلافت، ترقی اردو بورڈ، نئی دلی، ۱۹۷۸
۸۱۔ کتھ کلارڈ، پاکستان اے پولیٹیکل اسٹڈی، جارج الون اینڈ انون، لندن، ۱۹۵۷
۸۲۔ کملیشور، کتنے پاکستان، راجپال اینڈ سنس، دلی، ۶

۸۳۔ کے۔ کے۔ گنگادھرن، سوشیولوجی آف ریوائولزم، قلم کار پرکاشن، نئی دلی، ۱۹۷۰
۸۴۔ کے۔ ایل۔ گوبا، اسیسی نیشن آف مہاتما گاندھی، جیکو پبلی کیشن، بمبئی، ۱۹۶۹
۸۵۔ گوپال گوڈسے، گاندھی ودھیہ کیوں؟ دی تستا پبلی کیشن، پونا، ۱۹۷۳
۸۶۔ لاری کولنس، ڈومینیک لاپیرے، فریڈم ایٹ نائٹ، سائمن اینڈ سوسٹر، نیویارک، ۱۹۷۵
۸۷۔ لالہ لاجپت رائے، آریہ سماج، اتر چندر کپور اینڈ سنس، لاہور، ۱۹۳۲
۸۸۔ لالہ لاجپت رائے، اسپیچیز اینڈ رائٹنگس، یونیورسٹی پبلی کیشن، نئی دلی، ۱۹۶۶
۸۹۔ لوئی فیشر، لائف آف مہاتما، جوناتھن کیمپ، لندن، ۱۹۶۲
۹۰۔ مارگریٹ بروک وائٹ، ہاف وے ٹو فریڈم، سوئمن اینڈ شوسٹر، نیویارک، ۱۹۴۹
۹۱۔ محمد مجیب، انڈین مسلمس، جارج ایلن اینڈ انون، لندن، ۱۹۶۷
۹۲۔ محمود حسین، ہسٹری آف دی فریڈم اسٹرگل: ۱۸۳۱۔۱۹۰۵، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی پبلی کیشن، رینانسا پبلی کیشنگ ہاؤس، دلی، ۱۹۸۴
۹۳۔ مدھولیمیے، ڈاکٹر امبیدکر: ایک چنتن، سردار ولبھ بھائی پٹیل ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دلی، ۱۹۹۰
۹۴۔ مولانا شبلی نعمانی، مقالات شبلی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، سال ندارد
۹۵۔ موہن داس کرم چند گاندھی، دی وے آف کمیونل ہارمونی، نوجیون، احمد آباد، ۱۹۶۳
۹۶۔ ناتھورام گوڈسے، مے اٹ پلیز یور آنر، دی تستا پبلی کیشن، پونے، ۱۹۷۷
۹۷۔ نرمل کمار بوس، سلیکشن فرام گاندھی، نوجیون، احمد آباد، ۱۹۴۸
۹۸۔ نکولس من مارگ، دی ٹرانسفر آف پاور، ۱۹۴۲۔۱۹۴۷، ہر مجسٹریز اسٹیشنری آفس، لندن، سال ندارد
۹۹۔ وی۔ این۔ دتا، بی۔ ای۔ کلیگر ون، اے نیشنلسٹ مسلم اینڈ انڈین پولیٹیکس، میک ملن، ۱۹۷۴
۱۰۰۔ وی۔ پی۔ مینن، دی ٹرانسفر آف پاور، اورینٹ لونگ مین، ۱۹۹۳
۱۰۱۔ ویریندر کمار برنوال، جناح، ایک پُنر درشٹی، راج کمل پرکاشن، دلی، ۲۰۰۵
۱۰۲۔ ویریندر گروور، راجارام موہن رائے، دیپ اینڈ دیپ پبلی کیشن، نئی دلی، ۱۹۹۸
۱۰۳۔ ہیکٹر بولیتھو، جناح، کیریٹر آف پاکستان، جان مرے، لندن، ۱۹۵۴

اخبارات و رسائل

ینگ انڈیا، ہریجن، سہارا اردو، پٹنہ، ہندستان ٹائمس، پٹنہ، سبھ یاتری، رانچی

انڈکس

الف

ب

پ

ت

چ

ح

گ

ل

م

ن

مصنف کی دوسری کتابیں

اردو

۱۔ آزادی خطرے میں
۲۔ جے پرکاش
۳۔ گاندھی اور مسلمان

ہندی

۴۔ سامپردایکتا ایک چنوتی
۵۔ گاندھی اور راشٹریہ کانگریس
۶۔ بہار میں شکچھا کا ماحول
۷۔ ہند مہادیپ میں انوک ہورے
۸۔ آزادی کے پچاس برس، کیا کھویا کیا پایا
۹۔ آزادی کے پچاس برس، ہندستان کدھر
۱۰۔ صداقت آشرم (تاریخ)
۱۱۔ گاندھی سنگر ہالیہ (تاریخ)
۱۲۔ ویشوی کرن کا ہندستان پر پربھاؤ
۱۳۔ بھارتیہ اُپ مہادیپ کی تراسدی: ستا، سامپردایکتا اور وِبھاجن
۱۴۔ صادق علی (مرتبہ)، ہندی اور انگریزی

انگریزی

۱۵- Indian Peasant Movement & Mahatma Gandhi

"ایسی بات نہیں کہ آزادی کے بعد جمہوری تقاضوں کو پورا کرتے آئینی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا موقع مسلمانوں کو نہیں ملا ہے۔ آزادی کی لڑائی میں اپنی چھاپ چھوڑنے والی نسل کے ختم ہونے کے بعد بھی آبادی کے تناسب میں نہ سہی، لیکن ہندستان میں متعدد مسلم چھوٹے بڑے افسر، ممبر پارلیامنٹ، ایم۔ایل۔اے۔، ایم۔ایل۔سی۔، وزیر، گورنر، صدر اور نائب صدر ہوئے ہیں۔ عزت و وقار اور عہدوں اور خطابوں نے انہیں بھی اسی ۱۵ فیصد خوشحال اعلی طبقہ کے ہندستانیوں کے گھیرے میں قید کر رکھا۔ ان کا رہنا نہ رہنا، عام مسلمانوں کے لئے اشتہاری حیثیت کے علاوہ کوئی معنی نہیں رکھتا رہا ہے۔ آزادی کے بعد مسلمان لگاتار آزمائشوں سے دوچار رہے ہیں، لیکن مسلم کاز کے لئے ناانصافیوں کے خلاف سکھ کاز میں ایکشن بلو اسٹار کے سوال پر احتجاج کرتے سردار خشونت سنگھ کی طرح کا ایک بھی مسلم لیڈر سامنے نہیں آسکا، یہ مسلمانوں کا المیہ ہے۔ باوقار کرسیوں پر بیٹھے مسلمان عام طور پر احساس کمتری کے شکار ہیں یا اپنی خود غرضیوں کے۔ انہیں لوگ ''فرقہ پرست'' نہ کہہ دیں، ان کی ''سیکولرزم'' پر انگلی نہ اٹھے، اسی فکر میں مسلمانوں پر ہو رہی ناانصافیوں کو وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، لیکن اس کے حل کے لئے پہل کرنے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔" (اسی کتاب سے)

ڈاکٹر محمد ذاکر حسین اردو، ہندی، عربی اور فارسی میں اب تک ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے موقر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایشیا کی عظیم لائبریری خدا بخش لائبریری سے منسلک ہیں۔ اردو تحقیق و تنقید اور ہندی اور اردو ترجمہ سے انہیں خاص شغف ہے۔

رابطہ 09199702756

"۱۸۵۷ کی بغاوت کو سختی سے کچل دینے کے بعد انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کی سوچی سمجھی میکالے پالیسی کے تحت فکری ہتھیار کو اپنایا اور یہاں کے لوگوں کی ذہنیت کو بدلنے کی ہمہ گیر مہم چلائی اور کچھ دنوں کے بعد ہی وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔

فورٹ ولیم اسکول کے تعلیم و تربیت اور مراعات یافتہ مصنفوں اور مؤرخوں نے انگریزوں کی نپی تلی پالیسیوں کے تحت ایسے فرضی حقائق کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا، جو زیادہ تر بے بنیاد تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ جو ذہنیت فروغ پائی، اس ماحول میں "وہائٹ مینس برڈن" کی سازشی پالیسی کامیاب ہو گئی۔ ان مصنفوں اور مؤرخوں نے جو گمراہ کن حقائق پروسے، ان کو صحیح مان لینے کی وجہ سے ہندستانیوں کی دو اہم اکائیوں کے بیچ نفرت کی کھائی بڑھتی گئی۔ ہندستان پر قبائلی حملوں کا سلسلہ بہت طویل رہا ہے۔ اسی ضمن میں مسلمانوں کے حملے بھی ہوئے۔ ان کی کچھ زیادتیاں بھی ضرور رہی ہوں گی، کیونکہ تاریخ عالم کا عہد وسطیٰ اس کے لئے مشہور ہے۔ ان حملوں کی داستانوں کو فوقیت دیتے ہوئے بُری نیت سے خوب مرچ مسالہ لگا کر پیش کیا گیا، جس کا نتیجہ اس برصغیر کے لئے اچھا نہیں ثابت ہوا۔"

(اسی کتاب سے)

Published by :
GANDHI SANGRAHALAYA

Printed at : ERAM PUBLISHING HOUSE Dariyapur, Patna - 4, Mob.: 9934089646

₹ 300/-